دل گداز تحریریں، ۰ زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

کراچی

سچی کہانیاں

پُراسرار نمبر 2

August 2015

25

ناقابلِ یقین دہشت انگیز خوفناک سچ بیانیاں

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

ماہنامہ
سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

خط و کتابت کا پتا: C.II-88 فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

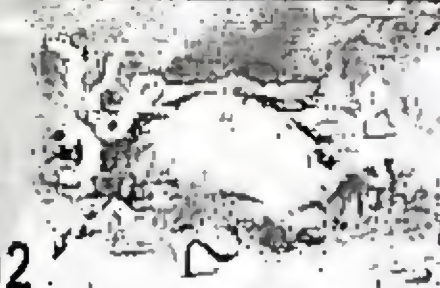
فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ☼ جلد: 32 - شمارہ: 08 ☼ اگست: 2015ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔





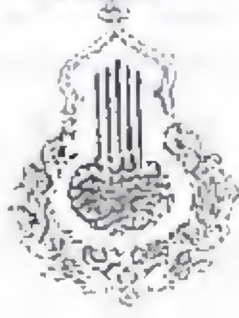




فون:021-35893122-35893121 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی سٹی پریس 7-OB تالپور روڈ کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا 71 آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر قانونی مشیر جی ایم بستوا ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



''عید مبارک''

اِس بار بھی برکتوں والا ماہِ رمضان نشریات کی نظر ہوگیا۔ اسلامی ملکوں میں پاکستان وہ واحد ملک ہے۔ جہاں یہ کھیل تماشے رمضان میں سجائے جاتے ہیں۔ ہم لوگ کارپوریٹ دنیا کے اشاروں پر اس قدر ناچتے ہیں کم ازکم مجھے اندازہ نہ تھا۔ مجبوروں کی مجبوریوں کا تماشا لگا کر، اُن کے آنسوؤں پر کیمرہ زوم اِن اور زوم آؤٹ کرتے کرتے ماہِ صیام تمام ہوا...... پہلے تو کبھی آخری دنوں میں بازاروں مین رش ہوتا تھا۔ اس دفعہ تو پہلے روزے سے بازار پر ہجوم رہے اور مساجد خالی، ٹی وی دیکھتے، بھائی مجھے لیپ ٹاپ چاہیے، بھائی اسکوٹر دے دیں بھائی بھائی...... کاش بھائی کی صداؤں کے بجائے اللہ اللہ کی صدائیں سنی جاتیں...... کاش پورے رمضان ٹی وی کی نشریات بند کر دی جاتیں یا کم ازکم رمضان کو کمائی کا ذریعہ نہ بنایا جاتا...... بہرحال ایک رمضان اور تمام ہوا اور عید تو ہم سب کا حق ہے۔ لہٰذا میرے تمام پڑھنے والوں کو

عید مبارک

منزہ سہام

اس چلو بھر پانی میں نہیں ڈوبیں گے، کیوں کہ ان کے ضمیر مر چکے ہیں۔ احوال میں اتنے نئے قارئین کے خط...... ماشاء اللہ یہ آپ کے محنتوں کا نتیجہ ہم نئے احوالیوں کو دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ محمد عمر گولہ صاحب! آپ براہوی لینگویج ہو۔ میں بھی براہوی لینگویج ہوں، اور اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، قائد میں شرمندہ ہوں، بہترین کہانی تھی۔ تقدیر نے لوٹا ہے، گڈی آپا کی، صبا اقبال کی عشق نے پامال کیا۔ تم میرے ہو، اور یہ آگ کب بجھے گی نے بھی بہت متاثر کیا۔ عظمیٰ شکور، ندیا مسعود، ثانیہ بھٹی کی لکھی کہانیاں بھی بہترین تھیں۔ شمع حفیظ صاحبہ نے ایک بار پھر اچھی کہانی پڑھنے کو دی۔ زہر عشق، کیا بات ہے سرکاشی آپ کے ناول کی۔ سراب سلمان کو اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہیے، صنوبر سے۔ ایم اے راحت ہمارے فیورٹ رائیٹر ہیں۔ ہم شکل بھی بہترین جا رہی ہے۔ ممتاز احمد اور جاوید راہی صاحب کی کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔ آخر میں مسز نوید ہاشمی، فنتی محمد عزیز مئے، مجید احمد جائی، عائشہ نور کو سلام۔ تابندہ آپا کو نئی زندگی کی خوشیاں مبارک ہو۔ اور اب اجازت۔

☆ بہت پیارے سے بھائی اسماعیل بروہی! آپ کا تبصرہ، آپ کی محبت کا ثبوت ہے۔ ہمیں اپنے اُن قاری اور لکھاری دوستوں پر بہت پیار آتا ہے جو اتنی مشکلات کے باوجود بھی اپنی محبت میں کمی نہیں آنے دیتے۔ جیو یار۔ خوش کر دیا۔

☒ احوال میں یہ پہلی آمد ہے طاہر بزدار کی کوئٹہ سے، لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان بھائی میرا تعلق گلابوں کے شہر کوئٹہ سے ہے مگر دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے ہمارے کوئٹہ کے گلی کوچے لہو سے لال لال ہیں۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں اپنے ہی مسلمان بھائیوں کی لاشیں گرتے دیکھتا ہوں تو آنکھیں لہو روتی ہیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ امن وشانتی عطا فرمائے (آمین) کاشی بھائی سچی کہانیاں ہر طرح سے لاجواب اور بہترین جا رہا ہے، ہر کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ کسی ایک کی تعریف کرنا ناانصافی ہوگی۔ یہ میرا پہلا خط ہے اُمید کرتا ہوں اسے شاملِ محفل کریں گے۔

☆ اچھے طاہر! خوش آمدید۔ خدا تم سب کو بھی اپنی امان میں رکھے۔ خدا سے دعا ہے کہ خدا ہمارے پورے ملک میں امن وامان قائم کر دے۔

☒ گوٹھ دمبڑی، صحبت پور سے یہ اولین آمد ہے عبدالغنی کی لکھتے ہیں۔ شہید ڈی ایس پی محمد علی کھوسہ پر لکھی ہوئی اسٹوری مردِ مجاہد کو سچی کہانیاں میں جگہ دے کر آپ نے ہمارے سب گاؤں والوں کا دل جیت لیا ہے۔ شعبان کھوسہ نے جس انداز میں شہید محمد علی کھوسہ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ قابلِ تعریف ہے۔ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے ناولز نے تو دھوم مچا دی ہے۔ سچ بتاؤں تو ایک ہی نشست میں پڑھ کر دم لیتا ہوں۔ کاشی چوہان صاحب سچی کہانیاں کا مستقل قاری بننا چاہتا ہوں اور مجھے لکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اُمید کرتا ہوں آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆ پیارے بھائی عبدالغنی! سچی کہانیاں آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ مستقل قاری بننے کے لیے تھوڑی سی محبت کا ایندھن درکار ہے اور پھر دیکھیے یہ گاڑی کیسے رواں دواں ہوتی ہے۔

☒ احوال میں یہ مختصر سی حاضری ہے ہمارے بہت معصوم اور پیارے لکھاری ساتھی دستگیر شہزاد کی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ عرض کرتے ہیں۔ میرے اپنے بہت ہی پیارے کاشی چوہان۔ السلام و علیکم! حسب وعدہ کہانی لیے۔ آپ سے مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر رہا ہوں۔ پیارے بھائی میں

پنجاب کے قصبہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پیدا ہوا۔ پیر محل اور فیصل آباد میں تعلیم حاصل کی۔ ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا جس سے میرا شغف اب بھی جاری ہے میری پہلی کہانی سنہرے دن، 2000 عیسوی میں فنون میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ میرے تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ چشم دید گواہ، وہ خواب سارے عذاب سارے، بات ہے رسوائی کی۔ اس کے علاوہ تمام ہی ادبی رسائل میں لکھتا ہوں۔ ایک معروف ماہنامے میں جرم وسزا پر مسلسل لکھ رہا ہوں۔ اللہ آپ کو اور سب اہل خانہ کو زندگی کی بھرپور خوشیاں دے۔

☆ عزیز دوست دستگیر! خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ یہ تم سب کی محبتیں ہی تو ہیں جو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی ہیں، ورنہ ہمیں کون جانتا ہے بھائی۔ خوش رہو اور ہر ماہ احوال کا حصہ بنے رہو۔

✉ چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے ہمارے بہت پیارے ساتھی فیصل ندیم بھٹی شاملِ احوال ہیں۔ سب سے پہلے تو تمام اہل اسلام کو رمضان المبارک اور عیدالفطر کی مبارک باد قبول ہو۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک پاکستان پر رحم فرمائے۔ آمین۔ منزہ سہام کا اداریہ 'جنت' پڑھ کر ایمان کی قوت میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد احوال میں اس بار 50 خطوط تھے جو کہ شمارے کی مقبولیت کی دلیل ہے اور کاشی بھیا کی محنت کا نتیجہ ہے۔ احوال میں نئے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید۔ کہانیوں میں تھوڑا اندھیرا جیون میرا، اعجاز احمد فکرال، ہم نے تو وفائی کی تھی، کٹی پتنگ، سیما عروج صدیقی، سایوں پر نقش، میں خوشی ہوں کمال کہانیاں تھیں جبکہ سب راہیں ایک ہو گئیں، بھاگوں والی، زخم اپنا نشان چھوڑ گیا۔ اور تماشا تمام ہوا عبرتناک کہانیاں ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں عبدالغفار عابد بھی انسان اپنے ہی ہاتھوں سب ختم کر دیتا ہے۔ بیاہی عورت، سبق آموز ہے جبکہ عید مبارک، ممتاز احمد صاحب کی بہترین کہانی ہے۔ زہر عشق، اپنے دلچسپ مراحل میں داخل ہو گیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے میں بابا جی سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں۔ آخر میں تمام اسٹاف اور قارئین کو سلام۔

☆ فیصل جی! کہاں غائب ہو جاتے ہو۔ آپ کا تبصرہ ہمارے لیے آکسیجن ہے۔ کیا آپ چاہو گے کہ میں I.C.U میں چلے جاؤں...... تبصرہ ہر ماہ چاہیے آپ کا۔ سمجھ گئے نا......

✉ لانڈھی جیل ملیر سے ہمارے نئے ساتھی محمد افتخار بھٹی احوال میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں سب سے پہلے تو میں آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو جو ساجن کی کہانی بھیجی تھی آپ نے وہ چھاپ دی۔ اب میں آپ کو ایک اور کہانی بھیج رہا ہوں اُمید ہے یہ بھی ضرور شائع ہوگی۔ ایک چیز وہ یہ کہ میں جو بھی لکھ رہا ہوں سچ لکھ رہا ہوں اور ہر لفظ سچا ہے۔ اگر لکھنے میں کوئی غلطی ہو تو اُسے آپ درست کر لینا اور میں ایسی غلطی پر معافی چاہتا ہوں۔ اللہ پاک آپ کے ادارے کو مزید ترقیاں دے آمین۔

☆ پیارے بھائی! ہم آپ کی احوال میں آمد پر مشکور ہیں۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ انشاء اللہ جلد ہی آپ کی کہانی سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔ آپ کے تبصرے کا دل سے انتظار رہتا ہے۔

✉ یوسف لغاری۔ لیہ سے برقی نامے کے ساتھ احوال میں شامل ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ سب سے پہلے تو بہت دیر سے حاضری پر معذرت کیونکہ میں امتحانات اور NTS کی تیاری میں مصروف تھا تو اس لیے فوراً حاضر نہ ہو سکا۔ مئی کا شمارہ ملا جس میں آپ نے ہماری کہانی شائع کی آپ

کا بے حد شکریہ اور مناسب کاٹ چھانٹ بھی کی جس پر ہم آپ کی صلاحیتوں کے اور بھی معترف ہو گئے ہیں اور دیگر قارئین سے بھی یہ کہیں گے کاٹ چھانٹ کہانی کو نہ صرف خوب صورت بناتی ہے بلکہ اشاعت کے قابل بھی بناتی ہے اس کے ساتھ اپنے اُن بہن بھائیوں کا بھی بہت شکریہ جنھوں نے میری اس کاوش کو پسند کیا خصوصاً میرے ایف بی اور سچی کہانیاں کے قارئین شعبان کھوسہ، بہناز رینہ، تحسین جونیجو و دیگر کا بھی بے حد شکریہ۔ مونیکا لیونسکی کے بارے میں تفصیلی پڑھ ہم خود ہی کنفیوز ہو گئے کہ وہ شاطر تھی یا معصوم۔ تو یہ فیصلہ بل کلنٹن پر ہی چھوڑتے ہیں کہ کبھی اُن سے ملاقات ہوئی تو پوچھیں گے۔ کہانیوں میں ادھورے لوگ سلیم اختر نے اچھا سبق دیا کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے مگر آخر میں عدیل کی بانو کی طرف واپسی نے بہت متاثر کیا۔ عروج فاطمہ کی کہانی خدا تعالیٰ کی ذات پر ایک مکمل بھروسے اور یقین کا سبق دے رہی تھی۔ بتول خان نے بھی کہانی میں عمدہ سبق دیا کہ والدین اپنی بیٹیوں کے لیے خوشیاں اچھا گھر لازمی تلاش کریں مگر پہلے چھان بین ضرور کرلیا کریں۔ شعلہ ساماں تحریریں میں دستگیر شہزاد کی تحریر اچھی لگی کیونکہ گناہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی کیونکہ گناہ، گناہ ہوتا ہے۔ احمد علی عاقل نے بھی سیدھی سادھی لڑکیوں کے لیے بہت خوب سبق دیا۔ کاشی بھائی آپ سے درخواست کرنی تھی نا قابل اشاعت کہانیوں والا سلسلہ تو اچھا ہے لیکن اگر اس میں صرف کہانیوں کے نام اور شہر کا نام شائع کیا جائے تو کیا یہ مناسب نہیں ہوگا؟؟

☆ پیارے یوسف تبصرہ گو لیٹ تھا مگر جامع تھا۔ اس لیے تمہاری حق تلفی نہ کر سکے۔ نا قابل اشاعت کہانیوں پہ اگر رائٹر کا نام نہ دیا جائے تو ایسا لگے گا کہ ہم نے کسی کو خط لکھا اور شہر اور ملک کے نام کے بغیر پوسٹ کر دیا..... اُمید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔

✉ چیچہ وطنی سے ہمارے پیارے دوست عبدالغفار عابد اپنے تبصرے کے ساتھ ہمیں محظوظ کر رہے ہیں۔ احوال کے سب ہی عزیز ساتھیوں کو بندہ ناچیز کا سلام پہنچے۔ جولائی کا سچی کہانیاں 30 جون کو ملا۔ حسب معمول سب سے پہلے منزہ باجی کا اداریہ 'جنت' پڑھا اس کے بعد احوال اور پھر عظیم رائٹر محترم ممتاز احمد کی تحریر عید مبارک پڑھی۔ یکم جولائی تک سچی کہانیاں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اب تبصرے کا آغاز کرنا تھا سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا لکھوں، کہاں سے شروع کروں۔ کراچی کو پورے ملک کی ماں سمجھا جاتا ہے۔ منی پاکستان کو مہمان نگر کا درجہ حاصل ہے۔ اب اس شہر کو اہلِ سیاست نے سیاست کی نظر کر دیا ہے۔ لوگ گرمی اور پیاس سے مر رہے ہیں مگر ہماری سیاست الزام تراشیوں میں مصروف ہے۔ جنت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم انسانیت کو زندہ کریں۔ باجی کا اداریہ 'جنت' اور ممتاز احمد کی تحریر 'عید مبارک' میں صبر اور برداشت کا بہت عمل دخل ہے۔ جگجیل میتلو کی تحریر بھاگوں والی پڑھ کر بھی شرمندہ ہونا پڑے گا، انسان کو کیوں کہ انسانیت نام کی تو کوئی چیز آج کل نظر نہیں آ رہی ہے۔ جاوید راہی کی تحریر 'اک ذرا سی بات' میں انسانیت رو رہی تھی۔ مومنہ بتول کی 'کفارہ ادا ہوا، حنا بشریٰ کس طرح لوٹاؤں یقیں، سیما گل کی 'یہی صلہ ہے یہاں' اور باقی تحریروں میں بھی تقریباً یہی واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ آج کا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔ مرد عزتوں کا مذاق اڑائے یا اپنے مفاد کے لیے کمزور کا حق چھینے، اس کی اپنی مرضی ہے۔ بہر حال ثمینہ طاہر بٹ کی تحریر 'خوش ہو کے کھنور باندھ لیے' پڑھ کر ایسا لگا کہ یہاں مرد کے بھی امتحان ہوتے ہیں۔ محمد اقبال زمان نے ایک بہادر سپاہی سے ملاقات کروائی۔ ایم یعقوب کی 'میں خوشی ہوں' ڈاکٹر طارق محمود آ کاش کی 'سب

راہیں ایک ہوئیں' اچھی تحریر تھی۔ باقی سب بچی کہانیاں بھی درجہ بہ درجہ جاندار تھیں۔ اب کچھ ذکر احوال کا بھی ہو جائے۔ محفل احوال کی رونق کو دیکھتے ہوئے کاشی بھیا کی صلاحیتوں کا اظہار نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ احوال کی رونق اور سچی کہانیاں کی مقبولیت میں دن بہ دن اضافہ کاشی جی کا ہی کمال ہے۔ میں نئے آنے والے تمام احوالیوں کو جی آیانوں کہتا ہوں جو دوبارہ اس محفل میں حاضر ہوئے ہیں ان کا بھی شکریہ۔ عادل حسین، مورشاہد حسین، ممتاز احمد اور منعم اصغر، یاد آوری کا شکریہ۔ احوال کے تمام دوستوں کی خوشیوں کا طلب گار رہوں گا۔ آخر میں سب کے لیے یہی ایک پیغام ہے کہ آئیں ہم سب ایک ہو جائیں۔ نفرتوں کو دفن کر کے ایک محبتوں بھرا باغ آباد کریں۔

☆ پیارے عابد! کاش کہ سب لوگوں کی تمہارے جیسی سوچ ہو جائے تو دنیا واقعی جنت بن جائے گی۔ ہمیں تم پر بہت مان ہے۔ خوش رہو۔ تبصرہ شاندار رہا۔

✉ خیر پور ناتھن شاہ سے ہماری ملکۂ احوال تحسین جونیجو احوال میں بہت دنوں بعد حاضر ہو رہی ہیں۔ لکھتی ہیں اچھے بھیا اور تمام قارئین السلام وعلیکم۔ اُمید ہے اس غضب ناک گرمی میں آپ سب زندہ اور سلامت ہوں گے۔ اللہ پاک ہم سب پر بالخصوص کراچی پر اپنا رحم وکرم فرمائے۔ آمین۔ آتے جاتے موسم انسان کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کوئی بھی چیز ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی، انسان، جانور، رنگ، خیال تو موسم کیسے رہ سکتا ہے۔ یہ بھی جلد رنگ بدلے گا۔ جب دھرتی ہریالی کی چادر اوڑھ کر لہلہاتی ہے تو سب رنگ، خوشبودل کے موسم کو سرشار کر دیتے ہیں۔ اب کچھ حال احوال اپنا بھی۔ اس بات سے میں عاجز آ چکی ہوں کہ دنیا بھر کو شمارہ بروقت مل جاتا ہے لیکن کچھ ماہ سے مسلسل ہمیں شمارہ اس وقت ملتا ہے۔ جب احوال کی تاریخ تاریخ بن جاتی ہے۔ برائے مہربانی ہمیں جولائی کا شمارہ جلد از جلد ارسال کر دیجیے۔ پیاری رضوانہ کوثر آپی اور کوثر سعید آپی کی صحت کے لیے دعائیں۔ شعبان کھوسہ بھائی اور اشفاق شاہین بھائی بھی احوال سے غائب ہیں۔ جلد حاضری لگوائیے۔ یوسف لغاری بھائی اور منشی محمد عزیز میمن بھائی۔ مورشاہد حسین بھائی۔ کیسے ہیں آپ۔ سدرہ انور کیا حال ہیں پتری! میری کمی محسوس کی، محبت ہے تمہاری۔ تم تو جان ہو اپنی۔ چاہے میں احوال میں نہ بھی آ ؤں تمہاری یاد آتی رہتی ہے۔ بہت اچھا لکھتی ہو یار! خوش رہو! آباد رہو۔ بہت دن بیت گئے سلیم اختر انکل بھی غائب ہیں احوال سے۔

☆ ارے تحسین! کہاں غائب ہو۔ ہاں بھئی! ملکۂ عالیہ تو یوں بھی ریاست سے دور دور رہتی ہیں۔ اب غیر حاضر ہوئیں تو تمہارے سر سے تاج اتار لیا جائے گا۔ خوش رہو۔

✉ احوال میں بڑے دنوں بعد یہ آمد ہے ہمارے پیارے شاعر اور لکھاری دوست شعبان کھوسہ کی کوئٹہ سے۔ بندہ ناچیز کی طرف سے السلام وعلیکم۔ کچھ مہینوں کی غیر حاضری کے بعد بندہ پھر سے آپ کی محفل میں حاضر ہے۔ غیر حاضری کی وجہ محکمہ عالیہ ہے جس نے مجھ ناچیز کو کبھی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیا۔ لگتا ہے میرے فورس والے مجھے پورے بلوچستان کا پانی پلا کر رہیں گے۔ مگر ہم بھی تھکنے والوں میں سے نہیں۔ کہتے ہیں نہ شاہین کبھی پرواز سے تھکا نہیں کرتے۔ اب تو ہم نے بھی آستینیں چڑھالی ہیں۔ (ارے......) دیکھتے ہیں کہ ہم سے آگے کون نکلتا ہے (ہم م م...... ڈرا ہی دیا تھا آپ نے تو بھائی) مجید احمد جائی صاحب تھینکس آپ نے مجھے یاد کیا۔ آتے ہیں تبصرے کی طرف، ندیم عباس میوانی، سدرہ انور علی کے تبصروں نے احوال میں چار چاند لگا دیے۔ ہماری وڈیری بہنا تحسین

جو نیجو تو محفل سے ہی غائب تھی۔ پچھلے مہینے محمد یوسف لغاری کی اسٹوری تھری جی نے کافی متاثر کیا۔ ویل ڈن یوسف بھائی۔ زور قلم اور زیادہ ہو۔ نئے لکھنے والوں کو دل سے ویلکم۔ گھورا اندھیرا جیون میرا، ہم نے تو وفا کی، تماشا تمام ہوا، بیاہی عورت، یہی صلہ ہے یہاں، بہترین کہانیاں تھیں۔ میری طرف سے سب رائیٹرز کو بہترین کہانیاں لکھنے پر مبارک باد۔ کاشی چوہان کے ناول زہر عشق کی پانچویں کڑی نے بھی اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں زندگی نے ساتھ دیا تو اگلے مہینے ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے شعبان! تم آگئے احوال میں جیسے ہر طرف اجالا ہوگیا۔ یقین جانو ہم تمہارے لیے، خصوصاً اپنے بلوچستان کے بھائیوں کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتے ہیں۔ خدا آپ سب کو امان میں رکھے۔ (آمین)

✉ سرگودھا سے یہ محبت بھرا نامہ ہے ممتاز احمد کا لکھتے ہیں۔ اس بار بھی شمارہ بروقت مل گیا۔ بہن منزہ سہام نے 'جنت' کے عنوان سے بہت خوبصورت اداریہ لکھا۔ جی کاشی چوہان آپ نے ٹھیک کہا اور شریعت کا بھی یہی حکم ہے کہ میانہ روی اختیار کرو۔ پیارے احوالیو! کیسے ہو……؟ سب سے پہلے نئے احوالیوں میں محمد ابوھریرہ بلوچ، ماہا ملک، عثمان بلوچ، شہزاد، ملک راشد، ملک محمد اکرم آھیر، نبیل جاوید، عارف شہزاد، ایم منظور، اکبر تبسم، رفعت خان، ایم وکیل عامر جٹ، نازش پرنس، قربان علی اور اشعر عتیق کو احوال میں ویلکم بلکہ موسٹ ویلکم خوش آمدید جی آیاں نوں۔ ریحام خان کی سٹوری خوب رہی۔ گھورا اندھیرا جیون میرا، ہم نے تو وفا کی تھی لاجواب کہانیاں تھیں۔ ایم یعقوب کی کہانی 'میں خوشی ہوں' میں ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، جب خوشی نے اپنی سگی ماں کی اجازت سے کالج کی لڑکیوں کے ساتھ لاہور ٹرپ پر گئی تو خوشی پر اس قدر ظلم وستم کیوں……؟ اس کی ماں کیوں خاموش رہی؟ سب راہیں ایک ہو میں بہتر تھی۔ اور تماشا تمام ہوا ایک عبرت انگیز کہانی تھی۔ رجو کو اس کے کیے کی سزا دنیا میں ہی مل گئی اور آخرت میں بھی ملے گی۔ عبدالغفار عابد کی 'خود اپنے ہاتھوں' ایک بہترین کہانی تھی۔ بیاہی عورت، چھٹی حس، جائے پناہ ہے کہاں، خوش ہو کے بھنور باندھ لیے، کفارہ ادا ہوا، اور اک ذرا سی بات تھی اچھی کہانیاں تھیں۔ پیارے بھائی فیصل ندیم بھٹی اللہ کا شکر ہے آپ کی دعا سے ٹھیک ہوں۔ شائستہ جمال آپ کہاں ہیں؟ برادر مور شاہد حسین صاحب وعلیکم السلام! جناب ٹھیک ہوں اس دفعہ مجید احمد جائی صاحب اور برادر منشی محمد عزیز مئے صاحب احوال سے کیوں غیر حاضر ہیں؟ آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ اب اجازت چاہتا ہوں اس دعا کے ساتھ اللہ کریم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی اگر زندگی نے وفا کی……

☆ پیارے ممتاز بھائی! خدا آپ کو صحت دے آپ کی پرچے سے محبت ہمارا مان ہے۔ تبصرہ بہت خوب کیا۔

✉ ڈیرہ غازی خان سے ہماری بہت پیاری سی بہن ارم خان احوال میں حاضر ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کاشی بھیا۔ کیسے ہیں آپ اور آپ کا پھولوں کی طرح پھلتا پھولتا احوال۔ (گرین گرین ہے بھیا) اب ذکر ہو جائے جولائی کے شمارے کا جو سامنے ہے۔ رسالہ ملتے ہی احوال کی طرف دوڑ لگائی اور اپنے خط کے پاس جو بھیا جی آپ کا جواب پایا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ بھیا جی یقین مانیں جب آپ نے مجھے بہن کہہ کر بھائیوں جیسے محبت بھرے لفظوں میں سمجھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے

اپنے بڑے بھائی نے میرے سر اپنا محبت بھرا ہاتھ رکھ کر یہ جواب دیا ہو۔ بہت شکر گزار ہوں بھیا جی بے شک محبت کے چند الفاظ دل میں جمع کئی شکایتوں کو مٹا دیتے ہیں۔ کہانیوں میں ایم یعقوب کی کہانی۔ میں خوشی ہوں کے سوا کوئی نہیں پڑھی۔ اس لیے سوری کرتے ہوئے کان پکڑتی ہوں وہ بھی ایک کان۔ اصل میں بھیا جی بات یہ ہے کہ پورے رمضان میں بس اللہ کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے کہانیاں نہیں پڑھیں۔ سو تبصرے کو صفر کی طرح گول کرتے ہیں۔ ویسے مجھے محسوس ہو رہا ہے تبصرہ نہ پا کر آپ وہی سوچ رہے ہوں جو پچھلے ماہ محمد خالد شاہان کے خط میں جواب دیا کہ جب تبصرہ نہیں ہوتا تو میرا دل چاہتا ہے…… پتا نہیں کیا کر جاؤں۔ ہا…… ہا…… ہا۔

☆ اچھی ارم! اللہ تم کو ہر خوشی دے۔ تمہاری عبادات قبول ہوں۔ اس بار تبصرے کے لیے معافی قبول مگر اگلی بار سر پر چپت بھی پڑے گی بھائی کی۔

✉ اکوال تلہ گنگ سے ہمارے ساتھی سلیمان شبیر عرض گزار ہیں ماہ جولائی کا شمارہ 27 جون کو ملا۔ اور آج 7 جولائی ہے۔ سارا پرچہ ترتیب کے ساتھ پڑھنے کے بعد قلم کاغذ لے کر احوال میں حاضر ہیں۔ سچی کہانیاں میں ہر ماہ ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس دفعہ بھی آنٹی منزہ سہام کا 'جنت' بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا۔ کیا واقعی ہم اللہ تعالیٰ کی جنت کے حق دار ہیں؟ اس کے بعد احوال میں تمام احوالیوں سے ملاقات ہوئی۔ اور جن تمام حضرات نے ہمیں ویلکم کیا اور جنہوں نے ویلکم نہیں بھی کیا ہماری طرف سے تمام حضرات کو سلام وخلوص۔ ریحام خان کے بارے میں پڑھ کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ اس دفعہ جو کہانی سب سے متاثر کن تھی۔ وہ ممتاز احمد کی 'عید مبارک' تھی۔ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کی ہمیشہ اسی طرح مدد کرتا ہے۔ اس کے بعد حنا بشریٰ کی 'کس طرح لوٹاؤں یقیں' بھی بہت زبردست تحریر رہی۔ اس میں بہت سے لوگوں کے لیے سبق ہے جو عورتوں کی عزت نہیں کرنا جانتے۔ اس کے علاوہ کٹی پتنگ سیما عروج صدیقی، 'بھاگوں والی' جیجل میتلو' اولڈ ہاؤس' مرزا مبشر بیگ اور 'کیسی محبت' جواد احمد بھی بہت اچھی تحریریں تھی۔ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ باقی بھی تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ اور ہم شکل اور زہر عشق کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ویلڈن کاشی بھیا۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش میں بھی سب کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ آخر میں تمام قارئین احوال اور تمام سچی کہانیاں کے اسٹاف کو میری طرف سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایڈوانس عید مبارک۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ پاک یہ عید ہمارے پیارے وطن پاکستان اور اس کے تمام رہنے والوں کے لیے صحیح معنوں میں عید ہو۔

☆ سلیمان! تم آئے اچھا لگا۔ تبصرہ شاندار تھا۔ محبت کے لیے لفظ شکریہ…… بہت چھوٹا ہے۔

✉ سرگودھا سے ہماری آپی صائمہ بشیر احوال میں پورے مان کے ساتھ شریک ہیں۔ لکھتی ہیں اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ شمارہ اب وقت پر مل رہا ہے یہ کاشی بھائی کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ منزہ آپی کا اداریہ رمضان المبارک کے حوالے سے دل کو چھو گیا۔ کاشی نے میانہ روی پر بہت خوبصورت اور عمدہ اور مختصر پیغام دیا۔ سب احوالیوں کے خطوط بہت شاندار تھے۔ سب بہن بھائیوں نے خوب لکھا۔ سب کے تبصرے بہترین تھے۔ چھوٹے بھائی عبدالغفار عابد کا تبصرہ زبردست تھا۔ آنے والے نئے احوالیوں کو خوش آمدید۔ آپا مسز نوید ہاشمی کیسی ہیں آپ؟ آپ کا تبصرہ بہت جامع ہوتا ہے۔ میں بھائی ممتاز احمد کی بات کی تائید کرتی ہوں آپ سب احوالیوں کی آپا ہیں۔ کاشی

بھائی جولائی کے شمارے میں اپنا خط اور غزل نہ پا کر تھوڑی مایوسی ہوئی۔ لگتا ہے میرا خط محکمہ ڈاک کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی ریحام خان کی مختصر اسٹوری اچھی لگی۔ چھوٹے بھائی ممتاز احمد کی کہانی 'عید مبارک' رمضان المبارک اور عید کے حوالے سے بہت زبردست کہانی بلکہ نمبرون کہانی تھی۔ اولڈ ہاؤس مختصر اور عبرت آموز کہانی تھی۔ ہم نے تو وفا کی تھی، کٹی پتنگ، سایوں پر نقش، زخم اپنا نشان چھوڑ گیا۔ بیاہی عورت اچھی کہانیاں تھیں۔ ایم یعقوب کی 'میں خوشی ہوں' ایک اچھی کاوش تھی مگر اس میں کچھ تکنیکی خامیاں بھی تھیں کہ ماں باپ اپنی جوان سگی بیٹی کے دشمن کیوں ہو گئے۔ کیوں اتنے ظلم و ستم خوشی پر کیے۔ وجہ کیا تھی؟ حنا بشریٰ کی 'کس طرح لوٹاؤں یقیں' بہت اندوہناک کہانی تھی۔ منزہ نصیر کی 'کوئی کب تک سہے' لاجواب کہانی تھی۔ زہر عشق نے پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ ہائیڈ پارک میں یاسمین اقبال، ممتاز احمد، اور عائشہ نور عاشا کا انتخاب بہت بہترین تھا، بہت پسند آیا۔ خط کچھ طویل ہو گیا ہے اس سے پہلے کہ قینچی چل جائے اختتام کرتی ہوں۔ سب بہن بھائیوں کو صائمہ آپی کا سلام۔ بچوں کو پیار اور بہت بہت عید مبارک۔

☆ صائمہ آپی! آپ کی آمد سے سچ میں دل کو راحت محسوس ہوئی۔ محبتیں لفظوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ کہانی کا انتظار ہے۔

✉ کراچی سے فرح انیس احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ایڈوانس میں عید مبارک کاشی بھائی آپ کو، آپ کے اسٹاف کو اور تمام پڑھنے والوں کو۔ گرمی کی شدت سے جو اتنی اموات ہوئیں اس پر دل نہایت افسردہ ہے۔ اللہ پاک ان سب کی بے حساب مغفرت فرمائے۔ آمین۔ جولائی کا شمارہ 30 تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل پر پیاری دوشیزہ آنکھوں کو بھا رہی تھی۔ احوال میں احوالیوں نے ہمیشہ کی طرح خوبصورت سی رونق لگائی ہوئی ہے۔ ارم خان کی مان بھری خفگی، سدرہ انور علی کا شرارت آمیز انداز، احوال میں سب ہی کے تبصرے شاندار رہے۔ ہاں میرا تبصرہ نہیں تھا تو کمی تو لگنی ہی تھی۔ ہاہا..... ہاہا۔ ماہا ملک کا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ علی حسنین تابش اللہ پاک آپ کے والد کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین) کاشی بھائی آپ کا بہت شکریہ آپ نے میری تحریر لگائی۔ ان لوگوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میری تحریر کو پسند کیا۔ جیجل میتلو کی تحریر 'بھاگوں والی' زبردست تحریر تھی۔ ایم یعقوب کی تحریر آنکھوں کو بے اختیار نم کر گئی۔ مرزا مبشر بیگ کی تحریر کافی اچھی رہی، ثمینہ طاہر بٹ کی تحریر میں عورت کا سفاک روپ دکھایا گیا، جو اپنی انا کے خاطر اپنی اولاد تک کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔ ثمینہ فیاض، سیما عروج صدیقی، نسیم صدر الدین سرائی، اعجاز احمد نکرال، ارم ناز، جواد احمد، حنا بشریٰ، احتشام انور سب کی تحریریں زبردست تھیں۔ زہر عشق میں کاشی بھیا کا قلم اپنا جادو جگاتا ہوا کہانی کو خوبصورت طریقے سے لے کر آگے چل رہا ہے ماشاءاللہ۔ کچھ تحریریں ہیں جو ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ تیر نیم کش میں سب ہی کے اشعار بہت اچھے تھے۔ بھیا سخن آباد کا سلسلہ پلیز دوبارہ شروع کریں تا کہ میری بھیجی ہوئی نظمیں لگ سکیں۔ ہاہا۔ اگلا شمارہ میرا پسندیدہ پراسرار نمبر ہوگا۔ جس کا میں ہمیشہ بے چینی سے انتظار کرتی ہوں۔ بھیا چوبیس اگست کو مابدولت کا جنم دن ہے۔ آپ کی طرف سے تو پھر تحفہ بنتا ہی ہے۔ میری پراسرار تحریر کی صورت میں۔

☆ پیاری فرح! خوش رہو۔ تبصرہ شاندار رہا۔ تحفہ تو ہم اپنی بہن کو ایڈوانس میں دے چکے۔.....

اب اتنے تحفے..... دوسروں کو بھی موقع دو نا.....

✉ ہماری بہت پیاری گڑیا سدرہ انور علی جھنگ صدر سے حاضر ہیں لکھتی ہیں۔ عزیز از جان بھیا کاشی چوہان، ڈیئر سسٹرز، برادرز، اینڈ آل اسٹاف السلام وعلیکم! اسی اُمید کہ ساتھ محفل میں آئی ہوں کہ تمام پڑھنے والے سلامت ہوں گے۔ (ارے.....) جولائی کا پرچہ 29 جون کو ملا۔ رمضان شریف کی مناسبت سے ٹائٹل انتہائی دلکش تھا۔ اداریہ 'جنت'، منزہ آنٹی نے بہت خوب لکھا۔ احوال میں زیادہ تر نئے چہرے شامل تھے۔ ان سب کو احوال میں خوش آمدید، علی حسنین آپ کے والد کی ڈیتھ کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ نازیہ جہانگیر، فرخندہ بتول، عبدالغفار عابد بھیا، خط پسند کرنے کا شکریہ۔ نمایاں شخصیات سچے واقعات میں، ریحام خان کی زندگی سے بہت سے پہلو اجاگر کیے ویلڈن سجاد بابر انکل۔ گھورا اندھیرا جیون میرا، اعجاز احمد نکرال کی تحریر پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ نسیم صدر الدین کی، ہم نے تو وفا کی تھی، سیما عروج کی، ثمینہ فیاض کی، سایوں پر نقش ایم محمد یعقوب، میں خوشی ہوں، ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی، سب راہیں ایک ہوئیں۔ جیجل میتلو کی بھاگوں والی، غلام عباس کی، زخم اپنا نشان چھوڑ گیا۔ عبدالغفار عابد، اپنے ہاتھوں اور تماشا تمام ہوا، نبیل جاوید کی، بیاہی عورت ارم ناز، بہت اچھی اور شاندار تحریریں تھیں۔ انکل اقبال زمان، لہو کے چراغ، بہت دکھ بھرا سانحہ ہے۔ یہی صلہ ہے یہاں، سیما گل، چھٹی حس، شیخ معظم الٰہی، اولڈ ہاؤس، مرزا مبشر بیگ، ساتویں بہن احتشام انور، جائے پناہ ہے کہاں، الماس فاطمہ، بہت سبق آموز تحریریں لے کر آئے۔ شعلہ ساماں میں ثمینہ طاہر بٹ کی خوش ہو کے بھنور باندھ لیے، خواہ مخواہ محبتیں جتانے سے یونہی مورال گرتا ہے۔ کار جہاں دراز ہے۔ انکل جاوید اک ذرا سی دیر، یہ شعبدہ باز لوگ، جنتر منتر پڑھ کر ایسے ہی معصوم لوگوں کی زندگیاں برباد کرتے ہیں۔ تین مرد تین کہانیاں حنا بشریٰ کی کس طرح لوٹاؤں یقیں، ویلڈن حنا جی۔ ندیم عباس، منزہ نصیر نے بھی اچھا لکھا۔ زہر عشق بہت لاجواب جا رہی ہے۔ سلمان نے بہت غلط کیا جو صنوبر کے اندر تحلیل ہو گیا۔ کاشی بھیا زہر عشق کے صفحات بڑھا دیں پلیز۔ ماہا ملک ہمارے ملک کی بہت بڑی رائیٹر ہیں۔ رانا محمد شاہد، منشی محمد عزیز میئے، اشفاق بٹ اینڈ شاہین، سعید گلاب، اسماعیل بروہی بھیا، اشعر جواد، قرۃ العین زینب، عکاشہ سحر، فرحت جمال، عبدالعزیز انکل، صفیہ مغل، شگفتہ شفیق، سائرہ لنگڑیال، ملکہ احوال تحسین جونیجو، آپ سب احوال سے غائب ہیں پلیز لوٹ آئیں، محفل میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا۔ پھر ملیں گے۔

☆ اے آفت کی پڑیا! خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ گڑیا اپنا بہت خیال رکھنا۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔

✉ ہمارے ساتھی شاہد رفیق سہو کبیر والا کچھ یوں رقم طراز ہیں۔ ماہ جولائی کا پرچہ آپ کی محنت سے ڈاکیا بہت جلد دے گیا۔ اس بار ٹائٹل پھر بہت ظالم تھا۔ ٹائٹل والی حسینہ اپنی مست آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کچھ زخم پھر تازہ ہو گئے۔ اس کے بعد احوال میں آنا چاہا لیکن آگے جنت آ گئی۔ جنت تو جنت ہے۔ اس کے بعد محمد ابو ہریرہ بلوچ۔ ندیم عباس میوانی، ایم یعقوب ڈیرہ غازی خان، سدرہ انور علی جھنگ، ملک سفیر انجم، شازیہ گل مانسہرہ، مور شاہد حسین قمر شہداد کوٹ، ممتاز احمد سرگودھا، ایم وکیل عامر جٹ آپ کے تبصرے بہت اچھے تھے اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھا شکریہ۔ اس کے بعد کہانیوں میں میرے بھائی ممتاز احمد کی عید مبارک اسٹوری کی کیا بات ہے شمارے کی ٹاپ اسٹوری

تھی۔ اچھے لفظوں کا چناؤ کیا اور 26 جولائی کو آپ کو سالگرہ بہت مبارک ہو۔ اس کے بعد زہر عشق کاشی چوہان، وہ تو ہماری روح بن چکی ہے اور روح کو کون چھوڑ سکتا ہے۔ میں خوشی ہوں۔ ایم یعقوب بہت اچھی اسٹوری لے کر آئے، لہو کے چراغ اقبال زمان، کٹی پتنگ سیما عروج، سایوں پر نقش ثمینہ فیاض، بھاگوں والی جیجل میتلو، یہی صلہ ہے سیما گل، خود اپنے ہاتھوں عبدالغفار عابد، جائے پناہ الماس فاطمہ، بھنور باندھ لیے، ثمینہ طاہر بٹ، کفارہ ہوا ادا مومینہ بتول، کس طرح لوٹاؤں حنا بشریٰ، یہ اسٹوریاں میں نے اب تک پڑھی ہیں جو بہت اچھی تھیں۔ اب اجازت۔

☆ پیارے بھائی شاہد! تبصرہ بہت اچھا کیا تم نے۔ اُمید ہے اس ماہ ہماری طرف سے بھی آپ کو اپنا گفٹ پسند آئے گا۔

✉ راشد لطیف صبرے والا سے بہت محبت سے شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ ماہ جولائی کا سچی کہانیاں شاہد رفیق نے بھیجا۔ ٹائٹل بھی بہت خوبصورت تھا۔ حسینہ رمضان المبارک کہہ رہی تھی۔ (آپ نے سن لیا......) منزہ سہام کی جنت والی بات پڑھی بہت اچھی لگی۔ اس کے بعد احوال میں ان سب کے تبصرے لاجواب تھے۔ کہانیوں میں گھورا اندھیرا، ہم نے تو وفا کی تھی، میں خوشی ہوں ایم یعقوب، سب راہیں ایک ہوئیں، زخم اپنا نشان چھوڑ گیا، لہو کے چراغ، یہی صلہ ہے یہاں، ساتویں بہن، بھنور باندھ لیے، عید مبارک، کس طرح لوٹاؤں، اور کاشی چوہان کی زہر عشق مجھے اس کا بہت انتظار رہتا ہے۔ بہت لاجواب اسٹوریاں تھیں۔ مسئلہ یہ ہے میں بابا جی لوگوں کی خوب محنت سے مشکلات حل کر رہے ہیں۔ ہائیڈ پارک، حسن نظامی صاحب چھا گئے تیر نیم کش میں شاہد سلیم، وکیل عامر جٹ، شازیہ گل بہت اچھے رہے۔ تمام دوستوں کو میری طرف سے عید مبارک۔

☆ پیارے راشد لطیف! تمہاری محبت ہمیں بہت انرجیٹک کر دیتی ہے۔ خدا تمہاری ساری پریشانیاں بھی دور کرے۔ (آمین)

✉ ڈاکٹر خادم حسین کھیڑا، رجب والا، ملتان سے پہلی بار شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں السلام علیکم! سچی کہانیاں کی محفل میں پہلی بار شرکت کی جسارت کر رہا ہوں اُمید ہے ویلکم کریں گے۔ مجھے ڈائجسٹ سے کوئی دل چسپی تو نہیں تھی مگر جب سے مجید احمد جائی سے علیک سلیک ہوئی ہے۔ قلم پھر سے تھام لیا ہے۔ میں شاعر بھی ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو سچی کہانیاں میں بھیج دوں۔ (فوراً بھجوائیں) ماہ مئی میں مجید احمد جائی کی کہانی ''وہ مرا طبیب خاص'' شائع ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجید احمد جائی نے کب لکھی اور کب سچی کہانیاں کو بھیجی۔ میں نے اس کا علاج ضرور کیا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دی۔ میں تو صرف وسیلہ بنا تھا۔ کرم تو اس ذات کریمی کا تھا۔ ماہ مئی سے میں بھی سچی کہانیاں پڑھنے لگا ہوں۔ اب ماہ جون کا سچی کہانیاں میری دسترس میں سرورق دیدہ زیب ہے۔ ''چلو بھر پانی'' منزہ سہام نے خوب لکھا۔ احوال میں پہنچا تو کاشی صاحب کی بات بھلی لگی کہ بیٹیاں تو رب کی رحمت ہوتی ہیں۔ صد افسوس کہ ہم ان رحمتوں کو زحمت گردانے لگے ہیں۔ ملتان کا سورج قہر برسا رہا ہے اور رہی سہی کسر واپڈا پوری کر رہا ہے۔ سب ساتھیوں، کے احوال زبردست تھے۔ کہانیوں میں لمحیوں کی بھول، ممتاز احمد سرگودھا، یہ آگ کب بجھے گی منشی محمد عزیز مے، ویلڈن!! زہر عشق تیسری اور چوتھی قسط پڑھ سکا، پہلی دو اقساط نہ پڑھنے کا افسوس رہے گا۔ کمال کا ناول ہے۔ اب جلدی سے اسے بک کی شکل دے دیں۔ اس کے علاوہ 25 کی 25 کہانیاں زبردست لگیں۔ کس کس کی تعریف

اگست 2015ء

تبصرہ برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام: --

مکمل پتا: --



اگست 2015ء

کہانی برائے اشاعت

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی: -------------------- تعداد صفحات: --------------------

نام: --

مکمل پتا: --

فون/سیل نمبر: --



اگست 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل،عنوان: -------------------- مصنف: --------------------

دوم،عنوان: -------------------- مصنف: --------------------

سوم،عنوان: -------------------- مصنف: --------------------

نام: -------------------- شہر: --------------------

کروں، کس پہ تنقیدی نظر ہو۔ سبھی نے خوب محنت کی ویلڈن۔ مستقل سلسلے خوب چل رہے ہیں۔

☆ پیارے خادم حسین! خوش آمدید سلامت رہیں۔ آپ کی آمد نے احوال کو منور کر دیا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور احوال میں حاضری مستقل کیجیے۔

کراچی سے ہماری بہت ہی پیاری، ہر دلعزیز سی آنٹی مسز نگہت غفار احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں موصول ہوا دل خوش ہوگیا سب سے پہلے نظر ٹائٹل پر پڑی۔ ناول بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ 'چلو بھر پانی' منزہ سہام نے کوزے میں دریا کو بند کیا ہے بہت خوب بی بی۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ 'احوال' میں کاشی نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنی بات کہی اور سبق دیا۔ ''کہانیاں'' پڑھیں تقریباً ساری کہانیاں پڑھ لیں۔ 'قطرہ قطرہ پگھلا ہوں' کہانی دکھی کر گئی۔ 'مقدمہ خون کا' اچھی کہانی تھی اختتامی پیراگراف بہت خوبصورت تھا۔ 'میرا کالا ہے دلدار، ہم کب سوچیں گے' کا انجام اچھا تھا۔ 'بڑے ابا' کہانی پسند آئی۔ 'یہ آگ کب بجھے گی' بالکل سچ کہا ہے بھائی منشی محمد عزیز مٹھے نے۔ 'ساجن کی کہانی' ہاں یہ سچ ہے کہ لوگ بنا کچھ سوچے سمجھے ہر کسی پر بھروسا کرتے ہیں اور نقصان اٹھاتے ہیں کہانیاں اچھی تھیں۔ تیر نیم کش اشعار اچھے لگے۔ 'بانیٔ پارک' ماں کے بغیر، ترقی کا راز، موت، آنسو۔ 'مسئلہ یہ ہے' ایک مفید اور کارآمد سلسلہ ہے۔ اللہ پاک ہر ایک کے مسائل حل کردے۔ اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ غفور الرحیم ہم سب پر رحم فرمائے۔ ہم سب کو نیکی اور بھلائی کے راستے پر چلائے۔

☆ پیاری آنٹی! تبصرہ شاندار اور جاندار تھا۔ اب ہر ماہ آپ کا تبصرہ ہمیں موصول ہونا چاہیے۔ آپ کی صحت وسلامتی کی ڈھیروں دعائیں۔

لیجیے ساتھیو! یہ احوال میں ہماری نئی قاری صائمہ مجید بھی حاضر ہوگئی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں کی نگری میں پہلی بار لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ اُمید ہے ویلکم کریں گے۔ میرے کزن مجید احمد جائی نے متعارف کروایا۔ وہ تو ہرفن مولا ہیں، ماہ جون کا سچی کہانیاں ماشاءاللہ! سرورق پہ بیٹھی حسینہ بھلی لگ رہی تھی۔ مستانی آنکھوں میں ناجانے کس کے سپنے سجائے بیٹھی تھی۔ آگے بڑھی تو اداریے میں منزہ سہام ''چلو بھر پانی'' کا ذکر کرکے ہمیں جھنجھوڑ رہی تھیں۔ شہر احوال میں بہت سے نئے لوگ شامل تھے سبھی کو مبارک باد، مجید احمد جائی کا احوال پڑھ کر شاک سا لگا۔ آخر کون لوگ ہیں جو حسد کر رہے ہیں۔ نفرت کو ہوا دے رہے ہیں۔ ادب کی دُنیا میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ پھر پیاری سدرہ انور، عظمیٰ شکور، فرح انیس، صائمہ بشیر، مسز نوید ہاشمی، کیسے ہیں سب، رونق کا باعث بڑھا ہیں ناں۔ مور شاہد حسین، منشی محمد عزیز مٹھے، آپ کس کی منشی گیری کرتے ہیں؟ ممتاز احمد سرگودھا، ندیم عباس ڈھکو، محمد راشد لطیف صبر ے والا، سبھی کے احوال جاندار تھے۔ سبھی نے خوب قلم چلایا۔ کہانیوں کی نگری میں غوطہ زن ہوئی تو سب سے پہلے زہرِ عشق پڑھا، ناول میری مجبوری ہے اور پُرا سرار یت بھرا ناول!! واہ واہ کیا کہنے۔ ہر قسط پہلی سے جاندار، خوبصورت الفاظ، جملے، اس نے اپنا گرویدہ کر دیا۔ چوتھی قسط شاندار ٹھہری آگے کا انتظار رہے گا۔ کاشی بھیا مبارک باد۔ برطانیہ میں خزاں لطف اندوز کر گئی۔ ایسا لگتا تھا میں بھی محمود شام کے ساتھ چل رہی ہوں۔ ''خواں کی بھول'' ممتاز احمد سرگودھا، شاندار کہانی پلیٹ فارم کے حوالے سے لکھی۔ ''یہ آگ کب بجھے گی'' منشی محمد عزیز مٹھے مختصر سچ بیانی لائے تھے۔ میرا کالا ہے دلدار، ثانیہ جبنی نے کمال لکھا۔ اس کے علاوہ باقی کے تمام اسٹوریاں

زبردست تھی۔ ہر کسی کے بارے میں لکھوں تو احوال طوالت کا شکار ہو جائے گا۔ مستقل سلسلے بھی اچھے جارہے ہیں۔

☆ پیاری صائمہ! خوش آمدید! مجید جانی واقعی ہرفن مولا ہے۔ خدا اُسے صحت دے۔ اب آپ کی مستقل آمد ہو یہ ہماری خواہش ہے۔

✉ ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست مجید احمد جائی ملتان شریف سے شامل احوال ہیں۔ ماہ جولائی کا سچی کہانیاں پوری آب و تاب، تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بہت جلد موصول ہوا۔ اس بار ٹائٹل بہت ہی خوبصورت تھا۔ سرورق پر بیٹھی دوشیزہ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کمال کر دیا سچی کہانیاں نے، کاشی بھائی آپ کا ماتھا چومنے کو دل کر رہا ہے، گریٹ یار، ''جنت'' منزہ سہام کے اداریہ میں پہنچے تو بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوئے اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ احوال میں قدم جمائے تو بہت سے نئے دوستوں کو ویلکم کرتے رہے، پرانے غائب ہوتے جارہے ہیں، کیوں جی؟ تمام نئے آنے والوں کو خوش آمدید، پیارے علی حسنین تابش، اللہ تعالیٰ آپ کے والد گرامی کے درجات بلند فرمائے اور آپ کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ پیاری بہنا، سدرہ انور علی، آپ کو سالگرہ کی بہت بہت مبارک باد، آپ نے بھائی کہہ کر میرا دو کلو خون بڑھا دیا، خوش رہیں۔ ریحام خان کے بارے میں احمد سجاد بابر نے کمال لکھا، عید مبارک، ممتاز احمد سرگودھا، کمال لکھ رہے ہیں، میری طرف سے ڈھیروں مبارکاں، ارے ہاں، 26 جولائی کو آپ کی سالگرہ پر مبارک باد۔ سب راہیں ایک ہوئیں ڈاکٹر طارق محمود آکاش، بھاگوں والی جیجل میتلو، بیاہی عورت ازم ناز، لہو کے چراغ، محمد اقبال زمان، اور تماشا تما ہوا، نبیل جاوید، جائے پناہ، الماس فاطمہ ارمان، اک ذرا سی بات جاوید راہی بہت خوب رہیں، اس کے علاوہ تمام کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔ کس کس کا نام لوں، سب ہی کو مبارکاں۔

زہر عشق، کاشی چوہان، پانچویں قسط نے کمال کر دیا، آپس کی بات ہے، کاشی بھائی آپ کو ایسی پُراسرار کہانی لکھتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔ کیا پُراسراریت ہے کہانی میں۔ پڑھتے پڑھتے اس کے سحر میں ڈوب جاتے ہیں، جب نظر (باقی اگلے ماہ) پر جا رکتی ہے تو اپنی دُنیا میں لوٹ آتے ہیں، ہم شکل ایم اے راحت اپنی جادوئی انداز سے آگے کو بڑھ رہی ہے۔ برطانیہ میں خزاں چھٹا حصہ خوبصورت رہا، اللہ بادشاہی بھی جدید زمانے کی عکاس تحریر تھی، اس کے علاوہ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، شاندار جا رہے ہیں۔ آخر میں انہی دعاؤں کے ساتھ اجازت طلب ہوں کہ رب رحمان سبھی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔

☆ پیارے مجید! سلامت رہو! پچھلے احوال کا کیا ہوا۔ ہم لاعلم ہیں۔ برقی نامے کا بتا دیا تھا اب تو کوئی شکایت نہیں ہے نا۔

✉ سیدہ نامعنی راولپنڈی سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں۔ ماہ جولائی کا ڈائجسٹ راولپنڈی سے خریدا۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا سب سے پہلے احوال میں گئی جہاں پر میرے کچھ جانے پہچانے نام تھے۔ ابوہریرہ بلوچ، ندیم عباس میوانی، راشد لطیف، عامر وکیل جٹ، ایم یعقوب، شاہد رفیق سہو، چوہدری پرویز بھو، ان کے احوال بہت اچھے تھے۔ کہانیوں میں ریحام خان، میں خوش ہوں، زہر عشق جو کہ ایڈیٹر کاشی چوہان صاحب کی تھی۔ بہت پیاری اسٹوری تھی، کفارہ ادا

ہوا، بیاہی عورت، لہو کے چراغ، اک ذرا سی بات، عید مبارک، کس طرح لوٹاؤں یقیں، بہت اچھی اسٹوریاں تھیں۔ سچی کہانیاں کے لیے کچھ لکھنا چاہتی ہوں اگر آپ نے ویلکم کیا تو۔

☆ امامہ جی! خوش آمدید! ویلکم! جی آیاں نوں..... خوش۔ اب جلدی سے کچھ نہیں، بہت کچھ لکھ بھیجیں۔ لیکن خیال رہے ڈائجسٹ آپ پڑھ چکی ہیں۔ آپ کا لکھا ہمارے پرچے کے مزاج کا ہونا چاہیے۔

✉ ڈسکہ سیالکوٹ سے عرصے بعد ہمیں یاد کیا ہے۔ ہماری بہت ہی پیاری ساتھی لکھاری نسیم سکینہ صدف نے، لکھتی ہیں۔ حسب وعدہ ایک کہانی لے کر آپ سے مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر رہی ہوں۔ پیارے بھائی اللہ آپ کو اور سب اہل خانہ کو زندگی کی ہمیشہ سچی خوشی خوشیاں دے۔ اس وقت میرے جو بھی مہربان آپ کے قریب تشریف فرما ہیں۔ ان صاحب کی خدمت میں میرا نیاز مندانہ سلام۔ خدا آپ کو اور اہل خانہ کو زندگی کی بھرپور خوشیاں دے۔ آمین۔

☆ بہت عزیز! بہن نسیم سکینہ صدف! ہمیں یاد کرنے کا دل سے شکریہ۔ مگر نسیم تبصرہ کیا ہوا؟؟ اب احوال میں آپ اپنی حاضری ممکن بنا ہی لیں۔ اُسے ہماری محبت اور ہمارا حکم ہی سمجھیں۔

✉ یہ احوال میں حاضری دے رہی ہیں ہماری نئی ساتھی سنبل ناہید نوشہرہ سے لکھتی ہیں۔ پیارے کاشی چوہان صاحب اُمید کرتی ہوں آپ اچھے ہوں گے۔ ہمیشہ کی طرح جون کے شمارے کا بے چینی سے انتظار تھا اور جب ہاتھ آیا تو اپنی کہانی ڈھونڈتی رہ گئی۔ دل بہت اُداس ہوا کہ اچانک احوال میں اپنے نام پہ نظر پڑی بس پھر کیا تھا، دل میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگیں کہ چلو اس قابل تو سمجھا کہ میرا خط شامل کیا۔ اس کے لیے آپ کی بہت بہت شکر گزار ہوں۔ شمارہ اس بار اپنی امی سے چھپا کے رکھا تھا کہ اگر ان کے ہاتھ لگ گیا تو پھر مجھے نہیں ملنے والا! چاہتی تھی جلدی جلدی پڑھ کے تبصرہ بھیجوں مگر شمارہ پھر بھی امی کے ہاتھ لگ گیا تھا، اس لیے کبھی ان کے پاس اور کبھی میرے پاس اس لیے خط لکھنے میں دیر ہوگئی۔ پہلے ہی صفحے پہ 25 سے زائد کہانیاں دیکھ دل خوش ہوا کہ اس بار اور مزہ آئے گا اتنی ساری کہانیاں پڑھ کے۔ سچ بیانیوں میں نجمہ جبیں علیزئی کی 'تم میری ہو' بہت اچھی لگی۔ اس کے علاوہ گڈی آپا کا ''تقدیر نے لوٹا ہے مجھے'' بھی زبردست رہا۔ حکایت کہانی میں 'بڑے ابا' یہ آگ کب بجھے گی، اور میڈل آف لو سب سے اچھی تحریر لگی۔ شعلہ ساماں تحریروں میں 'قطرہ قطرہ پگھلا ہوں' کو پڑھا بہت زبردست لگا۔ اور پلیٹ فارم کہانی تو زبردست ہوتی ہی ہے۔ لمحوں کی بھول، چار مہرے کا کھیل، اور تو کاری نہیں ہے ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں تھیں۔ سچی کہانیاں کی ساری کہانیں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ اور سچی کہانیاں کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ یہ ہر ایک کو موقع دیتے ہیں اپنے آپ کو آزمانے کا اور اپنے فن کو سنوارنے کا۔

☆ اچھی سنبل! جگ جگ جیو! تبصرہ بہت اچھا کیا تم نے۔ گڑیا یہ بتاؤ ہمیں امی کا تبصرہ کب ملے گا۔

✉ باادب باملاحظہ ہوشیار! کبیر والا سے پہلی بار ثمینہ شہزادی کی سواری احوال میں اتر رہی ہے۔ لکھتی ہیں ماہ جولائی کا پرچہ شاہد رفیق سہو نے میرے بھائی کو دیا جو گھر آ کر پڑھنے لگا۔ جب وہ ڈائجسٹ رکھ کر باہر چلا گیا تو میں بھی رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔ سچی کہانیوں کا ٹائٹل بہت خوبصورت لگا۔ میں تو پہلے کرن رسالہ پڑھتی تھی۔ سچی کہانیوں کا احوال تھوڑا بہت پڑھا۔ جس میں مجھے سدرہ انور

علی، شازیہ گل، نادیہ جہانگیر، شاہد رفیق سہو، چوہدری فہد علی کے خط بہت پسند آئے۔ اس کے بعد میں نے چار اسٹوریاں پڑھیں۔ جن کے نام لینا میں ضروری سمجھتی ہوں، زہر عشق کاشی چوہان صاحب کی، اس اسٹوری نے بہت مزہ دیا، یہی صلہ ملا ہے یہاں سیما گل، سایوں پر نقش ثمینہ فیاض، کس طرح لوناؤں حنا بشریٰ کی، اسٹوریاں مجھے بہت ہی اچھی لگیں۔ مسئلہ یہ ہے بہت اچھا ٹاپک ہے۔ بہن بھائیوں کی مشکلات حل ہو رہی ہیں۔ میں دل سے دعا کرتی ہوں سچی کہانیاں مجھے ہر ماہ ملتا رہے۔ اللہ حافظ۔

☆ شہزادی صاحبہ! خوش آمدید، آپ فوری طور پر 890 روپے کا منی آرڈر کر دیجیے۔ پرچہ ہر ماہ آپ کو ملتا رہے گا۔ آپ کی آمد سے ہمیں بہت خوشی ہوئی امید ہے ہر ماہ ہمیں آپ کا تبصرہ ملتا رہے گا۔

✉ لک موڑ سرگودھا سے ہمارے نئے ساتھی نبیل جاوید عرض گزار ہیں۔ 29 تاریخ کو جولائی کا شمارہ ملا۔ محبت سے تھام کر دل میں بٹھا لیا۔ ماڈل سے رسمی دعا سلام کے بعد آگے بڑھے اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے پھولوں سے سجی فہرست میں...... ارے یہ کیا ہم بھی شامل تھے۔ جس طرح میری حوصلہ افزائی کی گئی۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح محبت و اپنائیت سے نوازتے رہیں گے۔ بے حد شکریہ بھیا۔ آنٹی منزہ سہام نے اداریہ 'جنت' لکھا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ احوال میں آپ مخصوص رفتار سے احوال کی بس چلا رہے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر اگر مجھے بٹھا لیتے تو بہت مزہ آتا۔ بہرحال تمام نئے احوالیوں کو خوش آمدید۔ ویلکم اب تھوڑا سا تبصرہ کہانیوں پر۔ اعجاز احمد صاحب ماشاء اللہ کیا خوب کہانی تھی۔ نسیم صدر الدین کی ہم نے تو وفا کی تھی پسند آئی۔ سیما عروج کی کٹی پتنگ، یعقوب صاحب کی میں خوشی ہوں۔ ڈاکٹر طارق صاحب کی سب راہیں ایک ہوئیں، بھاگوں والی بھی اچھی تھی۔ غلام عباس کی زخم اپنا نشان چھوڑ گیا۔ بس ٹھیک ہی تھی کیوں کہ مجھے کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ خود اپنے ہاتھوں اپنے ہی علاقے کی اسٹوری پڑھ کر مزہ آ گیا۔ کیا خوب کہانی تھی ماشاء اللہ۔ ارم ناز کی کہانی بیاہی عورت، اس کے علاوہ باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے ٹائم ہی نہیں ملا۔ بھائی پراسرار نمبر 2 کا شدت سے انتظار ہے۔ اب اجازت! زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔

☆ اچھے نبیل! آپ کو پرچہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہو گئی۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ احوال میں آمد مستقل بناؤ۔

✉ چشتیاں سے شہزاد احمد ساحر بھی پہلی بار احوال میں شریک ہو رہے ہیں لکھتے ہیں۔ کاشی چوہان صاحب امید ہے آپ ٹھیک ہوں گے۔ بک اسٹال پر آپ کا ڈائجسٹ سچی کہانیاں دکھائی دیا۔ کیا خوب صورت ٹائٹل تھا۔ نظروں کو کافی بھایا۔ خریدا اور جب پڑھنے لگا۔ جی جناب یہ آپ کا ڈائجسٹ 'سچی کہانیاں' ہی تھا۔ دل چاہا احوال میں شامل ہو کر آپ سے دعا سلام ہو جائے۔ کاشی بھائی آپ ہمیں ویلکم کریں گے۔ یہ کسی ڈائجسٹ میں میرا پہلا خط ہے نہ جانے کیسا لکھا ہے۔ شائع کر کے حوصلہ افزائی کیجیے گا۔

☆ ساحر! خوش آمدید، کاش کچھ لکھا بھی ہوتا تو مزہ بھی آتا مگر...... حسرت ان غنچوں پہ ہے...... یار پرچہ خرید لیا تھا تو کم از کم تبصرہ تو کر لیتے۔

✉ لاہور سے یہ آمد ہے ہماری ہر دل عزیز رضوانہ کوثر کی لکھتی ہیں۔ کیسے ہو احوالیو! میری دعا

ہے اللہ پاک سب کو اپنی امان میں رکھے۔ جولائی کا سچی کہانیاں اپنے منفرد سرورق کے ساتھ بہت دل کو بھایا۔ ایسا لگا کوئی انٹرنیشنل پرچہ ہاتھ میں آ گیا ہو۔ ویلڈن کاشی جیتے رہو۔ جام شیریں، پینٹین، آملہ ہیئر، اور بیک پارلر کو پھلانگتے ہوئے اداریے تک پہنچے۔ اداریہ سے پہلے سہام مرزا کی تصویر نے گئے وقتوں کی یاد دلا دی۔

سہام مرزا جیسی شخصیات زمانے میں اپنی انفرادیت، محنت اور لگن کے ایسے نقش چھوڑ جاتی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے زادراہ ثابت ہوتی ہیں۔ منزہ کا 'جنت' حقیقت پر مبنی تھا۔ احوال میں تمام نئے اور پرانے ساتھیوں کو سلام اور دعائیں۔ ساتھیو! آج کل میری طبیعت بہت خراب ہے۔ میری آپ سب سے گذارش ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کیجیے۔ میں جانتی ہوں جس طرح آپ کی دعاؤں نے آج تک مجھے ہمت دی ہے آگے بھی انہی دعاؤں کے سہارے زندگی سہل ہوگی۔ احمد سجاد بابر، تم میرے پسندیدہ رائٹرز کی صف میں شامل ہو۔ جو بھی لکھتے ہو دل میں اتر جاتا ہے۔ اس ماہ اعجاز احمد نگرال کی گھور اندھیرا، نسیم صدر الدین سرائی کی ہم نے تو وفا کی تھی، غلام عباس سیال کی زخم اپنا نشان چھوڑ گیا، ارم ناز کی بیاہی عورت، مرزا مبشر بیگ کی اولڈ ہاؤس، ثمینہ طاہر بٹ کی خوش ہو کے بھنور باندھ لیے، حنا بشریٰ کی کس طرح لوٹاؤں یقیں، منزہ نصیر کی کوئی کب تک سہے یادگار تحریریں رہیں۔ جب کہ جاوید راہی اور ممتاز احمد کے لیے ہمیشہ کی طرح یادگار تحریریں لانے پر تعریف کے الفاظ اب محبت کا احاطہ نہیں کرتے۔ خوش رہیے۔ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے ناول سچ مچ سچی کہانیاں کی جان ہیں۔ پرچہ پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ بس اس ماہ کے لیے اتنا ہی انشاء اللہ زندگی نے اجازت دی تو اگلے ماہ پھر آپ کے سامنے ہوں گے۔ میری جانب سے سب کو عید مبارک۔

☆ پیاری رضوانہ آپی! آپ کا تبصرہ ہمارے لیے ایک شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی صحت کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ چوہدری پرویز سہو خانیوال سے احوال کو رونق بخش رہے ہیں۔ ماہ جولائی کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ ٹائٹل پہلے کی طرح بہت خوبصورت تھا۔ اس کے بعد اپنے من پسند ٹاپک احوال میں گیا۔ احوال میں ابو ہریرہ بلوچ، ایم یعقوب، سدرہ انور علی، عبدالغفار عابد، ثناء کنول، شاہد رفیق، شازیہ گل، ممتاز احمد، مور شاہد حسین، فیصل ندیم بھٹی، وکیل عامر جٹ، عظمیٰ شکور بہت اچھے تبصرے کیے اور آپ سب نے یاد رکھا۔ بہت شکریہ، کہانیوں میں ریحام خان، احمد سجاد، سایوں پر نقش، خود اپنے ہاتھوں، یہی صلہ ہے یہاں، عید مبارک، جائے پناہ، کیسی محبت، کس طرح لوٹاؤں، کوئی کب تک سہے اور زہر عشق کاشی بھائی کیا بات ہے۔ مسئلہ یہ ہے میں بابا جی بہت نیک کام کر رہے ہیں۔ اس بار بہت اچھا ڈائجسٹ تھا۔ میری طرف سے سب کو عید مبارک۔

☆ چوہدری صاحب! اسی نے بڑا چنگا تبصرہ کیتا اے۔ آمد کا شکریہ۔

✉ نعیم اللہ ہڈالی سے پہلی بار شامل احوال ہیں لکھتے ہیں ماہ نامہ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، رائٹرز اور سچی کہانیاں پڑھنے والوں کی خدمت میں سلام۔ چونکہ ابھی تک نیا شمارہ نہیں ملا اس لیے بغیر تبصرے کے خط اور کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ میں پہلی بار ماہ نامہ سچی کہانیاں کے لیے خط اور کہانی بھیج رہا ہوں امید کرتا ہوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اللہ تعالیٰ ماہ نامہ سچی کہانیاں کو دن دوگنی رات

چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ پیارے نعیم! خوش آمدید تمہاری لگن دیکھتے ہوئے یقین ہے کہ تم جلد لکھنا سیکھ جاؤ گے۔ خوش رہو۔ اُمید کا دامن ہرگز نہ چھوڑنا۔ محنت کرو۔

✉ دیپال پور سے عابد علی انجم کی احوال میں اولین شرکت ہے لکھتے ہیں جناب کاشی صاحب کام کی مصروفیات کی وجہ سے مئی کا ڈائجسٹ خریدنے میں تھوڑی دیر ہوگئی۔ بہت شکریہ آپ نے ہمیں سچی کہانیاں میں لکھنے کے قابل سمجھا۔ خیر آتے ہیں خطوط کی طرف تو سب سے پہلے جو لیٹر پڑھا وہ تھا جواد احمد کا۔ جواد بھائی آپ نے بہت اچھا لکھا۔ اللہ آپ کو کاشی صاحب سے ملوائے آمین۔ باقی سب نے بھی بہت اچھا لکھا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف گڈی آپا تقدیر نے لوٹا ہے نے دل پہ وار کیا۔ عظمیٰ شکور کا جیب کا کفن۔ صبا اقبال عشق نے پامال کیا۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ جولائی کا شمارہ مجھے مل گیا لیکن ابھی میں نے نہیں پڑھا ہے۔ سب نے اچھا لکھا ہوگا جناب۔ کاشی سر ایک کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆ بھائی عابد! آپ کی کہانی پڑھی مگر چھوٹے بھائی تمہیں بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ امید ہے دل سے محنت کرو گے۔ مطالعہ بڑھاؤ گے تو لکھنے میں خود بخود آسانی پیدا ہوگی۔

✉ چشتیاں سے لاریب علی کی بھی احوال میں پہلی شرکت ہے۔ لکھتی ہیں کاشی چوہان صاحب السلام وعلیکم کیسے ہیں آپ؟ تابش صاحب نے آپ کے اس خوبصورت ڈائجسٹ سے متعارف کروایا۔ میں ایک دن کے لیے ان سے پڑھنے کے لیے لائی۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے پاکستان میں اتنا معیاری ڈائجسٹ بھی شائع ہو رہا ہے۔ دل تو نہ چاہا کہ واپس کروں مگر امانت تو امانت ہوتی ہے ناں...... خیر واپس تابش جی کو دے آئی۔ مگر جی چاہا کہ کیوں ناں احوال میں حصہ لیا جائے۔ تو ایک خط لکھ ڈالا۔ اُمید ہے آپ میرا خط شامل کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆ اچھی لاریب! خوش آمدید! ہمیں امید ہے اس ماہ سچی کہانیاں آپ خود خرید کر پڑھیں گی۔ اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ حمیرا جبیں عبدالحکیم، کبیر والا سے رقم طراز ہیں، السلام وعلیکم ماہ جولائی کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل بہت زبردست تھا سب کو رمضان مبارک۔ پہلے منزہ آنٹی کا جنت پڑھا۔ اس کے بعد احوال میں ابو ہریرہ بلوچ، ندیم عباس میواتی، سدرہ انور علی میرے کزن شاہد رفیق سہو، راشد لطیف صبرے والا، چوہدری فہد علی سہو، پرویز سہو، شازیہ گل، عظمیٰ شکور، مسز نوید ہاشمی ان کے احوال مجھے بہت پسند آئے۔ اس کے بعد کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ اسٹوری زہر عشق کاشی بھیا کی پڑھی جو بہت ہی اچھی جا رہی ہے۔ کٹی پتنگ سیما عروج، سایوں پر نقش ثمینہ فیاض، بیاہی عورت ارم ناز، یہی صلہ ہے یہاں سیما گل، جائے پناہ الماس فاطمہ، بھنور باندھ لیے ثمینہ طاہر بٹ، کفارہ ہوا ادا مومنہ بتول، عید مبارک ممتاز احمد، کس طرح لوٹاؤں، حنا بشریٰ یہ اسٹوریاں مجھے پسند آئیں اور باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔

☆ حمیرا جبیں صاحبہ! بھئی اس بار آپ نے بھی ہمارا دل جیت لیا۔ خوش رہو اور ہر ماہ آپ کو ہمارے احوال میں شریک ہونا ہے۔

✉ احوال میں پہلی بار ہماری بہن شازیہ محسن، خانیوال سے رقم طراز ہیں۔ محترم جناب کاشی

چوہان، السلام وعلیکم امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں اپنی کہانی لے کر حاضر ہوں۔ امید ہے آپ کے معیار پر پورا اترے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دن دگنی، رات چوگنی ترقی دے۔ آمین۔

☆ پیاری بہن! خوش آمدید! انشاءاللہ بہت جلد آپ کی کہانی سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

✉ یہ احوال میں پہلی بار شرکت کر رہے ہیں مہورہ، فتح جنگ سے نزابت افشال، لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں ماہ جولائی کا شمارہ سہام مرزا صاحب کی تصویر دیکھ کر خریدا۔ (ارے......) میں تکلفات کو پسند نہیں کرتا سو مختصراً کہوں گا کہ ذخیرہ معلومات پر مشتمل بہت اہم رسالہ ہے۔ تمام کہانیاں بہترین ہیں۔ کس کس کی تعریف کروں۔ میں شاعر ہوں لہٰذا میرا پسندیدہ سلسلہ تیر نیم کش ہے۔ اکتوبر تک میرا مجموعہ کلام بھی انشاءاللہ مارکیٹ میں آجائے گا۔ مقتدر بابا اور کفارہ ادا ہوا بہت سبق آموز کہانیاں تھی۔ کاشی بھائی میں اپنی شاعری بھیج بھیجنا چاہتا ہوں مگر مسئلہ یہ ہے کہ میری شاعری حبیب جالب کی طرح تنقیدی شاعری ہے۔ (کرلوگل......) کیا آپ اُسے شائع کریں گے۔

☆ بھیا! خوش آمدید۔ اب ہمیں بھی لگ رہا ہے آپ نے پرچے میں بس ہمارے سہام مرزا کو ہی دیکھا تھا اگر سہام مرزا کا پرچہ بھی پڑھ لیتے تو...... تھوڑا تبصرہ کرتے، اچھا لگتا۔ شاعری بالکل بھیجو معیار پر پورا اتری تو ضرور شائع ہوگی۔

✉ صادق آباد سے ہمارے ننھے دوست عارف شہزاد احوال میں حاضر ہیں لکھتے ہیں۔ السلام وعلیکم۔ کاشی چوہان صاحب اُمید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ سر آپ نے میری اسٹوری محبت ایک کاروبار ریجیکٹ کر دی مجھے دکھ تو ہوا، پر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ آپ کو ایک اور اسٹوری پوسٹ کر رہا ہوں۔ برائے کرم اس بار میرا دل مت توڑنا اور سچی کہانیاں میں ضرور جگہ دینا۔

☆ پیارے عارف! ہم نے تمہارا دل نہیں توڑا بلکہ تمہیں بہتری کی جانب قدم بڑھانے پر اکسایا ہے۔ ہماری بات کو مثبت انداز میں لو۔ یاد رکھو! خدا کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں کرتا۔ کہانی موصول ہوگئی ہے پڑھ کر رائے دیں گے۔

✉ لاہور سے ہماری شاعرہ ساتھی فریدہ جاوید فری اپنی محبتوں کے ساتھ احوال میں شریک ہیں لکھتی ہیں۔ جولائی کا سچی کہانیاں اپنے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ کس کس کی تعریف کروں۔ گھورا اندھیرا جیون میرا، اعجاز احمد کی کہانی ہم نے تو وفا کی تھی۔ تسنیم صاحبہ کی کہانی کٹی پتنگ، سیما عروج صاحبہ کی میں خوشی ہوں، اور طارق محمود آ کاش کی کہانی نے بہت مزہ دیا۔ مجید احمد جائی پروانہ کریں ایسے لوگوں کی۔ نبیجل میتلو کی بھاگوں والی بے حد اچھی کہانی لگی۔ غلام عباس اور نبیل جاوید، بیاہی عورت بے حد شاندار کہانی لگی۔ ابھی اتنی ہی کہانیاں پڑھی ہیں، ہم شکل ایم اے راحت صاحب کا سلسلہ وار ناول تو میں ضرور پڑھتی ہوں، جن بہن بھائیوں نے میری صحت کے لیے دعا کی بہت بہت شکریہ۔ میری طرف سے سب کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ اگلے ماہ زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گے۔

☆ فریدہ جی! آپ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ کی احوال میں شرکت ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔

✉ چشتیاں سے افشاں زریں کی احوال میں پہلی بار آمد ہے لکھتی ہیں۔ مطالعہ کا شوق تو پہلے سے تھا مگر اس کو پڑھنے کے بعد باقی سب ڈائجسٹ بھول گئی۔ بہت پیارا ڈائجسٹ ہے۔ جب تابش نے

تبدیلی ایجنٹ

عوام اور مشتہرین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ادارہ پرل پبلی کیشنز نے الفتح نیوز ایجنسی، مہران مرکز، سکھر کو تبدیل کر کے داؤد بک اسٹال، دکان نمبر 7۔ مہران مرکز سکھر، کو ایجنٹ مقرر کر دیا ہے۔ تمام ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

بتایا کہ کاشی چوہان جو کہ اس ڈائجسٹ کے ایڈیٹر بھی ہیں ان کا ناول بھی شائع ہو رہا ہے تو بنا پڑھے نہ رہ سکی۔ پرچے بھی لے لیے ہیں تاکہ آپ کا ناول شروع سے پڑھ سکوں۔

☆ پیاری افشاں خوش آمدید! اب آ گئی ہو تو آتی رہنا۔ تمہاری آمد نے ہمیں سچ مچ مسرور کیا ہے۔

✉ پھولوں کی نگری پتوکی سے ہمارے قاری دوست ندیم عباس میواتی احوال میں براجمان ہیں لکھتے ہیں۔ گرمیاں جوبن پر ہیں رمضان میں میری مصروفیات نہ پوچھیں۔ جولائی کا شمارہ ہاتھوں میں آتے ہی سرورق پر طائرانہ نظر دوڑائی۔ ایک نظر حسینہ کو دیکھا جو امتحان لینے لگی فوراً ورق پلٹ دیا۔ جامِ شیریں کا جگ دیکھ کر افطاری کا ٹائم یاد آ گیا۔ پھر اڑان بھری اور احوال کی محفل میں آن پہنچا۔ ارے واہ بھائی ابو ہریرہ بلوچ، محمد عثمان بلوچ، بھائی خالد شاہان آپ کو احوال میں دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ خوش آمدید جی آیا نوں۔

ارے بھئی شعبان کھوسہ اور بابا مجید جائی کہاں گم ہیں۔ بابا جائی میں فرطِ حیرت میں ہوں جب آپ نے فٹ سے بولا میواتی ہو۔ بڑی آپا مسز نوید ہاشمی اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ ساتھیو! میرے پیپر تو اچھے ہوئے مگر تین پیپرز نہ دے سکا۔ کیوں کہ ایک ہی ٹائم پر دو پیپرز آ گئے تھے۔ اب رزلٹ کے لیے دعاؤں کی گذارش ہے۔ (اب دعائیں...... اللہ خیر کرے) بھائی مور شاہد جلدی سے ایڈریس بھجواؤ۔ گلابوں کا گلدستہ حاضر ہے۔ (ہمارے پاس بھجوا دو......) دیگر احوال میں علی حسنین تابش، ایم یعقوب، پیاری گڈی آپا، ممتاز احمد، عظمیٰ شکور، فرخندہ بتول کے تبصرے بہت دلچسپ اور جامع تھے۔ کہانیوں میں سب سے بیسٹ زہر عشق کاشی چوہان کی۔ بےچارے جن کا بھائی کیوں اتنا امتحان لے رہے ہیں۔ اب صنوبر کو امریکہ نہ بھیج دینا۔ (نہیں بھیجا...... خوش) بھائی یعقوب تمہاری خوشی نے تو رُلا دیا یار۔ مقتدر بابا، خود اپنے ہاتھوں، ذرا سی بات، کیسی محبت، بیاہی عورت، کس طرح لوٹاؤں یقیں، تماشا تمام ہوا، ساتویں بہن، چھٹی حس، یہی صلہ ہے یہاں، سایوں پر نقش اور باقی کہانیاں بھی بہت پسند آئیں۔ کاشی بھائی جی پراسرار نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ میری طرف سے آپ کو اور تمام سچی کہانیاں اسٹاف کو اور قارئین بہن بھائیوں کو بہت بہت عید مبارک۔ مجھے بھی اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔

☆ پیارے گلاب...... ندیم! خوش رہو تمہارا تبصرہ بہت اچھا ہے مگر یہ دل ہی جانتا ہے جس طرح ہم تک پہنچا...... عید مبارک۔

✉ چوہدری فہد سہو، جسو کا نویں سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں لکھتے ہیں۔ ماہ جولائی کا شمارہ ملا لڑکی نے بہت خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا۔ سب سے پہلے احوال میں گیا۔ اپنا خط دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے ویلکم کیا مجھے بہت اچھا لگا۔ احوال میں بہت اچھے تبصرے تھے۔ کہانیوں میں جو

ابھی تک پڑھی ہیں۔ زہر عشق کاشی چوہان کی جو کہ میری جان ہے، ہم نے وفا کی تھی، زخم اپنا نشان چھوڑ گیا، کوئی کب تک سہے، عید مبارک، اک ذرا سی بات، ساتویں بہن، جائے پناہ، برطانیہ میں خزاں، بیاہی عورت، لہو کے چراغ، کفارا ادا ہوا بھنور باندھ لیے، بہت اچھی تھیں۔ میری طرف سے ان سب کو بہت مبارک ہو۔ مسئلہ یہ ہے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ ہائیڈ پارک میں حسن نظامی، شاہانہ خان، سدرہ انور علی ٹاپ پر رہے۔ تیر نیم کش میں اُم مناہل، یاسمین اقبال، عظمیٰ شکور آپ نے دھوم مچادی۔ میری طرف سے سب کو عید کی خوشیاں مبارک۔

☆ اچھے فہد! لگتا ہے تمہارا تبصرہ بھی دھوم...... مچادے گا۔

✉ اڑا صالحوال، ویہال پور سے یاسر وکی لکھتے ہیں سب قارئین کو میری طرف سے دلی عید مبارک امید ہے سب دوستوں کی عید اچھی گزری ہوگی اب آتے ہیں جولائی کے شمارے کی طرف سب سے پہلی اسٹوری جس نے دل کو چھولیا وہ ہے لائف بوائے اسماء اعوان کی واہ کیا کمال اسٹوری چل رہی ہے (ارے...... دماغ تو ٹھیک ہے) گھورا اندھیرا، ہم نے تو وفا کی تھی۔ سب راہیں ایک ہوئیں، تماشا تمام ہوا، بیاہی عورت، خود اپنے ہاتھوں یہ سب اسٹوریاں اچھی تھیں۔ ارم ناز آپ کی تو دو تین اسٹوریاں لگ بھی گئی ہیں پر ہم ابھی ویسے کے ویسے ہیں۔ (محنت کرو بیٹا......)۔ لہو کے چراغ اسٹوری بھی بہت اچھی تھی اور اب آتے ہیں احوال کی طرف کاشی بھائی آپ میرے بڑے بھائی ہیں آپ جو سزا دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ آپ کا حق ہے لیکن میں نے ہر ماہ تبصرے پہ محنت کر کے بھیجتا ہوں۔ (ارے......) تو آپ اُسے کبھی پورا شائع نہیں کرتے کیوں؟ آخر آپ مجھے بچہ سمجھتے ہیں نا تو آپ یہ بات سن لیں بھائی بچہ ضرور ہوں لیکن اتنا بھی بچہ نہیں کہ کسی کی بات کو سمجھ نہ سکوں (اب پتا چل گیا ہمیں......)۔

☆ یاسر وکی! تمہارا تبصرہ بہت مزیدار لگا۔ گڈ! تبصرہ لکھنے میں بہت محنت کرتے ہو پڑھ کر اچھا لگا۔ کوئی اسٹوری آتی ہے تو شائع ہوتی ہے۔ بیٹا اسٹوری بھیجو اور بے جا تنقید سے پرہیز کرو۔

✉ منعم اصغر ڈی جی خان سے احوال میں شامل ہیں لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں ایک تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بے حد خوبصورت تھا۔ منزہ سہام کی باتیں 'جنت' پڑھنے کے بعد احوال میں آئے۔ ماہا آپی کو دیکھ کر بے پناہ خوشی ہوئی۔ خطوط کسی ایک کا کیا کہوں سب ہی شاندار تھے۔ ہر خط سے محبت ٹپکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یعقوب بھائی اللہ آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو صحت عطا فرمائے۔ آمین۔ سدرہ آپی آپ نے یاد رکھا بہت شکریہ۔ عادل بھائی شکریہ کوئی بات نہیں خوش رہیں۔ فرح انیس آپی آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ کہاں تھیں آپ؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف گھورا اندھیرا جیون میرا، ہم نے تو وفا کی تھی، کٹی پتنگ، سایوں پر نقش، میں خوشی ہوں، سب راہیں ایک ہوئیں، اور تماشا تمام ہوا، خود اپنے ہاتھوں، بیاہی عورت، اک ذرا سی بات، عید مبارک، بہت ہی زبردست لاجواب کہانیاں تھیں۔ باقی جن کا نام نہیں لیا ان سے معذرت چاہتا ہوں کہ ابھی اور کہانیاں پڑھی نہیں، پڑھ کر بتاؤں گا۔ زہر عشق اور ہم شکل کی یہ قسط دل میں اتر گئی ویلڈن، بس اب خدا حافظ۔

☆ ارے منعم! ہم تو تمہیں بچہ سمجھتے تھے مگر تم تو استاد نکلے۔ کیسے ہو؟ تبصرہ اچھا لگا۔

✉ عرصے بعد احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت ہی پیاری بہن ثمینہ ناز کی اورنگی، کراچی سے، لکھتی ہیں۔ امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ خوبصورت خطوط سے سجی محفل اپنے

عروج پر تھی۔ 6-5 ماہ غیر حاضر رہی۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے سروائیکل پرابلم ہوگئی تھی۔ دماغ ایک دم ماؤف اور ہاتھ پیر نیلے ہوگئے تھے شدید بیمار ہوگئی تھی۔ ایک مہینے سے مکمل بیڈ ریسٹ پر تھی۔ میڈیسن تو ابھی جاری ہیں چکر بہت آتے ہیں پڑھنا لکھنا سب بند تھا۔ اب اللہ کا کرم ہے کافی بہتر ہوں ورنہ ہمیں تو لگ رہا تھا دنیا سے دانہ پانی اٹھ گیا۔ سرورق ماہ رمضان کی طرح اجلا اور شفاف، دل میں اتر گیا۔

کاشی بھائی احوال کے بعد آپ کی کہانی زہر عشق کا پانچواں حصہ پڑھا بہت شاندار لا جواب۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ایم اے راحت کی ہم شکل بہت سنسنی خیز ہے اور کیوں جو کہانیاں پڑھیں ان میں ساتویں بہن، چھٹی حس، جائے پناہ ہے کہاں، اور کاشف مغل کی، اک پہیلی بہت زبردست تھیں۔ سفرنامہ برطانیہ میں خزاں ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ہائیڈ پارک میں عائشہ نور عاشا کی شفقت بھری نگاہ اور عظمیٰ شکور کا افسانچہ دل کو چھو گیا۔ تیر نیم کش جیسے سلسلہ ہونے چاہیے یہ شمارے کی رونق ہوتے ہیں۔ سدرہ انور علی اور ممتاز بھائی آپ لوگوں نے مجھ ناچیز کو یاد کیا بہت بہت شکریہ۔ زرینہ جونیجو ڈیئر آپ کو بہت بہت سالگرہ مبارک۔ آپ جیو ہزاروں برس ...... ہر برس کے دن ہوں پچاس برس۔

☆ پیاری بہن ثمینہ! سچ پوچھیں تو ہمیں آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی لیکن کیا کریں آپ کا فون نمبر نہیں تھا ورنہ ضرور خیریت دریافت کرتے۔ اپنا خیال رکھیں۔ انشاء اللہ خدا آپ کو صحت یاب کرے آمین۔

✉ چشتیاں سے ہمارے بہت پیارے ساتھی شاعر اور لکھاری علی حسنین تابش لکھتے ہیں۔ ماہ جولائی کا شمارہ جلد ہی موصول ہوگیا۔ رمضان المبارک کا ٹائٹل بے حد خوبصورت تھا بہت پسند آیا۔ اداریہ بھی پسند آیا۔ پھر احوال میں انٹری کی۔ سب نے اچھا لکھا۔ کچھ اپنے جو احوال میں شامل تھے جن سے کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی۔ یہ سب کاشی بھائی آپ کی مہربانیاں ہیں کہ بچھڑوں کو ملا دیا۔ پھر ریحام خان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ واہ بابر بھائی کیا خوب لکھتے ہو۔ سارے پرچے کا سرسری جائزہ لیا تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ اک لمبی چھلانگ لگا کر کاشی بھائی کے ناول کے پاس پہنچے۔ جہاں کاشی صاحب ہیرے اور موتی بکھیر رہے تھے۔ کیا بات ہے بھائی کمال کر دیا۔ ناول لکھنے میں آپ نے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ انسان کو جتنی بھی پریشانی ہو، دکھ ہو، اک بار 'سچی کہانیاں' پڑھنے لگے تو وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ آپ کا پرچہ میرے لیے ایک مسیحا کی حیثیت رکھتا ہے۔ دکھ تو بہت بڑا ہے ناں بھائی؟ لیکن شاید زندگی رنج و دکھ صدمات کو جھیلنے کا نام ہے۔ اب کچھ لکھنے کو قلم ساتھ نہیں دے رہا۔ اللہ حافظ۔

☆ ارے ارے...... تابش! بھیا دُکھی کیوں ہوتے ہو۔ ہم اور ہمارے سارے احوالی تمہارے ساتھ ہیں۔ دنیا کے جس جس کونے میں ہمارا پرچہ پڑھا جاتا ہے وہ سب تمہارے ساتھ ہیں۔ خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔

✉ ایم ارشد وفا گوجرانوالہ سے ایک سال بعد تشریف لائے ہیں، لکھتے ہیں سب سے پہلے میں بہت شکر گزار ہوں۔ والد محترم کے لیے آپ نے اُن کی مغفرت کی دعا کی۔ پرچے کا آغاز احوال سے کیا سب کے تبصرے پسند آئے۔ خدا آپ سب احوالیوں کو عزت ترقی اور بلند مقام دے۔

اسٹوریوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر طارق محمود آکاش کی سب راہیں ایک ہوئیں، میں خوشی ہوں ایم یعقوب، بھاگوں والی، بیاہی عورت، کفارا ہوا آدا، اک ذرا سی بات، عید مبارک، مقتدر بابا، کوئی کب تک سہے، اور آپ کی اسٹوری زہر عشق زبردست رہی۔ مسئلہ یہ ہے ایک زبردست سلسلہ ہے۔

☆ ارشد وفا!، آئندہ تبصرہ لیٹ نہ کرنا ورنہ...... خوش رہو۔

✉ کراچی سے ریحانہ نسیم شامل احوال ہیں لکھتی ہیں۔ آپ نے جون کے شمارے میں میری کہانی قائد میں شرمندہ ہوں شائع کی آپ کا بے حد شکریہ۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری کہانی سب سے پہلے نمبر پر تھی اس عزت افزائی کا شکریہ۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ نئے لکھنے والوں کی اتنی عزت افزائی اور پذیرائی کی گئی۔ یہ سب کرنے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے میں آپ سب کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں اللہ آپ سب کے عزت و وقار میں اضافہ کرے۔ آمین۔

اب جولائی کا شمارہ ملا تو زیادہ حیرانی ہوئی جب اپنی کہانی کی تعریف پڑھی سب پڑھنے والوں اور پسند کرنے والوں کا بے حد شکریہ۔ عظمیٰ شکور نے اسلام آباد سے لکھا ہے کہ ان کو میری کہانی کے کردار مہتاب علی جیسا محب وطن آج کے دور میں کہیں نظر نہیں آتا۔ واقعی آپ نے سچ کہا کہ یہ جو ہمارا ملک پاکستان ہے یہ اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور یہاں کے مسلمانوں کو خود مسلمان ہی بے دریغ قتل کر رہے ہیں تو پھر مہتاب علی کہاں گئے۔ مگر عظمیٰ ان سب باتوں کے باوجود مہتاب علی ہمارے آس پاس موجود ہے کیونکہ مہتاب علی کوئی انسان نہیں بلکہ ایک سوچ ہے۔ جو ہم سب کے اندر موجود ہے۔ کہیں دہشت گردی ہوتی ہے۔ بلاسٹ ہوتا ہے، لوگ مرتے ہی تو ہمیں کیوں افسوس ہوتا ہے۔

کیوں برا لگتا ہے کیونکہ ہم اپنے وطن میں یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ عظمیٰ آپ کے چاروں طرف مہتاب علی موجود ہیں بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ ہماری فوج جو پہاڑوں دہشت گردوں سے جنگ میں مصروف ہے اور روز کتنے فوجی اس ملک کے لیے جام شہادت نوش کر رہے ہیں۔ وہ سب کون ہیں۔ وہ سب محبت کرتے ہیں اپنے وطن سے۔ وہ محب وطن ہیں وہ مہتاب علی ہیں۔ اُمید ہے آپ کو کچھ محب وطن میرے یاد دلانے سے یاد آگئے ہوں گے اور اب آپ کو حیرت نہیں ہو رہی ہوگی۔ کاشی بھائی آپ بتائیں کہ میں نے صحیح کہا ہے یا غلط۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں۔ عظمیٰ اُمید ہے آپ ناراض نہیں ہوں گی آپ سب کو میری طرف سے بہت عید مبارک ہو۔

☆ پیاری ریحانہ! خوش رہیے آپ نے مہتاب علی کو اتنی خوبصورتی سے واضح کر دیا کہ...... باہر سے بھلے ہی ہم نے مکھوٹے چڑھائے ہوئے ہوں لیکن اندر سے 95 فیصد سچے پاکستانی ہیں۔ مہتاب علی ہیں۔

✉ اسلام آباد سے ہمارے احوال کی رونق عظمیٰ شکور اپنے دلکش انداز میں حاضر ہیں لکھتی ہیں۔ کیسے ہیں ہمارے احوالی دوست؟ اُف رمضان کے روزوں کے بعد تو اچھے خاصے اسمارٹ ہوگئے مگر عید کی خوشیوں نے جیسے پھر آپ کو واپس موٹاپے کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اور یہ مسکرا کیوں رہے ہیں؟ اوہ! اچھا عید کی بچی کھچی خوشیاں چہرے پر دمک رہی ہیں، گزشتہ عید سب کو مبارک...... جی جی آگئی آپ سب کی خیر مبارک کی آواز۔ بھئی ہماری عید تو جب ہوتی ہے تاکہ جب ہم سب احوالی یہاں ملتے ہیں۔ شکریہ ادا کریں کاشی صاحب کا کہ ہمیں 'احوال' پوائنٹ دیا ہے تاکہ ایک دوسرے کے حال

سے باخبر ہوتے رہیں۔ سب سے پہلے منزہ سہام صاحب کے پیارے خیالات پڑھے اور آگے بڑھے احوال کی طرف، میری لکھی کہانی کی تعریفیں...... ارے واہ سو تھینکس۔ ریحام بھابی سے ملاقات خوب رہی پُر اثر شخصیت کی مالک ہیں وہ...... بلاشبہ عمران بھائی خوب جچتے ہی ان کے ساتھ۔ گھورا اندھیرا جیون میرا، اعجاز احمد نگرال صاحب کا تحریر کردہ پڑھا واہ کمال ہے۔ ہم نے تو وفا کی تھی نسیم صدرالدین سرائی کی یہ کہانی پُر اثر تھی۔ میں خوش ہوں ایم یعقوب صاحب پوری کہانی پڑھ ڈالی خوشی کا نام ونشان نہیں تھا اس اسٹوری میں، معذرت کے ساتھ۔ بیاہی عورت ارم ناز صاحبہ اسٹوری لکھ کر نمبر لے گئیں ۔ انتہائی سادہ کہانی سادہ خیالات اس لڑکی کے اور پھر وہی فرسودہ سا شوہر اور وہی داستان بہر حال ارم ناز اسٹوری اچھی لگی مجھے معصوم سی لڑکی کی۔ 'یہی صلہ ہے یہاں' ٹھیک ہی تو کہا 'سیما گل' آپ نے وفاؤں کا صلہ بھی ملا ہے یہاں۔ اُف ایڈیٹر صاحب گھور کیوں رہے ہیں خود ہی تو کہہ رہے تھے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ کیا ہوا اگر زیادہ صفحات ہوگئے ہے۔ نا قینچی آپ کے پاس، کاٹ پیٹ ڈالیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ جی چلتے ہیں اب چھٹی حس کی طرف، شیخ صاحب جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ اولڈ ہاؤس مرزا مبشر بیگ نے معاشرے ایک کڑوے سچ کی طرف نشاندہی کی ہے۔ اُف دل اندر تک لرزتا ہے ایسے واقعات پڑھ کر۔ اچھا نا ایڈیٹر صاحب ہو گیا نا پورا تبصرہ میں چند لائنیں اور سلام و دعا تو کہہ لوں سب کو...... ہائیڈ پارک میں تو عائشہ نور کا کلام پسند آیا۔ یاسمین اقبال کا شعر اچھا لگا۔ ادھر دیکھیں ایڈیٹر صاحب بس مجھے نہیں پتا۔ ایک ایسی کہانی لکھیں جس میں خوشی ہو ایسی خوشی جو رگ و پے میں چھا کر آنکھوں سے دکھے۔

☆ اچھی عظمیٰ! آپ ہیں ناں ہمارے پاس ہماری خوشی۔ آپ کے آنے سے احوال گل و گلزار ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کو بہت خوشیاں دے۔ تبصرہ شاندار رہا۔

پیارے ساتھیو! اس ماہ کا ہمارا احوال اپنے اختتام کو پہنچا انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ ایک تازہ ترین نظم آپ کی نذر۔

سندیسہ

میں اپنی آواز
اپنوں تک پہنچانا چاہتا ہوں
مگر...... کیا سانحہ ہے
آواز تو اُن تک پہنچ ہی نہیں پاتی
پیچھے شام کھڑی ہے
اِس شام کے مدھ بھرے اندھیرے میں
کوئی میری آواز سے بن کر
چنے چنے کبوتروں کے پروں پر نئے نئے لفظ باندھ کر
خواب دہلیز پر رکھ جاتا ہے
اور...... اِس نئی صبح کا دودھیا سویرا
اِک نئی کہانی میں ڈھل جاتا ہے
مری آواز، میرے اپنوں تک پہنچ جاتی ہے

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

Life Buoy.. بچھڑوں سے ملائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

کتنی ہی دیر سے وہ لان میں ٹہل رہی تھی۔ گھڑی دیکھنے کی فرصت ہی کسے تھی اور وقت...... وقت سے کیا لینا دینا تھا اُسے۔

وہ تو بس معمول کی طرح مغرب کے بعد بائیں ہاتھ پہ بنے اس کچے قطعے میں آ جایا کرتی تھی۔

بوا جی نے رحیم سے کہہ کر گھر کے اس حصے میں سبزیاں لگوالی تھیں۔

زمین زرخیز تھی، دیکھتے ہی دیکھتے دنوں میں سرسبز ہوگئی۔ گھاس نے اس حصے کی ہریالی ہی نہیں رونق بھی بڑھادی تھی۔

ادھر آتے ہی ایک خوشگوار مسرت کا احساس ہوتا اور ذہن و دل تراوٹ سے سرشار ہو جاتے۔ اس کا معمول تھا صبح صادق فجر کی نماز کے بعد وہ گھر سے باہر بنے اس چھوٹے سے لان میں چہل قدمی کر کے ذہن ودل کو ریفریش کرتی اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنی پینٹنگ کا سامان مع کینوس اسٹینڈ باری باری رکھتی اور اپنے کام میں مگن ہو جاتی۔

دو گھنٹے وہ یہیں کام کرتی اور پھر سامان اندر رکھ کر اپنی شیٹس اور رنگوں کے ساز و سامان اٹھائے 40 چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود اپنی آرٹ اکیڈمی میں آ جاتی، وہاں سے واپسی اس کی شام تک ہوتی۔ واپس آ کر وہ بنا کچھ کھائے اپنے بیڈ پر گر جاتی اور تھکن اُسے تھپکیاں دے دے کر سلا دیتی۔

وہ ظہر اور عصر کی نماز اکیڈمی میں ادا کر کے آتی تھی۔ اٹھ کر پہلے وضو بناتی اور پھر مغرب کی نماز کے بعد جعفری بوا اُسے فوراً چائے دیتیں اور اسنیکس، نگٹس اور سادہ سلائس ہمیشہ کی طرح اس کے پاس ہوتے۔

وہ چائے کہ ساتھ یہ چیزیں بھی تناول کرتی جاتی اور اس کا پیٹ بھر جاتا۔

چائے سے فارغ ہو کر پھر وہ گھر کے بائیں

جسے پری اس جنت میں آ کر چہل قدمی شروع کر دیتی۔

ایسے میں اُسے علی حمزہ کی یاد شدت سے ستاتی۔

''تمہیں پتا ہے امی مجھے جب تک اپنے ہاتھ سے کھانا نہ کھلائیں میرا پیٹ نہیں بھرتا۔'' وہ بڑے فخر سے اُسے بتاتا۔

''شرم کرو! اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔'' وہ اُسے چڑاتی۔

ارے یار تم بھی نا! تم نہیں جانتیں کہ یہ مائیں کیا ہوتی ہیں......''

اور پھر فوراً اُسے اپنی بات کا احساس ہوتا۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ بھول جایا کرتا تھا، جس سے بات کر رہا ہے اس کے لیے یہ لفظ ''ماں'' دل میں انی بن کر چبھ جاتا ہے۔

''جب تم آؤ گی نا میری زندگی میں...... پھر کھلانے والے ہاتھ تبدیل ہو جائیں گے۔''

وہ اس کی نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولتا۔

''بالکل نہیں...... میں کیوں کھلاؤں گی آپ کو۔ اپنے ہاتھوں کو استعمال کرنا سیکھو...... بڑے آئے......''

وہ بڑبڑاتے ہوئے اُسے چڑاتی۔

''اے...... ادھر دیکھو...... تمہارے ہاتھ کس کے ہیں۔ میرے ہیں نا۔'' وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا۔

''تو۔'' وہ شرگیں مسکراہٹ چہرے پر سجائے کہتی۔

''تو انہیں میرے لیے ہی رہنے دو۔''

وہ اس کے ہاتھ چومتے کہتا۔ وہ الرٹ ہو جاتی۔

''ہم مم...... میاں مجنوں۔''

''وہ تو ہم ہیں۔''

''پلیز...... یہ میرے ہاتھ ہیں۔ یہ ہاتھ اس کینوس کی امانت ہیں اور بہت جلد میں یہ امانت آرٹ گیلری کی زینت بناؤں گی۔ سمجھ گئے آپ۔''

وہ اپنے برش اٹھائے اُسے یکسر اگنور کر کے پھر سے کینوس کی ویران دنیا کو رنگوں سے آباد کرنے لگتی۔

☆......☆......☆

''لو بتاؤ۔ مجھے چلی ہے سکھانے۔ کل کی لونڈیا اور جنے کیا بن جائے ہے۔ اری کمبخت چل اٹھ۔ جا کر نہا دھو لے۔ تیار شیار ہو جا۔ وہ باپ آنے والا ہے لینے تجھے۔''

اصغری خاتون نے اُسے دھنک ڈالا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے ان کے دیسی جڑی بوٹیوں والے شیمپو سے سر دھونے سے انکار کر دیا تھا۔

اس شیمپو سے اٹھتی باس سے اس کی ناک جل گئی تھی۔ اس کی نانی نے اُسے اپنی محنت کو سیکنڈوں میں غارت کرتے دیکھ کر دو ہتھڑ مار کر جیسے کمر ہی توڑ دی تھی۔

وہ اپنی آج کی پاکٹ منی مانگ رہی تھی۔

اُسے صرف لائف بوائے شیمپو خریدنا تھا۔

اس کی ماں اسے بچپن سے لائف بوائے شیمپو استعمال کراتی آئی تھیں۔

اس کی وجہ سے اُس کے بال بہت لمبے اور چمکدار ہو گئے تھے۔

ساتھ ساتھ لانبے بھی تھے۔ مگر پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ اس کی ماں کھو گئی تھی......

نانی کے پاس اُسے چھ ماہ ہو گئے تھے۔

اس کے ننھیال کا متوسط طبقے سے تعلق تھا۔

قسمت نے امینہ بیگم کو بشیر احمد کے گھر پہنچا دیا تھا۔ بشیر احمد ایک خوشحال خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

شادی سے پہلے امینہ بیگم کے بال جھڑتے تھے اور دو موہے بھی تھے۔

انہوں نے جب سے لائف بوائے شیمپو استعمال کرنا شروع کیا تھا، ان کے بالوں کی ساری پرابلمز حل ہو گئی تھیں۔

وہ بالوں کے مسائل کے حل کے لیے ہر ایک کو لائف بوائے شیمپو ہی کے استعمال کا مشورہ دیتی تھیں۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ یہ سب اس لیے کرتی ہیں کیوں کہ ان کی جاب اس ادارے میں ہے اور وہ اس کمپنی کی پبلسٹی کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں لیکن امینہ بیگم کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔''

اور واقعی لوگ لائف بوائے شیمپو استعمال کر کے اپنی ہاتھوں خود ہی پشیمان ہو جاتے۔

شادی کے پہلے ہی سال انہوں نے نوکری کو خیر آباد کہہ دیا۔

بشیر احمد کو قطعاً پسند نہیں تھا کہ امینہ، اُن کی شریک سفر کمانے کے لیے باہر جائیں۔

سو امینہ بیگم نے نوکری کو خیر آباد کہہ دیا لیکن جہاں کسی کو بالوں کے مسائل کا سامنا ہوتا وہ جھٹ سے اُسے لائف بوائے شیمپو کے استعمال کا مشورہ دیتی تھیں۔

لوگ انہیں امینہ بیگم کے بجائے لائف بوائے بے بی کے نام سے پکارتے تھے اور وہ مسکرا کر رہ جاتیں۔

☆......☆......☆

وہ نہا دھو کر تیار بیٹھی تھی۔ لائف بوائے سے بال دھو کر اس کے بال نرم، ملائم اور چمکدار ہو گئے تھے۔ وہ ماتھے پر آنے والی لٹ کو پھونک مار مار کر اڑاتی۔ بشیر احمد کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا تھا۔

ہارن کی آواز سن کر اصغری بیگم کی تیوری پر بل از خود ہی پڑ گئے تھے۔

باپ کی آمد نے یشفین میں برق سی بھر دی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی تھی۔ بشیر احمد نے گھر کے اندر قدم رکھ دیے۔

یشفین کو گود میں اٹھا کر اندر آ گئے۔ فضل ان کا ڈرائیور پیچھے پیچھے پھلوں کے شاپرز اصغری بیگم کے پاس رکھ چکا تھا۔ اصغری بیگم کی تیوری کے بل اب بھی جوں کے توں تھے۔

''کچھ پتا چلا۔'' بشیر احمد نے دھیمے سے استفسار کیا۔

''واہ بھئی واہ۔'' لونڈیا میری غائب کرا دی اور پوچھتے ہیں، پتا چلا...... اے لو...... میں تو میاں پرچہ کٹوا دوں گی۔ چھ مہینے تم جنے کون سے سمندروں کی سیر کر آئے۔

ادھر کلیجے پر مونگ دلنے کو اپنی لونڈیا چھوڑ گئے۔ غضب خدا کا۔ اچھا اندھیر ہے۔

مُو موت دھلانے کو ہی تو یہ چونڈا سفید کیا ہے میں نے۔ تم سمجھتے ہو گے بڑھیا چھ ماہ بعد سب کچھ بھول جائے گی۔ شرافت سے میری لونڈیا کو میرے حوالے کر دو بس......

یا الٰہی! میری امینہ کے دشمنوں کو خاک کر دے۔ الٰہی برباد کر دے۔''

سکون غارت کر دے۔ اصغری بیگم واہی

تباہی بکے جا رہی تھیں۔

بشیر احمد کو لگا کہ وہ کچھ دیر یہاں اور عزت افزائی کراتے رہے تو دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ وہ بیٹی کو گود میں لے کر اصغری بیگم کی دہلیز پار کر گئے، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

☆......☆......☆

پاپا۔ کیوں پریشان ہیں۔'' رات کو جب بشیر احمد یشفین کو دودھ کا گلاس پلا کر جانے لگے تو وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔

'' نو ...... مائی سویٹ ہارٹ! کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرے۔

'' پاپا! ماما!'' وہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولی تھی۔

'' بیٹا! آج پرامس کرو تم ماما کا ذکر نہیں کرو گی۔'' وہ کرب سے بولے۔

'' تمہاری ماما تم کو اور مجھ کو چھوڑ کر بہت دور چلی گئی ہیں۔ میں نے ہر جگہ ان کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نہیں ملیں۔''

اس سے زیادہ ضبط کا یاران میں نہ تھا۔ وہ اکیلے آدی تھے۔

آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اچانک بزنس ٹور پر جانا پڑا تو یشفین کو دل پہ پتھر رکھ کر وہ اس کو نانی اماں کے گھر چھوڑ گئے۔

'اینہ تم کہاں چلی گئیں۔'

یہ سوال ان کے ذہن میں گونجتا تھا لیکن پھر اس بازگشت کے نتیجے میں وہ ذہنی مریض بنتے چلے جا رہے تھے۔

کاروبار میں مسلسل ان کی عدم دلچسپی کی بنا نقصان ہونے لگا اور نوبت یہ آگئی کہ وہ دیوانے اور کاروبار دیوالیہ ہوگیا۔

وہ اینہ کو یاد کرنے اور اس وقت کو قید میں رکھنے کی ضد میں نفسیاتی اسپتال پہنچا دیے گئے تھے۔

یشفین کو جعفری بوا کے ساتھ بنگلہ چھوڑ کر ایک مضافاتی بستی کی مکین بننا پڑ گیا تھا۔

یہ بھی مالک کا کرم تھا کہ اتنا کچھ جانے کے بعد بھی یشفین کے پاس اتنا کچھ تھا کہ وہ اپنی زندگی سہولت سے گزار سکے۔

یشفین نے دل لگا کر پڑھائی کی۔ فائن آرٹس کی طرف رجحان کے باعث اس نے اسی فیلڈ میں کیریئر بنانے کا سوچا تھا۔

شاید وہ اپنی بے رنگ زندگی کو کینوس پر رنگ بکھیر کر رنگین کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

'' جعفری بوا! میں ذرا گروسری کے لیے جا رہی ہوں۔ یشفین اسکول سے آنے والی ہے۔ آپ ذرا اُسے کھانا کھلا دینا۔ صبح ناشتا بھی بس تھوڑا سا کر کے گئی ہے۔ میں جلد واپس آجاؤں گی۔''

اینہ شال کو ہاتھ سے سیدھا کرتی باہر گاڑی کی جانب چل دیں۔

'' بی بی...... ایک منٹ!''

جعفری بوا کچن کی طرف جاتے ہوئے انہیں دروازے پر ہی روک گئی تھیں۔

'' جعفری بوا! جلدی۔ آئی ایم سو لیٹ۔''

اینہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولیں۔

'' افوہ......'' اتنے میں ان کا موبائل بجنے لگا۔ وہ بیگ سے موبائل نکال کر بات کرنے لگیں۔

جعفری بوا کچن سے سرسوں کے تیل میں سفید سوتی کپڑے بھگو کر لے آئی تھیں۔ اینہ نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

'' ارے بوا نہیں لگتی مجھے نظر۔''

وہ مسکرائیں اور موبائل وہیں ٹیبل پر دھر دیا۔

'' لو بتاؤ بیٹا اللہ تیرے بھاگ بھرے۔ ترقی دے۔ خوشحالی دے۔ نظر کیوں نہیں لگتی۔ ماشاء اللہ آپ کی اور بشیر بیٹے کی چاند سورج کی جوڑی ہے میری بچی!''

بوا نے سات بار کپڑے اس پر سے وارے اور اُن پر آیات پڑھیں۔

اس کو دیر ہو رہی تھی۔ شادی کو چھ برس ہو گئے تھے۔

گود میں صرف ایک پھول کھلا تھا ''یشفین'' اور وہ بھی نازک اندام ماں کی طرح نازک سی گلاب جیسی گلابی گڑیا ہی تو تھی۔

'' بیٹا آج یشفین کو لے کر کیوں نہیں جا رہی ہو۔ ہمیشہ تو ساتھ لے کر جاتی ہو۔ ذرا کی ذرا انتظار کر لیتیں۔

بچی آجاتی تو چلی جائیں۔'' بوا آیتیں پڑھ کر پھونکیں مارنے لگیں۔

'' ارے بوا! آج آپ کو پتا ہے یشفین پورے پانچ سال کی ہو جائے گی۔

اس کی سالگرہ ہے اور میں تو اس کے لیے گفٹ بھی لوں گی۔ اُسے ساتھ لے کر گئی تو کیا مزہ آئے گا۔''

اینہ نے اصل صورتحال سے تو آگاہ کیا۔

بوا نے کمر تک لہراتے اس کے سیاہ ریشمی جھولتے بالوں پر آخری پھونک ماری اور کچن کی جانب چل دیں اور برنر پر تیل کے کپڑے رکھ دیے۔

'' بتاؤ بھلا! ارے بڑی تیز نظر لگی ہوئی ہے۔ شعلے آسمان کی طرف رُخ کیے بالکل سیدھے تھے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر آئیں۔

'' لو جی۔ بٹیا چلی بھی گئیں۔ اوئی میا! موبائل تو بٹیا ادھر ہی بھول گئیں۔''

بوا موبائل اٹھا کر ان کے بیڈروم میں رکھنے چل دیں۔ یشفین اسکول سے آگئی۔

ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے، سات گھنٹے بیت گئے۔

کس سے پتا کرتیں۔ بالآخر جب مغرب کی اذانیں ہوگئیں تو ہول کر انہوں نے بشیر احمد کو فون ملایا اور ساری کتھا کہہ سنائی۔

بشیر احمد کی تلاش کا سفر اس دن سے جو شروع ہوا تو کاروبار کی تباہی پر اختتام پذیر ہوا لیکن اینہ بیگم کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

انہیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ معمہ حل نہ ہو سکا۔

☆......☆......☆

وہ ایک ٹک بس گلاس وال سے باہر دیکھے چلی جا رہی تھی۔ کتنے گھنٹے سے وہ وہاں کھڑی تھی۔

اُسے خود بھی معلوم نہ تھا مگر باہر سفید برف کی چادر میں کچھ ایسا تھا جسے وہ کھوجنا چاہ رہی تھیں۔

'' ایکسیوزمی میڈم! پلیز You Can Sit۔'' اس نے تھک ہار کر اُسے مخاطب کیا وہ یکدم چونک کر مڑی۔

'' سوری!'' وہ واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

''You are not a robot'' وہ مسکرا کر بولا۔

وہ بس اسے دیکھتی ہی رہی۔ کچھ نہ بول پائی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اُسے یہاں وہ جانتی ہی نہ تھی۔

کبھی کبھی بے خبری بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی

پینٹنگ کی طرف بڑھا جو تیزی کے ساتھ مکمل پذیر ہو رہی تھی۔

وہ کینوس پر ابھری اس تصویر کو دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ آخر یہ سب پینٹ کر کے وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش رہا۔

☆......☆......☆

ایگزیبیشن کا افتتاح ہو گیا تھا۔ ملک اور بیرون ملک کے ماہر پینٹرز کے شاہکار فن پارے لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے مگر ایک پینٹنگ نے سب کو دم بخود کر کے رکھ دیا تھا۔

سب کی نظریں اس پینٹنگ کی تخلیق کار سے سوال کرنا چاہ رہی تھیں۔

پینٹنگ میں لائف بوائے شیمپو کی بوتل بنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی بال لہراتی ایک گریس فل خاتون تھیں۔ پینٹنگ پر یہ لکھا تھا ''لائف بوائے بے بی۔''

غیر ارادی طور پر جب ڈیوڈ اسمتھ کی نظر اس پینٹنگ پر پڑی تو پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا۔ اس کی 'لائف بوائے بے بی' ناسازی طبع کے باعث ہوٹل میں تھی۔

وہ اس بھیڑ سے نکل کر فوراً ہوٹل گیا۔ اور اُن کو ایگزیبیشن ہال میں لے آیا۔ پینٹنگ میں موجود لائف بوائے بے بی اور اس میں رتی بھر فرق نہ تھا ہو بہو وہی شکل۔

لگتا تھا تصویر والی گریس فل شخصیت تصویر سے نکل کر باہر آ کھڑی ہوئی ہو۔ پینٹنگ دیکھ کر امینہ تصویر میں کھو گئی۔

ایگزیبیشن کے پہلے دن کا اختتام ہوا تو مائک پر اعلان ہوا کہ 'یشفین بشیر' فوری طور پر ایگزیبیشن انتظامیہ سے ملیں۔

علی حمزہ کے ساتھ چلتی یشفین راؤ احمد علی کے کمرے میں موجود تھی۔ کمرے میں ٹیبل کی جانب پہلے سے دو غیر ملکی ان سے ڈسکشن میں مصروف تھے۔ یشفین کو دیکھ کر انہوں نے اپنی جانب اشارہ کر کے بلایا۔ یشفین خاتون کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ گئی۔ خاتون نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا تو یشفین کی چیخ نکل گئی۔

''ماما!'' وہ ان کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔ علی حمزہ بھی اس معجزے پر حیران تھا۔

امینہ بیگم کے ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔ آدھی یاداشت تو ان کی، تصویر میں موجود بشیر احمد اور یشفین کے نام سے آ گئی تھی، باقی رہی سہی یاداشت پر جمی برف کو یشفین کی محبت کی گرمی نے پگھلا دیا تھا۔

''یشفین! میری گڑیا۔ میری ننھی پری۔ میں تو تیری برتھ ڈے کا گفٹ لینے گئی تھی۔ میری گڑیا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ گفٹ مجھے تجھ سے جدائی کا تحفہ دے دے گا۔ معاف کر دے مجھے میری بچی...... میں ...... میں کچھ بھی نہ کر سکی تیرے لیے۔ تُو اتنی بڑی ہو گئی ہے......اور......اور......'' آگے امینہ کا گلا رندھ گیا اور آواز حلق میں پھنس گئی۔

ڈیوڈ اسمتھ، راؤ احمد علی، حمزہ بھی اس جذاتی صورت حال سے اپنے آنسوؤں کو آنکھوں میں قید نہ رکھ سکے تھے۔

☆......☆......☆

دوسرے دن اخبار میں یہی کہانی واضح طور پر شائع ہوئی تھی۔

''لائف بوائے شیمپو نے لائف بوائے بے بی کو بارہ سال بعد ملا دیا تھا۔ لائف بوائے شیمپو نہ صرف بالوں سے پیار جگائے بلکہ بچھڑے کو بھی ملائے۔''

☆☆......☆☆







جہاں حیرت واسرار میں لپٹی پراسرار کہانیاں
جو آپ کو ان دیکھی دنیا میں لے جائیں گی

بہلا



اعجاز احمد فکرال

عرب کی سرزمین کے اس گوشے کی اسرار بھری داستان، جہاں آج بھی بد ارواح کا حصار قائم ہے

زیادہ پرانی بات نہیں مگر جب بھی یاد آتی ہے، خوف سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں اور میں شدید بخار میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔



میں سلالہ سے پانچ سو سونے کی اینٹیں گاڑی میں لوڈ کر کے تبریز سے ہوتا ہوا مسقط جا رہا تھا۔ بڑا طویل راستہ تھا۔ راستے میں نجوہ کی چیک پوسٹ پڑتی تھی۔ پولیس ملازمین نے دوسری گاڑیوں کی طرح مجھے بھی گاڑی لین میں لگانے کا اشارہ کیا۔ چیک پوسٹ پر گرمی بہت زیادہ تھی کہ دل کو ایک وحشت سی ہونے لگی۔ مجھے ویسے بھی گرمی زیادہ لگ رہی تھی کیونکہ میں ایئر کنڈیشنڈ گاڑی سے نیچے اترا تھا۔ مجھے اس چیک پوسٹ پر پولیس سے حسب معمول کوئی خوف یا خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جب میری گاڑی چیک کرانے کی باری آئی تو میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ پولیس ملازمین کو چیک کروانے کے لیے کھول دیا۔ ہر جگہ سونے کی اینٹیں چمک رہی تھیں۔ سونے کی چمک سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ ایک پولیس ملازم نے ٹارچ سے ڈکی چیک کی۔ اس نے ان سونے کی اینٹوں کی طرف بری نظر سے دیکھا بھی نہ۔ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے گولڈ کی رسید طلب کی جو کہ میں نے پیش کر دی۔ اس نے رسید پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد سونے کے بیوپاری اور میرے مالک کو فون کر کے کچھ ضروری معلومات حاصل کیں اور مجھے کلیئر کر کے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کارروائی کے دوران میرا رات کا کھانا لیٹ ہو گیا۔ ویسے بھی اکیلے میرے گلے سے کھانا نیچے نہیں اترتا، ہاں اگر کوئی ساتھ بیٹھا ہو تو ایک کی جگہ دو روٹیاں بھی کھا لیتا ہوں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ میں طویل صحرائی راستوں پر سفر کے دوران راستے میں ایک یا چند افراد کو بیٹھے دیکھ کر گاڑی روک لیتا ہوں تاکہ ان کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ بھی لگ جائے اور ساتھ کھانا بھی کھا لیا جائے۔ اس طرح تھوڑی بہت تھکاوٹ بھی دور ہو جاتی ہے اور نماز بھی پڑھ لیتا ہوں۔

رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ بھوک مجھے بہت زیادہ ستا رہی تھی۔ سارا دن آفتابی کرنیں دوران سفر میری آنکھوں کو چندھیاتی رہی تھیں۔ میں نے سوچا کچھ دیر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھنا چاہیے۔ لہٰذا، میں راستے میں کوئی ایسا ٹھکانہ تلاش کر رہا تھا۔ جہاں چند لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکوں۔ دن بھر صحرا کی لُو سے گاڑی بہت گرم ہو چکی تھی۔ چیک پوسٹ سے چلتے ہوئے ساٹھ ستر کلومیٹر دور سڑک کے دائیں طرف تقریباً ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر مجھے کچھ لائٹیں جلتی ہوئی نظر آئیں۔ ان روشنیوں کے پاس ہی دو تین جگہوں پر آگ کے الاؤ بھی روشن تھے۔ میں نے سوچا یہاں مقامی لوگ کوئی جشن یا پک نک منا رہے ہیں یا ہو سکتا ہے ان کے ہاں کسی بچے کی کوئی ولادت ہوئی ہو یا کوئی شادی یا کوئی رسم عقیقہ ہو۔ ان کے پاس چلنا چاہیے، کیونکہ عربی لوگ اپنی خوشیوں میں دوسروں کے شامل ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

میں نے گاڑی آہستہ کر کے سڑک کنارے پارک کر دی اور نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ صحرائی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میرے جسم سے ٹکرائے۔ میں نے سرمئی رنگت میں گھرے آسمان پر ہلکے ہلکے جگمگاتے ستارے دیکھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ تازہ ہوا کے جھونکے میرے جسم کے اندر داخل ہوئے، جن میں ہوا کا پیار چھپا ہوا تھا۔ میں نے جسم کو کھلتا ہوا محسوس کیا۔ رات کے وقت نرم نرم ریت کتنی حسین تھی۔ کومل کومل ریت کا پیار میرے پاؤں سے چھوتے ہوئے آہستہ آہستہ میرے پورے جسم میں سرایت کرنے لگا۔ جس سے مجھے اپنے جسم میں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ پھر میں ان روشنیوں کی جانب چل پڑا۔ قریب پہنچا تو کھجور کے درختوں کے نیچے نخل میں چند لوگ دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے اور بھی بہت سے لوگ بیٹھے اور کھڑے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر دائرے والے لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے اور مجھ سے باری باری مصافحہ کرنے لگے۔ ان سے سلام دُعا کرتے ہوئے میری عجیب سی حالت ہو گئی۔ جو لوگ پیچھے بیٹھے تھے ایک ٹیلے کے نیچے عجیب انداز سے آگ جلانے کی کوشش کر رہے تھے، ایسے جیسے کوئی خصوصی منتر پھونک رہے ہوں۔ ان ہی کے پاس ایک شخص مجسمے کی طرح ایستادہ بیٹھا تھا۔ دوسرے کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ دائرے والے لوگوں میں سے ایک میرے گلے لگ کر کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا ہوا ہے۔'' میں نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

''تم نے خوشبو تو نہیں لگائی۔'' اس نے بھی مدھم آواز میں پوچھا۔

''نہیں، نہیں!'' میں نے کہا، میرا جواب سن کر وہ دوبارہ دری پر بیٹھ گیا۔

ان کی صورتوں پر خوبصورتی برائے نام بھی نہ تھی۔ کوئی واجبی سا چہرہ بھی نہیں تھا۔ اجڑے ہوئے سر، بڑی نامراد اور بدحال شکلیں تھیں۔ جیسے انتہائی غربت کی حالت میں خوراک کی کمی سے، زیادہ بیمار رہنے سے منہ بگڑ جاتے ہیں اور جسم بے انتہا لاغر ہو جاتے ہیں۔ کچھ چہرے ایسے تھے جیسے ظلم روکنے کی فریادیں کر رہے ہوں یا اپنی بدقسمتی کا اعلان کر رہے ہوں۔ ان کی گردنیں خم تھیں۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے راولپنڈی گلاس فیکٹری کے پاس کوڑھیوں کا ہسپتال یاد آ گیا۔ جہاں کوڑھی لوگ انتہائی کسمپرسی کی حالت میں بیٹھے تندرست لوگوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ میرے دماغ میں ان لوگوں کے بارے میں عجیب و غریب سوالات ابھرنے لگے۔ میں سمجھا شاید یہ کسی کوڑھی مرض یا کسی انجانی بیماری وغیرہ میں مبتلا ہیں۔ جس نے ان کی یہ حالت کر دی ہے اور علاقہ بدر کر دیے گئے ہیں یا یہ کسی صحرائی علاقے یا دیہات کے بدو ہیں۔ ہو سکتا ہے لوہے کی بھٹیوں میں کام کرتے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے انھوں نے کبھی شہروں کا رُخ نہ کیا ہو اور دنیا سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ نیا نہ جان سکے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے انتہائی سادہ دل اور دنیا دار لوگ نہ ہوں۔ کوئی چہرہ بھی اجلا نہیں تھا۔ سب کے سب بدنما تھے یا کوئی ایسا کام کرتے ہوں جس نے ان کی شکلیں بگاڑ دی ہوں اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر صحرائی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ ان کی بگڑی ہوئی اور بے رنگ شکلیں دیکھ کر میرے دماغ کی نسیں کھنچ گئیں۔ اس موقع پر اچانک مجھے صادقین کی پینٹنگز بھی یاد آ گئیں۔ جن میں ٹیڑھے میڑھے لوگ کانٹوں میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے ہونٹوں پر ایک

شیشے کا زندہ سانپ

جنوبی امریکہ میں ایک ایسی قسم کا سانپ بھی پایا جاتا ہے جسے اگر کوئی شخص پکڑنے کی کوشش کرے تو وہ اپنے جسم کو اکڑا لیتا ہے۔ اور اگر کوئی اکڑی ہوئی حالت سے اسے چھولے تو وہ شیشے کی طرح ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ اسے ''شیشے کا سانپ'' کہتے ہیں۔

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی

ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، جس کو میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی۔ میرا رنگ گلابی ہے۔ اس وقت میری حیثیت ان کے درمیان دنیا کے خوبصورت ترین شخص کی سی تھی۔ چند لوگ حسرت و ملال سے مجھے اپنی طرف ایسے دیکھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جیسے وہ دنیا کی کسی انوکھی خوبصورت شخصیت کو دیکھ رہے ہوں کہ کاش وہ بھی میرے جیسے ہوتے۔ تھوڑی دیر کے لیے میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مبادا کہیں میرا چہرہ نوچ ہی نہ لیں۔ میں نے ہمدردانہ طور پر اس خیال کو نظر انداز کر دیا کہ اگر میں ان جیسا ہوتا تو کیا کر لیتا۔ آخر انھیں بھی تو اسی نے بنایا ہے جس نے مجھے بنایا ہے۔ میرے قریب کھڑے ایک شخص نے پوچھا، ''صدیق (دوست) کیا سوچ رہے ہو۔''

میں نے اضطرابی کیفیت میں پوچھا، ''آپ کون لوگ ہیں جو دنیا سے کنارہ کشی کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔''

اس نے مسکرا کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا مگر میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا بے رس قہقہہ سن کر مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اس کا ہاتھ رعشہ کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس تمام ماحول کے اردگرد بے بسی کا عنصر نمایاں تھا۔ پھر اس شخص نے بڑی چاہت سے دری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو، بیٹھو صدیق (دوست) کیسے آئے ہو۔''

میں اس کی دعوت پر ان کے درمیان شانت ہو کر

بیٹھ گیا اور جواب دیا، ''گزر رہا تھا، پردیسی ہوں، مسقط بیار ہا تھا، ادھر روشنیاں دیکھ کر رک گیا ہوں۔ سوچا آپ کوئی جشن منا رہے ہیں، آپ کے ساتھ کھانا کھالوں، اسی بہانے تھوڑا سا آرام بھی کر لوں گا۔'' میں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں، ضرور کھانا کھاؤ اور آرام بھی کرو۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے، تم کیا کھاؤ گے۔'' اس نے بڑے پریم سے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''جو مل جائے وہی کھالوں گا، میرے پاس اپنا کھانا بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اپنے کھانے کو رہنے دو، آج ہمارا کھانا کھاؤ، ہم نے بڑا لذیذ کھانا تیار کیا ہے۔'' اتنا کہہ کر اس شخص نے پاس بیٹھے دوسرے شخص کو اشارے سے کہا، ''اس کے لیے کھانا لاؤ۔''

''اچھا۔'' ایک اور بے وقار چہرے والے شخص نے بڑی دلخراش آواز میں جواب دیا جس سے مجھے اپنے جسم میں چوب سی لگتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں اس شخص کو دیکھنے لگا جو کھانا لینے گیا تھا۔ اس نے میرے سامنے چند برتنوں سے ڈھکنے اٹھا کر کھانا ایک بڑی پلیٹ میں ڈالا اور پلیٹ کو لا کر میرے حوالے کر کے کہا، ''اور بھی لے لینا۔''

میں نے پلیٹ پکڑ کر کہا، ''اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کھانا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کھالوں۔ کیونکہ گاڑی میں ایئر کنڈیشنڈ لگا ہوا ہے۔ اس میں کولڈ ڈرنک اور کچھ اور کھانے کا سامان بھی موجود ہے۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں، جیسا تم مناسب سمجھو۔'' اس نے جواب دیا۔

میں پلیٹ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور گاڑی کی جانب بڑھنے لگا کہ اس شخص نے آواز دے کر کہا، ''ذرا ٹھہرو۔''

میں رک گیا تو اس شخص نے کھانا دینے والے شخص سے کہا، ''اس کو کھانا ڈھانپ کر دو، ریت اڑ رہی ہے، کھانا خراب ہو جائے گا۔''

کھانا دینے والے شخص نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایک دوسری پلیٹ قریب سے اٹھا کر میرے حوالے کی۔ میں نے کھانا ڈھانپ لیا اور دل ہی دل میں ان کی مہمان نوازی پر بہت خوش ہوا کہ دیکھو چہرے بیشک بگڑے ہوئے ہیں مگر دل کے کتنے اچھے اور با اخلاق ہیں۔ میرے پاس آنے پر احترام سے کھڑے بھی ہوئے ہیں، سلام و دُعا بھی کی ہے اور مجھے کھانا دے کر میری خدمت بھی کی ہے۔ خدا تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، ان کی مشکلیں دور کرے اور ان کے چہرے نور سے بھر دے۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر کھانا پچھلی سیٹ پر رکھا۔ برف کی پیٹی سے کولڈ ڈرنک جوس وغیرہ نکال کر کھانے کے پاس رکھا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے ایئر کنڈیشنڈ کو آن کیا اور آرام سے کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ جونہی میں نے کھانے کی ٹرے سے اوپر والی ٹرے اٹھائی، انجانی اور عجیب سی بدبُو کے بھبکے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سونگھے تھے، میرے ناک کے نتھنوں سے ٹکرائے، کھانے کی طرف دیکھا تو پلیٹ میں کھانے کی جگہ غلاظت پڑی تھی۔ غلاظت دیکھ کر اور بدبو سونگھ کر میرے گلے سے ایک کراہیت بھری آواز نکلی۔ جس سے میرے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی اور بھوک اڑ گئی۔ ایسا کھانا زبردستی بھی میرے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ کھانے کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بے حد غصہ آیا کہ ان عربی دیہاتیوں نے مجھے کیا سمجھ کر میرے ساتھ مذاق کیا ہے، کھانے کی جگہ غلاظت دے دی ہے۔ یہ تو خارجیوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے۔ یقیناً انھوں نے جان بوجھ کر ایسا کر کے میری تذلیل کی ہے۔ میں ذرا ان کو پوچھتا ہوں کہ تم کیسے بے حس لوگ ہو، اپنے مہمان کے ساتھ یہ کیسا سلوک کرتے ہو۔'' کیونکہ پلیٹ میں پڑی ہوئی غلاظت سے ان کی بے حسی اور بے مروتی عیاں تھی۔ میں مایوسی کے حصار میں الجھا ہوا گاڑی سے نیچے اتر کر اس جانب چل پڑا جس جگہ وہ روشنی میں بیٹھے تھے۔ مجھے ان کی حرکت بہت ناگوار گزری تھی۔ میں تیخ پا ہو گیا تھا۔ میرے دل میں ان گنت غصیلے خیالات تھے۔ مگر کیا دیکھتا ہوں کہ لائٹیں بند ہو چکی ہیں اور روشنی برائے نام بھی نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا ہو سکتا ہے جنریٹر خراب ہو گیا ہو اور لائٹیں بند ہو گئی ہوں۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکال کر ان لوگوں کو دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں حیرت انگیز حد تک کچھ نہ تھا بلکہ وہ جگہ سرسرا رہی تھی۔ سب کچھ ایسے غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں نے آوازیں دینا شروع کر دیں، ''صدیق، صدیق (دوست، دوست) کوئی ہے۔ مگر کوئی جواب نہ آیا نہ ہی کوئی میرے پاس آیا۔ میں عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا کہ یا الٰہی میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تو یہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ ابھی سب لوگ کہاں چلے گئے ہیں یا میں ہوش میں نہیں، کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہر طرف نفرت کی دھند قائم ہو چکی تھی۔ مگر اب میں ہڈیوں کے جلنے کی بو محسوس کرنے لگا تھا۔ اچانک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ایک شخص نے مجھے سونگھ کر پوچھا تھا، ''تم نے خوشبو تو نہیں لگائی، فوراً مجھے یاد آ گیا، غیر مسلم جنات خوشبو سے بھاگتے ہیں اور مسلمان جنات گندگی سے۔ لہٰذا خوشبو، غلاظت، بُو اور اچانک روشنیوں کے غائب ہونے میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ میرے ذہن میں ایک مبہم سا سوال ابھرا، کہیں یہ جنات کا بسیرا نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے پسینے چھوٹنے لگے۔ دل گھبرا گیا اور جسم تھر تھر کانپنے لگا، جیسے کوئی اچانک بھوتوں کو دیکھ کر ڈر جائے اور پلیٹ خود بخود ایک طرف کھسکی چلی جانے لگی۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا اب یہاں سے بھاگنا چاہیے اور بزرگوں کے قول کے مطابق ایسی صورتحال میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ لہٰذا، میں نے مزید پریشانی سے بچنے کے لیے فوراً گاڑی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

اچانک میرے اردگرد قہقہوں کی بے ہنگم آوازیں بلند ہوئیں جیسے بربادی کے وقت مسخرے ہنستے ہیں۔ جنات میرا نام لے کر پکارنے لگے۔

''رک جاؤ چاند، رک جاؤ چاند، آگے مت بڑھو۔'' ریت کے ایک غبار نے میرے اوپر چڑھائی کر دی۔ میں پوری قوت سے گاڑی کی جانب بھاگ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا میرے پیچھے ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہیں اور جنات میرے پیچھے گھوڑوں کی طرح سرپٹ دوڑ رہے ہیں اور اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ ریگستانی ریت بار بار میرے گرد حصار قائم کر رہی تھی۔ میں ہر بار اس حصار کو توڑ رہا تھا اور جلدی سے راستہ طے کر کے گاڑی کے اندر پہنچنا چاہتا تھا۔ گاڑی سٹارٹ تھی، مجھے صرف دروازہ کھول کر اس کے اندر بیٹھ کر بھگانا تھا مگر ہر طرف گڑگڑ کی آوازوں کی گونج تھی اور ریت کا سمندر میرا گھیراؤ کیے ہوئے تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے سے بار بار ریت پھسل رہی تھی۔

قہقہوں اور چیخوں کی لمبی گونجیں اور دل کو کاٹنے والا بے ہنگم شور تھا۔ میں بوجھل قدموں سے شدت کے ساتھ ہانپتا ہوا بھاگتا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے میرے سینے اور پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ خوف سے مجھے اپنے چہرے کا گلابی رنگ سیاہی مائل میں تبدیل ہوتا ہوا اور جسم کانپتا ہوا محسوس ہوا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ ریت میرے سینے میں اترتی جا رہی تھی۔ میں گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا اور آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میرے قدم آگے نہیں بڑھ رہے تھے جیسے کسی نامعلوم طاقت نے مجھے روک لیا ہو۔ اچانک ایک چہرہ میرے سامنے نمودار ہوا۔ اس کے سر سے پیٹھ تک کالے لمبے بال تھے۔ میری اس سے گاڑی کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھا پائی شروع ہو گئی جو چند لمحے تک جاری رہی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر کوئی لفظ ادا نہیں ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرے آس پاس فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا۔ جنات نے شکلیں بدل بدل کر میرے دائیں بائیں شیطانی حرکات شروع کر دیں۔ انھوں نے مجھے ایک دوسرے کی طرف اچھالنا شروع کر دیا۔ کبھی وہ مجھے نیچے گراتے۔ کبھی ایک دوسرے کی طرف اچھالتے۔ کبھی میں خلاء میں پہنچ جاتا۔ کبھی مجھے ہوا میں معلق کر دیتے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہوا کو بے سود پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کافی دیر تک اس قسم کی دھینگا مشتی چلتی رہی۔ میرا جسم ان کی حرکتوں

سے بہت زیادہ درد کرنے لگا۔ اچانک انھوں نے مجھے ریت پر الٹا لٹا دیا اور نہ نظر آنے والی کوئی بھاری چیز میرے اوپر رکھ دی۔ کبھی محسوس ہوتا میرے اوپر کوئی جن بیٹھا ہوا ہے جو کبھی کبھار ہلتا تو مجھے بہت تکلیف ہوتی۔ میں عجیب اذیت میں مبتلا تھا۔ ایک عجیب طلسم ہوشربا تھا۔ کچھ دیر بعد مکمل خاموشی چھا گئی مگر میرے لیے اپنی جگہ سے ہلنا مشکل تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کر گئے تھے۔ اچانک میری نظر گاڑی پر پڑی جس کو وہ اٹھا کر نخل کی طرف لے جا رہے تھے مگر خود نظر نہیں آ رہے تھے۔ تقریباً آدھے راستے تک گاڑی کو لے جا کر انھوں نے ہوا میں چھوڑا۔ گاڑی ریت پر گری اور ایک دھماکے کی آواز بلند ہوئی، میں اور زیادہ گھبرا گیا۔ وہاں سے انھوں نے گاڑی کو گھسیٹنا شروع کیا اور نخل کی مٹی تک لے گئے۔ بعدازاں مجھے بھی گھسیٹتے ہوئے نخل تک لے گئے اور میری پہلے والی پوزیشن دوبارہ بنا دی۔ پھر انھوں نے دو دو چار چار سونے کی اینٹیں اٹھا کر نامعلوم سمت کی طرف روانہ ہونا شروع کر دیا۔ میرے لیے ان کو روکنا ناممکن تھا۔ میں ان اینٹوں کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اینٹیں جا رہی تھیں مگر وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ خوف نے میری آواز بند کر دی تھی۔ آخر کار میرے اوپر سے وزن ہٹا تو میں ہلنے جلنے کے قابل ہوا کہ خدا کا شکر ہے اب میں آزاد ہوں۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا مگر مجھے یہ بھی فکر لاحق تھی پتا نہیں گاڑی سٹارٹ بھی ہوتی ہے کہ نہیں۔ میں چپکے چپکے گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر یہ کیا ہوا اچانک پھر مجھے کسی نے پکڑ لیا اور پھینٹی لگانی شروع کر دی۔ ایک سونے کی اینٹ ہوا میں لہراتی ہوئی آئی اور میری پیشانی پر آ کر لگی اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ پھر مجھے ایک نامعلوم ہاتھ نے گھسیٹ کر گاڑی کے پچھلے ٹائروں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا۔ گاڑی کے پچھلے ٹائر تھوڑے سے بلند ہوئے۔ مجھے سیدھا لٹا کر میرے دونوں بازو ایک طرف کے ٹائر کے نیچے رکھ کر اوپر گاڑی کا بوجھ ڈال دیا اور سب چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہر قسم کی حرکات و سکنات بند ہو گئیں۔

بازوؤں پر گاڑی کے وزن سے میں کراہنے لگا۔ میرا ہلنا جلنا یا ٹائر کے نیچے سے بازو نکالنا ناممکن تھا۔ ستاروں کی روشنی تقریباً ماند پڑتی جا رہی تھی۔ کیونکہ سورج طلوع ہونے کا سمے قریب آتا جا رہا تھا۔ رات کی خنکی جاتی رہی۔ سارا شور و غل سراب کی طرح غائب تھا۔ سناٹے میں صبح کی دلفریب ریگستانی ہوا میرے جسم سے ٹکرائی مگر بوجہ پریشانی میرے دل و دماغ پر کوئی دلکشی پیدا نہ کر سکی۔ صبح بھی آہستہ آہستہ گزر گئی۔ دن کی گرمی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ دن کے دس بج گئے۔ سڑک دور گاڑی کے دائیں طرف تھی، میں بائیں طرف تھا۔ اس طرف سے سڑک نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر میرے کان گاڑیوں کی آمد و رفت کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ میں مالک کائنات سے دُعا کر رہا تھا۔ کاش! ابھی کوئی گاڑی اس طرف نکل آئے تو میری جان بچ جائے۔

اب تپتے سورج کی بے درد روشنی میرے جسم میں سرایت کرنا شروع ہو گئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ ریت اڑ اڑ کر میرے اوپر اور ارد گرد پڑ رہی تھی۔ میں ہر چند کوشش کر رہا تھا کہ ریت میری آنکھوں میں نہ پڑے اور نہ ہی میرے جسم سے ٹکرا کر میرے آس پاس اکٹھی ہو۔ کیونکہ ہوا میں اڑنے والی ریت کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کے لیے ذرا سا آسرا چاہیے ہوتا ہے۔ بعد میں ریت کے ذرات وہیں ٹیلے کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ میں بار بار جسم کو جنبش دے رہا تھا کہ ریت میرے آس پاس اکٹھی نہ ہو۔

آدھا دن گزر چکا تھا اور سورج عین آنکھوں کے اوپر آ چکا تھا۔ تیز دھوپ، ریت کی تپش، گاڑی کے وزن اور ایک ہی جگہ جمے جمے میرا جسم جھلسنے کی طرف مائل تھا۔ صحرائی ہوا کے آوارہ گرم گرم جھونکے میرے دائیں بائیں گردش کرتے ہوئے بار بار میرے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ میرے آس پاس دن بھر اداسی کی فضا چھائی رہی۔ میرا جسم سخت بخار میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اپنی بے بسی پر رونے کی خواہش کے باوجود بھی نہ ہی میری آنکھوں سے آنسو گرے اور نہ ہی میرے حلق سے کوئی آواز نکل رہی تھی۔

شاید سڑک پر گزرنے والی اِکا دُکا گاڑیوں کے مسافروں کے دلوں میں بھی جنات کا خوف سوار تھا۔ اس لیے وہ رکتے نہیں تھے۔

آزادی حاصل کرنے کی کشمکش میں میرے اعصاب اور زیادہ تن گئے تھے۔ ایک لحظہ بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ دوسری رات شروع ہونے والی تھی۔

ہاتھ پاؤں پہلے سے زیادہ پھول گئے تھے۔ میں ایک اور کرب میں مبتلا ہونے والا تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔ اب تک ہوا نے میرے اردگرد کافی ریت اکٹھی کر دی تھی۔ میرا جسم ریت میں تقریباً غرق ہونے والا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں تاکہ ریت آنکھوں میں نہ پڑے۔

زندہ رہنے کی تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ میں خود کو لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ آج صحیح معنوں میں مجھے دنیا میں اپنی حیثیت اور اوقات کا اندازہ ہو گیا۔ اگر چند لمحے اور اسی طرح گزرتے تو میرے ناک اور چہرے کا ریت میں غرق ہو جانا یقینی تھا۔ عشاء کا وقت تھا کہ میرے قریب ایک گاڑی آ کر رکی اور دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ایک شخص میری طرف بڑھا۔ اس نے سر پر عمامہ باندھ رکھا تھا اور سفید عبایا پہنا ہوا تھا۔

اس کی گاڑی کی ہلکی روشنی میں اس کا سیاہ کالا رنگ، سفید آنکھیں اور سفید دانت دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میں سمجھا یقیناً اب پھر میری بے بسی اور لاچاری کا کوئی نیا تماشا شروع ہونے والا ہے۔ خوف کی نئی لہر پوری شدت کے ساتھ میرے تن بدن میں گردش کرنے لگی۔ اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

’’گھبراؤ نہیں! میں انسان ہوں اور ایک عامل ہوں۔ اکثر ادھر سے گزرتا ہوں۔ تمہاری گاڑی ویرانے میں کھڑی دیکھ کر آیا ہوں کہ شاید کوئی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔‘‘

یہ جان کر میرے دل میں زندہ رہنے کا ایک حسین احساس پیدا ہوا کہ میرے پاس آنے والا جنات میں سے نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہے اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ جنات کی شرارتوں سے واقفیت رکھنے والا عامل تھا۔ مجھے جب پتا چلا کہ میرے قریب آنے والا دراصل مجھے بچانے کے لیے آیا ہے۔ میرے تن بدن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہی دل جو چند لمحے پہلے موت کے خوف سے سینے میں رکنے کی طرف مائل تھا اب زندگی کی ترنگ سے شاد ہونے لگا۔

میں نے اس عامل سے کہا، ’’پہلے جیک سے گاڑی اٹھا کر مجھے باہر نکالو، میرے دونوں بازو ٹائر کے نیچے شل ہو چکے ہیں۔‘‘

وہ فوراً اپنی گاڑی کی طرف بھاگا اور جیک لا کر میری گاڑی کے نیچے لگا کر گاڑی کو اٹھا کر میرے بازوؤں کو آزاد کر دیا۔ میرا جسم بخار، نقاہت اور تھکاوٹ کی وجہ سے چور چور تھا۔ اس نے میری نبض چیک کر کے کہا۔

’’تمھیں سخت بخار ہے، کوئی بات نہیں، اب سب ٹھیک ہو جائے گا مگر تم یہاں پھنسے کیسے۔‘‘

مگر میں نے جواباً پانی مانگا۔

میری بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر اس نے مجھے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

’’بیوقوف یہ جنات کا علاقہ ہے جو بھلا کے نام سے مشہور ہے، اس جگہ کوئی نہیں رکتا اور گاڑیاں بھی تیزی سے گزرتی ہیں۔ اب جلدی سے میری گاڑی میں بیٹھو، ایسا نہ ہو کسی اور آفت میں پھنس جاؤ۔‘‘

میں نقاہت میں تیزی سے عامل کی گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔ عامل میری گاڑی کے نیچے سے جیک نکال رہا تھا کہ یکدم میرے کانوں سے ’’رک جاؤ چاند، رک جاؤ، کہاں بھاگ رہے ہو‘‘ کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائیں، جن کو عامل نے بھی سنا اور اس نے گاڑی میں بیٹھ کر اس کو بھگانا شروع کر دیا۔ مگر اس وقت تک گاڑی کے اردگرد ریت کا حصار قائم ہو چکا تھا اور جنات گاڑی کو پھر سے اپنے ٹھکانے کی طرف کھینچنے لگے۔

☆☆......☆☆



میرا بیٹا! میرا ارمان!



مسز نوید ہاشمی

اُس وحشی نے اپنا دسواں بیٹا اُس عورت کی گود میں
ڈال کر اُس کے سارے دکھ دور کر دیے تھے مگر......

مالک مکان آیا تھا کہہ کر گیا تھا کہ آپ لوگ دو دو مہینے کرایہ نہیں دیتے ہو اگر اس مکان میں رہنا ہے تو ہر مہینے کرایہ دینا ہوگا ورنہ مکان خالی کر دو۔'' وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ مگر میں پریشان تھی کیا ہوگا ہم کرایہ کہاں سے بھریں گے۔ پچھلے ماہ اس وجہ سے کرایہ نہیں بھر سکے تھے کہ میری تیسری بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس مہینے اس وجہ سے کرایہ نہیں بھر سکے کہ میری دونوں بڑی لڑکیوں کو چکن پاکس نکل آئی تھی۔ اس وجہ سے سارا پیسہ بیماری میں اُٹھ گیا۔

میرے شوہر کا نام ماجد ہے۔ ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ میرے شوہر کی تنخواہ 25 ہزار روپے ہے اس میں مکان کا کرایہ، بجلی سوئی گیس ٹیلی فون کا بل، آنے جانے کا کرایہ، اسکول کی فیس، گھر کا سودا روز کی دال سبزی وغیرہ اور اللہ نہ کرے کوئی بیمار ہو جائے تو اُس کا خرچا...... ہم جیسے سفید پوش لوگوں کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ اوپر سے میری تین بیٹیاں ہیں۔ اللہ کی نظر میں بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ مگر زحمت جب بن جاتی ہیں جب ان کو پڑھاؤ لکھاؤ، شادی کا لمبا جہیز دو مگر قسمت نہیں دے سکتے۔

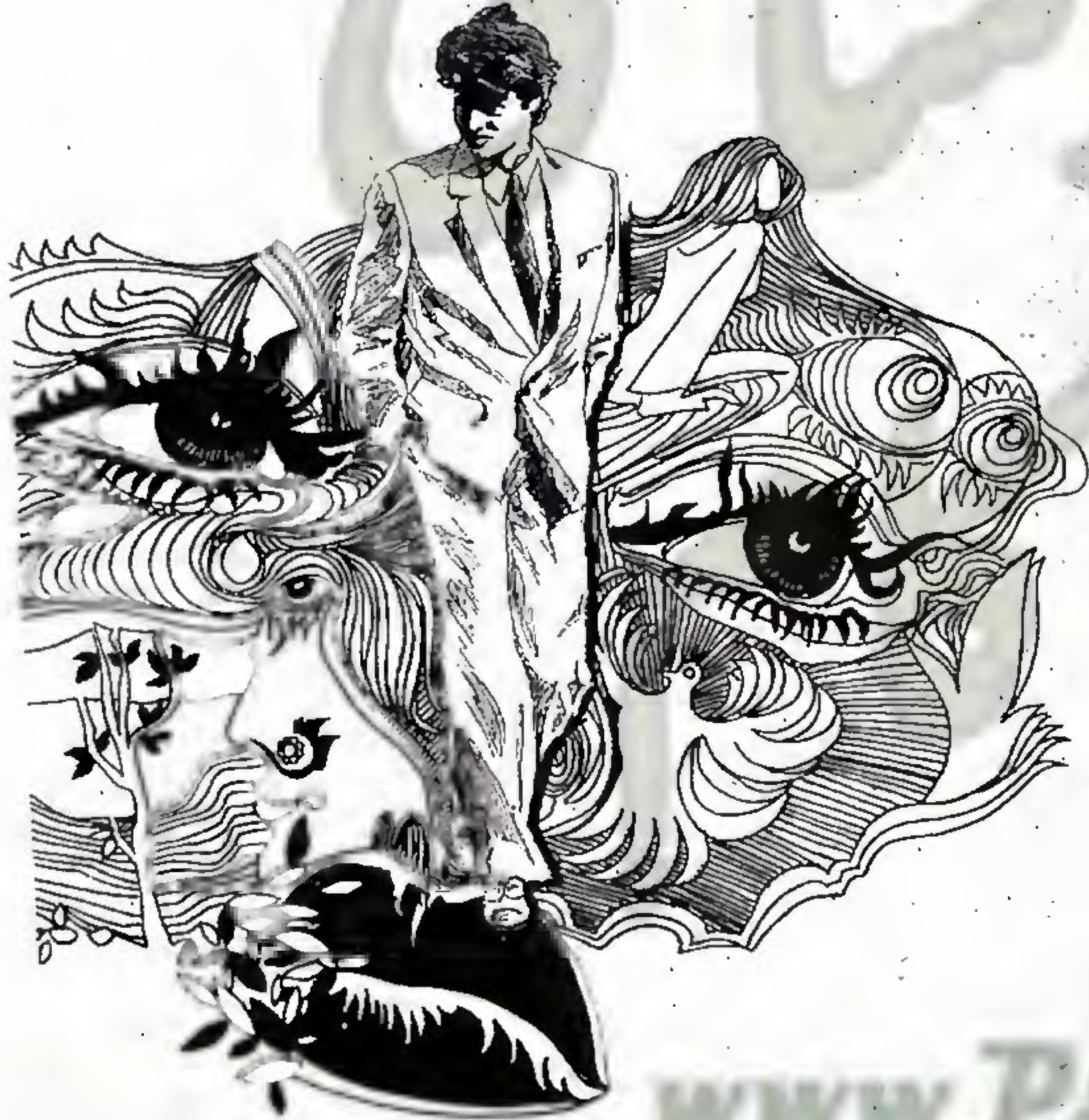
میرا نام ثریا ہے بیٹے کی چاہ مجھے شروع ہی سے تھی۔ جب میری بڑی بیٹی حنا کی پیدائش ہوئی تو میں نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کہ کاش میرے پہلے بیٹا ہو جاتا پھر بعد میں بیٹی۔'' خیر اللہ کی رضا سمجھ کر خاموش ہوگئی اور اپنی بیٹی کو قبول کر لیا۔ مگر بیٹے کی چاہ میرے دل سے نہ جا سکی۔ میری نمازیں اور لمبی ہوگئیں ہر نماز میں، میں نے صرف بیٹے کی دعا مانگی۔ پھر دوسری بیٹی ہما کی پیدائش پر میری آنکھوں کے آنسو نہیں رُکتے تھے اور زبان پر شکوہ تھا کہ یا اللہ ایک بیٹے کی ہی تو چاہ تھی۔ تُو تو مانگنے پر ہر ایک کی جھولی بھرتا ہے، پھر میری جھولی خالی کیوں۔'' خیر اولاد تھی قبول کر لیا مگر تیسری بیٹی مینا کی پیدائش پر میں حیران ہوئی کہ کیوں خدا نے میری دعا قبول نہیں کی اور تین تین بیٹیاں عطا فرما دیں۔

شاید میری دعا میں وہ سلیقہ نہیں، وہ تڑپ نہیں، وہ جنون نہیں جو مجھے ایک بیٹے کا فخر دے سکتا۔ اب میرے شوہر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم مزید اولاد پیدا نہیں کر سکتے۔ ان تینوں کی پرورش اچھی کر لی تو خدا کے آگے سرخ رو ہو جائیں گے۔ اب اللہ سے یہ دعا مانگو کہ ان تینوں کا نصیب اچھا کرے۔ بیٹے کی خواہش ختم کر دو اور دعا کرو کہ اللہ ہمیں اچھے داماد عطا کرے وہی ہمارے بیٹے ہوں گے۔''

میں اپنے شوہر کو دیکھنے لگی کہ کیا واقعی بیٹا ہمارے نصیب میں نہیں ہے اور واقعی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اگر اس بار میں نے ضد کی اور بیٹی پیدا ہوگئی تب کیا ہوگا۔ آج کل کے زمانے میں ایک یا دو بچوں کی پرورش مشکل ہے پھر میرا تو تین بیٹیوں کا ساتھ تھا۔ میرے شوہر جتنا کماتے اتنا ہی خرچ ہو جاتا، کچھ نہیں بچتا تھا۔ میں سوچتی میں اپنی بچیوں کی شادی وغیرہ کیسے کروں گی۔ کیا ساری زندگی میرے شوہر محنت کرتے رہیں گے۔ انہیں کبھی آرام نہیں ملے گا۔ اگر آمدنی کا اچھا ذریعہ ہوتا تو میں کچھ پس انداز بھی کر لیتی یا کوئی پالیسی وغیرہ لے لیتی مگر کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا۔

میں تو بس یہ دعا کرتی کہ کوئی بیمار نہ پڑ جائے، کہیں اُس کا خرچہ شروع نہ ہو جائے۔ میں کھینچ تان کر گزارہ کر رہی تھی۔ بچوں کو گھمانا پھرانا تو ایک خواب تھا۔ کبھی ہم اچھا سا کھانا پکا کر محلے کے پارک میں چلے جاتے اور وہاں بیٹھ کر انجوائے کرتے۔ بڑی جگہوں پر جانا ہم افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کسی بڑے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلانے بھی نہیں جا سکتے تھے بس فٹ پاتھ پر بنے ریسٹورنٹ میں کبھی کبھی کھانا کھا لیتے یا جب کسی بچی کی سالگرہ یا بچوں کی پاس ہونے کی خوشی یا عید کا دن وغیرہ ہوتا تو۔

پھر سارا مہینہ ان پیسوں کا غم مناتے کہ اتنا خرچہ ہوگیا۔ مہینے کے آخری دنوں میں تو ٹھیلے کے برگر،



گول گپے، چھولے چاٹ کی اوقات بھی نہیں ہوتی تھی۔ اوپر سے بیٹے کی چاہ میرے دل سے ختم نہیں ہوتی تھی۔

کسی کی گود میں بیٹا دیکھتی تو خواہش اور بڑھ جاتی کہ کاش میرا بھی ایک بیٹا ہوتا مگر میں اپنے آنسو پی کر رہ جاتی۔ خدا کی رضا میں راضی تھی مگر خوش نہیں تھی۔

دونوں بڑی بیٹیوں حنا اور ہما کی اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئی تھیں۔ وہ اپنے پاپا سے ضد کر رہی تھیں پارک جانے کی مگر وہ اپنے روٹین والے پارک میں نہیں جانا چاہتی تھیں، وہ کسی دوسرے پارک میں جانے کی ضد کر رہی تھیں۔ پارک تو بہت سارے تھے مگر تھوڑا دور دور تھے۔ دوسرے پارک میں جانے کے لیے کرائے کی ضرورت تھی اور فالتو پیسہ خرچ کرنا ہمارے بس میں نہ تھا۔

مگر آج بچوں کی ضد نے ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم کسی دوسرے بڑے پارک میں چلے جائیں۔

خیر ہم ایک نئے پارک میں آگئے۔ وہ بہت بڑا اور خوبصورت پارک تھا، مگر حیرت کی بات تھی وہاں لوگوں کا انتارش نہیں تھا۔

چند ہی لوگ تھے۔ پارک میں بچوں کے جھولوں والا حصہ تو ویران پڑا تھا۔

میری بیٹیاں اتنے سارے جھولے دیکھ کر خوش ہوگئیں۔ وہ جھولے جھولنے لگیں، ہم بھی پارک پر تبصرہ کرنے لگے۔ ''پارک تو بے حد اچھا ہے مگر لوگوں کی رونق نہیں ہے۔ خالی پڑا ہے، بچوں کی جھولے والی سائیڈ پر تو کوئی ہے ہی نہیں۔''

میرے شوہر بولے۔ ''ہمیں کیا! ہماری بیٹیاں تو خوش ہیں۔ انجوائے کر رہی ہیں۔ جس جھولے میں چاہے جھول رہی ہیں۔ وہ تینوں خوش تو ہم بھی خوش۔'' ہم دونوں مسکرانے لگے۔

پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے بچوں پر بھی نظر ڈال لیتے۔ تینوں بیٹیاں تتلیوں کی طرح گھوم رہی تھیں۔ اُن کی خوشی دیکھ کر ہم دونوں بھی اتنا ہی خوش تھے جیسے ہم بھی جھولوں کو انجوائے کر رہے ہوں۔

اچانک میری بڑی بیٹی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''مما پاپا اس جھولے کے پاس سے کسی بچے کی رونے کی آواز آ رہی ہے۔''

ہم دونوں اپنی بیٹی کے ساتھ اُس جھولے کے قریب گئے وہ Slight Tunnel تھی، اس کے خول میں ایک باسکٹ رکھی تھی، جس میں سے بچے کی آواز آ رہی تھی۔

میرے شوہر نے باسکٹ نکالی اور اُس کا ڈھکن اٹھایا تو اُس میں بے حد خوبصورت بچہ تھا۔ میرے شوہر نے بتایا، لڑکا ہے مگر کون چھوڑ گیا۔ اتنا پیارا خوبصورت، وہ بھی لڑکا۔''

''لڑکے'' کا لفظ سُن کر میں نے لپک کر اُس بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ میری گود میں آکر چپ ہوگیا اور مجھے ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ میں نے بے اختیار اُسے چوم لیا۔ مجھے اس بچے پر بہت پیار آ رہا تھا۔ میرے شوہر بولے۔

''پتا نہیں کس کا بچہ ہے۔ کون اِسے یہاں چھوڑ گیا ہے......'' وہ اور بھی پتا نہیں کیا کیا بولتے رہے۔ وہ لوگوں سے پوچھ رہے تھے۔ چوکیدار سے پوچھ رہے تھے۔ مگر کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟ اور کون اسے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ آخر اُس بچے کی کاغذی کارروائی شروع ہوگئی۔ پھر پولیس نے کہا اِسے ایدھی ہوم میں دے دیتے ہیں۔''

میرا دل اس بچے سے جدا ہونے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر میرے دل نے فیصلہ کر لیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بچہ گفٹ دیا ہے۔ یہ اُس عبادت' اُس نماز' اُس دعا کا کمال ہے۔ جو میں نے اللہ سے مانگی۔ اللہ نے مجھے بیٹا دے دیا چاہے وسیلہ کچھ بھی بنایا۔ اس کا کوئی دعویدار نہیں تھا تو پھر یہ میرا ہوا۔ میرا بیٹا، میری جان میری آنکھوں کا نور، میرا بچہ۔'' میں بے تحاشا اُسے پیار کرنے لگی۔ وہ بھی ایسے مسکرا رہا تھا جیسے واقعی وہ میرا بیٹا ہو۔

میرے شوہر نے میرا پیار اور بیٹے کی تڑپ دیکھ کر بچے کی کسٹڈی اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ہم بچے کو گھر لے کر آگئے۔ میری بیٹیاں بھی اپنے بھائی کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ میرے شوہر خوش تھے مگر خاموش تھے۔

''آپ اتنا خاموش کیوں ہیں۔'' میں نے آخر پوچھ لیا۔

''ثریا تمہارا پیار دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔ اگر کسی اور کا بچہ ہوا اور وہ لینے آگیا تو تمہیں دیتے ہوئے دکھ ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مجھے گفٹ کیا ہے یہ میری دعاؤں کا پھل ہے۔''

ہم نے اُس کا نام ارمان رکھ دیا۔ اور ہم ہنسی خوشی رہنے لگے۔ معاشی پریشانی تو تھی ہمارے ساتھ مگر پتا نہیں کیوں اب میں اِن پریشانیوں سے گھبراتی نہیں تھی۔ اپنے بیٹے کی محبت میں اب مجھے یہ پریشانی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اپنے بیٹے ارمان میں ایک بات دیکھی۔ وہ سارا دن ہمارے ساتھ رہتا مگر جب سوتا ہوتا تو اُسے نیند اُس باسکٹ میں ہی آتی تھی۔

جب وہ نیند سے بے چین ہو جاتا تو میں اُسے باسکٹ میں لٹا دیتی۔ وہ آرام سے سوتا رہتا تھا۔

☆......☆......☆

آج پھر مالک مکان آیا تھا کرایہ مانگنے۔ تیسرا مہینہ ہونے کو آیا تھا ہم نے کرایہ نہیں دیا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا بولا۔

''کل شام تک اگر آپ لوگوں نے تین مہینے کا کرایہ ادا نہ کیا تو یہ مکان خالی کرنا ہوگا۔ میں پولیس کو بھی لے کر آؤں گا۔ دیکھتا ہوں کیسے مکان خالی نہیں کرتے تم لوگ۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں پریشان تھی کہ اب کیا ہوگا۔ اس مہینے ہمیں ارمان، ہمارا بیٹا مل گیا تھا اس وجہ سے اُس کے کپڑے، دودھ وغیرہ پر کافی خرچ ہوگیا تھا۔ پانچ ہزار رکھے تھے مگر مکان دس ہزار مہینے کا تھا۔ اوپر سے تین مہینے کا کرائے کا مطلب تھا تیس ہزار روپے۔ کہاں سے آئیں گے تیس ہزار روپے، کیا ہوگا۔ میں اسی فکر میں غلطاں تھی کہ میرے شوہر بھی آگئے۔ میرا اُداس پریشان چہرہ دیکھ کر پوچھا ''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

میں نے تمام بات بتائی تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔ ''اب تیس ہزار کہاں سے آئیں گے۔'' میرے شوہر نے غصے میں کہا۔

''میں نے تمہیں اِس مہینے کا کرایہ دیا تھا کہ مالک مکان کو دے دینا مگر تم سنتی کہاں ہو۔ بے کار میں فضول خرچ کرتی رہتی ہو۔''

''آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ وہ پیسے ہم نے اپنے بیٹے ارمان پر خرچ کیے ہیں۔''

اسی وقت ارمان زور زور سے رونے لگا۔ میں تڑپ کر ارمان کے پاس گئی۔ باسکٹ سے ارمان کو نکال کر گود میں اٹھا لیا تو میری نظر باسکٹ کے اندر گئی۔ باسکٹ میں ہزار ہزار کے نوٹ کی گڈی رکھی نظر آئی۔ میں نے اپنے شوہر کو آواز دے کر وہ انہیں دکھائی۔ بچہ ہمارے پاس 15 دن سے زیادہ ہوگئے تھے آیا ہوا تھا۔ میں روز باسکٹ کی صفائی کرتی تھی کبھی کچھ نظر نہیں آیا۔ آج ہزار ہزار کی نوٹ کی گڈی رکھی تھی۔

میرے شوہر نے اُسے نکال کر گنتی کی تو پورے ایک لاکھ روپے تھے۔ ہم دونوں حیران تھے۔

دوسرے دن مکان مالک کو تین مہینے کا کرایہ دے کر بھی 70 ہزار ہمارے پاس بچ گئے تھے۔ یہ خواب تھا یا حقیقت......

میں نے ارمان کو اٹھا کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ ''میرے بیٹے تم کتنے چھوٹے سے ہو مگر تم نے ہماری پریشانی حل کر دی۔''

میرے شوہر بولے۔

''پہلے یہ سوچو یہ پیسے اس ٹوکری میں کہاں سے آئے۔ کہیں یہ بچہ جن تو نہیں ہے۔''

''آپ بہت خراب ہیں۔ ایک تو میرے بیٹے نے آپ کی پریشانی حل کر دی اور آپ اسے جن کہہ رہے ہیں۔'' وہ خاموشی سے ارمان کو دیکھتے رہے۔

پھر ہم نے ان پیسوں سے ریفریجریٹر اور واشنگ مشین خرید لی کیونکہ گرمیوں کے دن تھے اور ٹھنڈے پانی کے بغیر نہیں رہا جاتا تھا اور ہاتھ سے کپڑے دھو دھو کر میرے ہاتھ دکھ جاتے تھے۔

☆......☆......☆

اور پھر تو جیسے پیسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور

ہمارا گھر چیزوں سے بھرنے لگا۔ اب ہم ایک پُرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔

میں نے اپنا ہر مسئلہ اپنے بیٹے ارمان کو بتانا شروع کر دیا۔ میرے شوہر چپ اور خاموش رہنے لگے، بس وہ کبھی کبھی ارمان کو بڑی حیرانی سے دیکھنے لگتے۔ ہمیں برابر نوکری سے پیسے مل رہے تھے۔ آخر ہمارے پاس اتنی رقم ہوگئی کہ ہم نے کاروبار شروع کر دیا اور اللہ نے اُس کاروبار میں اتنی برکت دی کہ وہ ترقی کرتا رہا۔

پھر ہم نے بہت اچھی لوکیشن پر گھر خرید لیا 'گاڑی بھی تھی، نوکر چاکر تھے' سب کچھ تھا۔ بچے اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ اب میرا بیٹا ارمان بھی اسکول جانے لگا تھا۔

اب وہ بڑا ہو گیا تھا، نوکری میں نہیں سو سکتا تھا۔ مگر جب تک باسکٹ اس کے برابر نہ ہو اور اُس پر ارمان کا ہاتھ نہ ہو ارمان کو نیند نہیں آتی تھی۔

☆......☆......☆

تینوں بہنوں کی آنکھ کا تارا اور میری جان تھا ارمان۔ وہ بھی بہنوں کا دیوانہ تھا۔ وقت ہنسی خوشی کٹ رہا تھا کہ اچانک میرا اور میرے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میرے شوہر موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ اور وہ مجھے اور اپنے چاروں بچوں کو چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ مجھے بھی بہت زیادہ چوٹیں آئیں مگر سب سے بڑا نقصان میرا یہ ہوا کہ میری زبان کٹ گئی اور میں عمر بھر کے لیے بولنے سے محروم ہو گئی۔ اپنی بات ہاتھ کے اشارے سے بتاتی اوپر سے میری ریڑھ کی ہڈی میں بھی گیپ آ گیا تھا۔

اس وجہ سے میں بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ میرے بچوں کا کیا ہو رہا تھا۔ کون میرے بچوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ قسم قسم کے رشتہ دار ہمارے گھر آ کر رہنے لگے تھے۔ جن کی ہم نے کبھی شکل نہیں دیکھی تھی اور اب وہ حق سے ہمارے گھر اور کاروبار کی باگ ڈور چلانے لگے تھے۔

میرے بچے پریشان اور خوف زدہ تھے۔ ارمان 4 سال کا، بینا ساڑھے پانچ سال کی، ہما پانچ اور حنا نو سال کی ہو گئی تھی۔ میں بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔

کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی، ان کے آنسو صاف نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں آنسو بہا سکتی تھی۔ اپنی مجبوری پر، اپنی بے بسی پر، بچوں کی لاچاری پر، ہمارے رشتہ دار جو پتا نہیں ہمارے تھے یا نہیں اب حق سے ہماری چیزیں استعمال کر رہے تھے اور میرے بچوں کا حق مار رہے تھے۔

میں خاموش روتے ہوئے سب دیکھ رہی تھی۔ کسی بچے کو کھانا ملا یا نہیں، کپڑے گندے بدل نہیں سکتی تھی، اسکول ایک مہینہ سے نہیں گئے تھے۔ ارمان جس میں میری جان تھی اُس سے سب کہہ دینا چاہتی تھی مگر زبان نہیں تھی صرف آنسو اور میری بے بسی میرا حال عیاں کر دیتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن ارمان مجھ سے لپٹ کر سو رہا تھا میری آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ جس سے ارمان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ مجھے دیکھنے لگا۔ پھر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری آنکھ کے آنسو صاف کرنے لگا مگر میری بے بسی جو ارمان سے سب کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر زبان کٹ جانے کی وجہ سے میں کہہ نہیں پاہ رہی تھی، اسی بے بسی پر میں تڑپ تڑپ کر رو دی۔ وہ جتنا آنسو صاف کرتا میرے آنسو اُس سے زیادہ نکل جاتے۔ اچانک ارمان بولا۔

''ماں تم پریشان مت ہو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ بس پاپا کے چالیسویں کا انتظار ہے۔ وہ ہو جائے پھر تمام جھوٹے رشتہ داروں کو یہاں سے نکال دوں گا۔ میری بہنوں کی ذمہ داری اب میری ہے آپ پریشان مت ہوں۔''

میں حیران تھی اور اُتنے صاف لہجے میں ارمان کو بات کرتے دیکھ رہی تھی۔ وہ چار سال کا تھا ابھی اور وہ مجھ سے اتنی بڑی بڑی باتیں روانی سے کر رہا تھا۔ ارمان بولا۔

''ماں تم حیران مت ہو۔ پاپا سمجھ گئے تھے کہ میں

ایک جن ہوں مگر آپ اپنی محبت میں مجھے نہیں پہچان سکیں۔ میری ماں کے دس بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ اُس اسپتال میں جہاں بینا پیدا ہوئی تھی۔ تمہاری دعا، تمہاری بیٹے کی تڑپ کی وجہ سے میری ماں نے مجھے تمہاری جھولی میں ڈال دیا۔ مگر وہ ماں تھی۔ روز مجھ سے ملنے اس باسکٹ میں آتی ہے۔ جب جب ہمارے گھر میں پریشانی ہوئی میری ماں نے اس کا حل پیسے کی گڈی کی شکل میں نکال لیا۔ میں آپ کی نظر میں چار سال کا ہوں مگر حقیقت میں میں 20 سال کا ہو گیا ہوں۔ مگر آپ کا وہی چار سال کا بیٹا بن کر اپنی بہنوں کو سایا دوں گا۔ اب آپ کو آپ کا سگا بیٹا بن کر دکھاؤں گا۔ مگر آپ کو مجھ سے ڈر لگ رہا ہے تو میں آپ کے پاس سے دور چلا جاؤں گا۔''

میں نے اپنا سر نفی میں ہلا کر ارمان کو آنکھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اُس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ خوش ہو گیا پھر بولا۔

''بس ماں! تمہارا ساتھ میری طاقت بن گیا ہے۔ انشاء اللہ آپ کو اس بستر سے اُٹھا کر دم لوں گا۔''

مجھے اپنے ارمان کی باتیں سُن کر کہ وہ ایک جن ہے مجھے بالکل ڈر نہیں لگا۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی اُس جنی ماں کا، جس نے اپنے دس بچوں میں سے ایک مجھے گفٹ کر دیا تھا۔ اُس ماں کا بہت بڑا دل تھا۔

پھر ارمان نے میرے سامنے ایک بیس سال کے لڑکے کا روپ بدلا اور بولا۔

''ماما میں اب اس روپ میں لوگوں کے سامنے آ کر آپ سب کو بچاؤں گا اور اپنی بہنوں کے لیے اُن کے چھوٹے بھائی کے روپ میں رہوں گا۔''

اور پھر واقعی ارمان نے تمام نام نہاد رشتہ داروں سے جان چھڑا دی۔ اور میری بیٹیوں کی دیکھ بھال اس طرح کرنے لگا جیسے واقعی ایک بڑا بھائی کرتا ہے۔

میری بڑی بیٹی حنا نے پوچھا۔

''مما یہ کون ہیں اور یہ کس کے رشتہ دار ہیں۔''

میں مسکرانے لگی زبان تو تھی نہیں اس لیے بول نہیں سکتی تھی پھر حنا دوبارہ بولی۔

''مگر جو بھی ہے جس کا بھی رشتہ دار ہے ایسا لگتا ہے ہمارا بڑا بھائی ہے جیسے ہمارا چھوٹا ارمان بڑا ہو گیا ہے۔''

پھر دنیا نے دیکھا کیسے میری تینوں لڑکیوں کی اچھی جگہ شادی کروائی، میری طبیعت اتنی سنبھل گئی تھی کہ میں چل پھر سکتی تھی۔ یہ تمام کمال میرے اللہ اور میرے بیٹے ارمان کا تھا۔ پتا نہیں اگر میرا سگا بیٹا ہوتا تو یہ سب کر سکتا یا نہیں مگر ارمان نے میرا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس بات کا جتنا شکر ادا کرتی اتنا کم تھا۔

☆......☆......☆

آج کل میری بیٹیاں اپنی بھابی لانے کے لیے لڑکیاں، ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہر روز ایک سے ایک حسین لڑکی انہیں پسند آ جاتی۔ ارمان میرے پاس آیا۔

''مما اب وقت آ گیا ہے آپ سے اور اپنی بہنوں سے دور جانے کا کیونکہ وہ میری شادی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ آپ کو پتا ہے میں ایک جن ہوں۔ اور میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا۔

''ارمان بیٹا تم کسی جنی سے شادی کر لو اور بہو بنا کر ہمارے گھر لے کر آ جاؤ۔'' میں نے اُسے صلاح دی تو وہ بولا۔

''نہیں مما اس دنیا میں وہ نہیں رہ سکے گی۔ آپ میری بہنوں سے کہہ دیجیے گا کہ میں باہر چلا گیا ہوں۔ اور وہیں شادی وغیرہ کر لی ہے۔ ہاں میں آپ کے پاس آتا رہوں گا۔ آپ کو اور مجھ کو اللہ تعالیٰ نے زندگی دی، کوشش کروں گا کہ اپنی بیوی اور بچوں سے بھی ملواؤں مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔''

پھر ارمان ہم سے دور چلا گیا۔ وہ اب بھی مجھ سے ملنے آتا ہے اُس نے اپنی بیوی اور بچوں سے بھی مجھے ملوایا ہے۔

میری آپ لوگوں سے اتنی سی عرض ہے دعا ہمیشہ مانگتے رہنا چاہیے۔ خدا کسی نہ کسی صورت میں ہماری دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ چاہیے کسی روپ میں قبول کرے۔''

☆☆......☆☆



ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے



دستگیر شہزاد

ڈاکٹر صاحب کا بھورا بیگ جنوں، بھوتوں کی جیل تھا، جس میں......

اٹھائیس سالہ عادل لاہور کا رہنے والا تھا اور دوبئی میں انجینئر تھا۔ اس کے تین بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ان کے والد ناصر حسین کا میراں بادشاہ میں لیدر بیگ بنانے کا کارخانہ تھا۔ ان کے بنائے بیگ کئی ملکوں میں ایکسپورٹ ہوتے تھے۔ ناصر حسین کے سارے بچے اچھی تعلیم حاصل کر کے اچھی نوکریوں پر لگے ہوئے تھے۔ عادل کے علاوہ سب بچوں کی شادی ہو چکی تھی۔

اٹھارہ دسمبر کو عادل کا نکاح میرب کے ساتھ ہوا تھا۔ بیگوال کے رہنے والے بازل حسین کی بیٹی میرب نے پنجاب یونیورسٹی سے بی کام کیا تھا۔ وہ بینک میں نوکری کرنا چاہتی تھی لیکن اُس کے گھر والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور تعلیم مکمل ہونے کے چار ماہ بعد میرب کا عادل سے نکاح کر دیا۔ میرب بہت خوبصورت اور حسین دوشیزہ تھی۔ اس کا فوٹو دیکھتے ہی عادل نے اُس کو پسند کر لیا تھا۔

نکاح کی مقرر ہونے سے پہلے عادل ڈیڑھ ماہ کی چھٹی لے کر دوبئی سے اپنے گھر لاہور آیا تھا۔ نکاح کے بعد میرب دلہن بن کر اُس کے گھر آئی تو عادل کی بہنوں اور بھائیوں نے اُس کے کمرے کو پھولوں سے سجا دیا تھا۔ پھر طرح طرح کے پھولوں سے سجے بستر پر میرب کو بٹھا دیا۔ دولہا عادل رات دس بجے میرب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گولڈ کے سیٹ کا ڈبہ تھا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد سیج پر بیٹھی میرب کو دیکھا تو دل ہی دل میں مسکراتا ہوا سیج کے پاس آیا۔ کچھ لمحے میرب کو دیکھنے کے بعد عادل سیج پر میرب کے پاس بیٹھا ڈبہ کھول کر سونے کا نیکلس میرب کو دکھاتے ہوئے بولا۔

''تحفہ قبول کیجیے۔ بیگم صاحبہ۔''

میرب عادل کو دیکھے بغیر دھیمی آواز میں گنگنانے لگی۔ ''دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔''

''واہ کیا بات ہے؟'' آپ کی آواز تو بہت سریلی ہے۔'' کہتے ہوئے عادل نے نیکلس میرب کے گلے میں پہنانے کی کوشش کی، تو میرب نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گاتے ہوئے بولی۔

''چھونا نہ مجھ کو ٹوٹ جاؤں گی۔''

''دیکھو نا مجھ کو روٹھ جاؤں گی۔''

عادل ہکا بکا سا کچھ لمحے تک میرب کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس کے دل میں خیال آیا کہ شاید میرب اُسے ستا رہی ہے۔

عادل مسکرا اٹھا۔ پھر گانے والے انداز میں بولا۔

''چودہویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔''

''جو بھی ہو خدا کی قسم لا جواب ہو۔''

گانا عادل کی زبان پر ہی تھا کہ اچانک میرب نے اس کے گال پر ایک زوردار طمانچہ رسید کیا کہ عادل کا چہرہ سرخ ہو اٹھا۔ میرب غصے میں کانپتی ہوئی دہکتی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اور ایک ایک لفظ وہ جیسے غصے میں چباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''خبردار! میری جان جگر کی تعریف میں قصیدے پڑھنے کی۔ اگر آئندہ ایسی جرأت کی تو زبان کھینچ لوں گا۔''

حیرت سے میرب کو دیکھتا عادل اپنا گال سہلاتے



ہوئے بولا۔

''مذاق کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ میرب آج ہماری سہاگ رات ہے۔ اور تم اتنا گندہ مذاق کر رہی ہو مجھ سے۔''

کہتے کہتے عادل نے میرب کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ اور اُسے اپنی بانہوں میں بھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ یکا یک میرب چلانے لگی۔ پھر اُس نے عادل کو اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ درد سے عادل چیخنے چلانے لگا۔

اس کی چیخیں سن کر گھر والے اور ٹھہرے ہوئے مہمان بند دروازے کے باہر آ گئے۔ اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اس سے پہلے کہ عادل اٹھ پاتا میرب پھرتی سے بستر سے اتری اور عادل کے سینے پر چڑھ کر غرانے لگی۔

''یہ میری ہے صرف میری۔ آئندہ اسے اپنے ناپاک ہاتھوں سے چھونے کی کوشش کی یا چھونے کی بات دل میں سوچی تو چیر پھاڑ دوں گا تجھے۔'' پھر عادل کے چہرے پر تابڑ توڑ گھونسے برسانے لگی۔ عادل کے منہ سے دردناک چیخیں نکلنے لگیں۔

کچھ ہی دیر میں عادل کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔





دھیرے دھیرے چیخیں کراہوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ لیکن غصے میں غراتی میرب اس کے چہرے پر گھونسے برساتی رہی۔

ادھر جب کافی دیر بعد بھی دروازہ نہ کھلا تو گھر والوں نے دروازہ توڑ دیا۔ کمرے کا نظارہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے۔ پھر کئی لوگوں نے جھپٹ کر میرب کو دبوچ لیا۔ پتا نہیں میرب میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ پانچ لوگ بھی اس پر قابو نہیں پا رہے تھے۔ ایک رشتہ دار کی صلاح پر میرب کے ہاتھ پیر رسی سے باندھ دیے گئے۔ پھر اُسے ایک کمرے میں ڈال دیا گیا۔ پھر کمرے کے باہر تالا لگا دیا گیا۔ عادل کافی زخمی ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ اُسے جلدی نرسنگ ہوم میں لے گئے۔ وہاں اس کا فوراً علاج ہوا اسی لیے اس کی جان بچ گئی۔

☆......☆......☆

سہاگ رات کا بیوی پر شوہر کے قاتلانہ حملے کی خبر پورے علاقے میں پھیلی تو لوگ ہر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ زیادہ تر لوگوں کا کہنا تھا کہ میرب پر کسی بری روح کا سایا ہے۔ لیکن عادل کے خاندان میں سب ہی لوگ بہت زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ اطلاع پا کر اگلے دن میرب کے میکے والے بھی آ گئے۔

میرب کے سسرال والوں سے پورا قصہ سن کر سب لوگ حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ سب لوگ بہت زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ انہیں بھی روحوں پر یقین نہیں تھا۔

دوپہر کے وقت بند کمرے میں میرب کے سسکنے کی آوازیں آئیں۔ تو میرب کے میکے والوں کے کہنے پر میرب کے کمرے کا تالا کھولا گیا۔ میرب کا ماں باپ اپنی بیٹی کو دیکھ کر رونے لگے۔

میرب کے بڑے بھائی رافل نے میرب کی رسیاں کھولیں۔ میرب بہت دیر تک اپنے والدین اور اپنے بھائی سے مل کر روتی رہی۔ لیکن جب میرب کے والد نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! کیا ہوا ہے تمہیں؟" باپ کا اتنا کہنا تھا کہ میرب غصے سے کانپنے لگی اور اس کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ اُس نے اپنے باپ کی گردن دبوچ لی اور غرا کر کہنے لگی۔

"تیری ہمت کیسے ہوئی میری محبوبہ کا نکاح کرنے کی۔ میرب میری ہے صرف میری۔"

پھر اُس نے اپنے باپ کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر اوپر پھینک دیا۔ باپ دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ یہ دیکھ کر وہاں موجود ہر انسان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بڑی مشکل سے کئی لوگوں نے مل کر میرب کو قابو میں کیا۔ میرب چیختی ہوئی بے ہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

عادل کے فیملی ڈاکٹر عمیر عارف کو بلوایا گیا۔ جو شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ان کے آتے ہی میرب ہوش میں آ گئی۔ اس نے ڈاکٹر عمیر کا بیگ پکڑا اور پھینکتے ہوئے کہنے لگی۔

"میری میرب کو چھونا بھی مت۔ ورنہ تجھے بھی چیخ کر مار دوں گا۔ تیری ڈاکٹری ایک سیکنڈ میں نکال دوں گا۔ چل بھاگ جا یہاں سے۔" ڈاکٹر عمیر کے کہنے پر کچھ لوگوں نے میرب کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ غراتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈاکٹر عمیر نے اُسے نیند کا انجیکشن دے دیا۔ جب انجیکشن کے اثر سے میرب سو گئی، تو عادل کے والد سے ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میری بہو کو کیا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب۔" ڈاکٹر عمیر گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

اسے دورے پڑتے ہیں۔ دورہ بھی اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ایک عجیب سی طاقت آ جاتی ہے۔"

یہ سن کر میرب کی امی نے کہا۔

"ہمارے گھر میں تو میرب کو کبھی ایسے دورے نہیں پڑے۔"

"یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟" عادل کی امی نے پوچھا۔

ڈاکٹر عمیر نے ایک پرچی پر دوا کے نام لکھ کر دیتے ہوئے کہا۔

"نئے نئے ماحول سے میرب کا سابقہ پڑا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر عمیر نے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر عادل! میرا مشورہ ہے کچھ دنوں تک آپ میرب سے الگ ہی سوئیں تو بہتر ہوگا۔" عادل نے غصے میں چلاتے ہوئے کہا۔

"میں زندگی بھر اس کے ساتھ نہیں سوؤں گا۔" یہ ڈرامہ رچا رہی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ شادی سے پہلے کسی

سے محبت کرتی تھی۔ اس کے گھر والوں کو ہر بات پہلے سے معلوم تھی، لیکن اپنی آفت ہمارے گلے باندھ دی۔" عادل نے میرب کے والدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تو وہ دونوں رونے لگیں۔

"مہربانی کر کے ہماری بیٹی پر یہ الزام مت لگائیں عادل میاں۔" میرب کے ابا بازل حسین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ تو عادل یہ کہہ کر گھر سے باہر چلا گیا۔

"برائے مہربانی اپنی بیٹی کو یہاں سے لے جائیں ورنہ میرا ہاتھ بھی اٹھ سکتا ہے۔"

جو انسان دوسروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ حقیقت میں وہ اپنی کردار کی برائیاں دوسروں میں تلاش کرتا ہے۔

عادل کے والدین سے مشورہ کر کے بازل حسین اسی دن میرب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹر عمیر کی دوائیوں کا کچھ بھی اثر میرب پر نہ ہوا۔

میرب اکثر سوتی رہتی تھی۔ بے وجہ بڑبڑاتی رہتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن وہ گیت گا رہی تھی۔ ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں ہوں۔ گا رہی تھی تو اُس کی ماں نے گانا گانے سے منع کیا۔ میرب غصے میں سرخ ہو گئی اور ماں کے بال مٹھیوں میں بھر کر کھینچ دیا۔ اور غراتے ہوئے بولی۔

"میں گانا گاؤں یا غزل میری مرضی۔ آئندہ مجھے روکنے کی کوشش کی، تو گلا دبا کر مار دوں گا تجھے۔"

میرب کو اپنی ماں کے ساتھ بدتمیزی کرتا دیکھ کر بازل حسین نے میرب کے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ غصے سے تھر تھر کانپتی میرب نے بازل حسین کو کئی بار پٹخا جس کے نتیجے میں بازل حسین کا سر پھٹ گیا۔ ان کی چیخیں سن کر سب لوگ ان کے پاس آ گئے۔ میرب اب اپنے آپ کو بے رحمی سے پیٹ رہی تھی۔ ان لوگوں نے میرب کو رسی سے باندھ کر بستر پر ڈال دیا۔ میرب گالیاں بکتے بکتے گانا گانے لگی۔ پھر گاتے گاتے سو گئی۔

☆......☆......☆

اچھی عادات کی مالک اور نیک پارسا عورت کسی فقیر کے گھر میں بھی ہو تو اسے بادشاہ بنا سکتی ہے۔ میرب کی شدت بڑھتی گئی۔ اب وہ گندے گندے گانے گانے لگی تھی۔ گھر والے روکتے تو وہ ان کی پٹائی کر دیتی۔

گھر والوں نے میرب کا علاج کئی اچھے ڈاکٹرز سے کروایا۔ لیکن کوئی بھی ڈاکٹر یہ بتانے سے قاصر تھا کہ میرب کو کیا بیماری ہے؟"

"لوگوں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے میرب کے والدین نے کئی تانترکوں کو بھی دکھایا۔ مگر وہ بھی یہی کہتے کہ اس لڑکی پر کسی طاقتور بدروح کا سایا ہے۔ جسے ہم بس میں نہیں کر پائیں گے۔"

☆......☆......☆

گہری باتیں سمجھنے کے لیے گہرا ہونا پڑتا ہے۔ گہرا ہونے کے لیے گہری چوٹیں کھانی پڑتی ہیں۔ ایک دن بازل حسین کے گھر چوہدری انس آئے۔ جو ان کے بہت اچھے دوست تھے۔ انہیں دیکھ کر میرب ہنسنے لگی اور گانا گانے لگی۔

"میں کیا کروں، ہائے مجھے بڈھا مل گیا۔"

چوہدری جی نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور وہاں سے جانا چاہا تو بازل حسین نے انہیں تفصیل سے میرب کے بارے میں بتایا۔ تو چوہدری انس میرب کو غور سے دیکھنے لگے۔ میرب چلاتے ہوئے بولی۔

"قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے بڈھے اور میری جان من کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ آنکھیں نکال کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔" چوہدری انس بازل حسین کو دوسرے کمرے میں لے گئے اور بولے۔

"میرب بیٹی پر کسی بدروح نے قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ ایک بار میرے کہنے پر ڈاکٹر آصف مغل صاحب کو دکھا دیجیے۔ اللہ کے حکم سے میرب ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ہم بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں۔ بھلا ڈاکٹر آصف مغل کیا کر پائیں گے۔ میرب پر تو بدروح کا سایا ہے۔"

بازل حسین نے مایوسی سے کہا۔

ڈاکٹر آصف محمود مغل صاحب روحانی علاج بھی کرتے ہیں۔ اور کئی لوگوں کو ٹھیک بھی کر چکے ہیں۔ ایک بار انہیں دکھانے میں کیا حرج ہے؟" چوہدری انس نے سمجھایا۔

☆......☆......☆

اگلے ہی دن بازل حسین میرب کو ڈاکٹر آصف محمود

مغل کے پاس لے گئے۔ وہاں کافی بھیڑ تھی۔ ڈاکٹر آصف محمود مغل اپنے کمرے میں شاگردوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے مریض دیکھ رہے تھے۔ میرب شور مچانے لگی۔ اور ڈاکٹر آصف محمود مغل نے اس کا نمبر آنے سے پہلے ہی اُسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بازل حسین اور چوہدری انس کھڑے رہے۔ ڈاکٹر آصف محمود مغل نے بڑے پیار سے میرب کو اپنے پاس بٹھالیا۔ میرب انہیں دیکھ کر گانا گانے لگی۔

دوری نہ رہے کوئی آج اتنا قریب آؤ
میں تم میں سما جاؤں تم مجھ میں سما جاؤ

ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا تم تو بہت اچھا گاتے ہو۔ تمہیں تو فلموں کے لیے گانا چاہیے تھا۔'' یہ سن کر میرب غمگین ہوگئی۔

''آج میں فلموں میں گلوکار ہوتا۔ لیکن شراب نے میری زندگی برباد کردی۔'' اتنا کہتے ہوئے میرب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھ کر اس نے کہا۔

''سات ماہ پہلے کی بات ہے، لاہور کے شالامار باغ کے پاس میں نے ایک ہوٹل میں شراب پی۔ پھر نشے کی حالت میں اسکوٹر چلانے لگا۔ کلمہ چوک کے پاس ایک کار سے اسکوٹر ٹکرایا اور میں وہیں سڑک پر مر گیا۔ چونکہ میری عمر پوری نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میری روح بھٹکنے لگی۔ گانا گانے کا شوق مرنے کے بعد بھی نہیں چھوٹا۔ ایک دن میں بھٹکتے بھٹکتے پنجاب یونیورسٹی کے پاس سے گزرا۔ رکشہ میں بیٹھی میرب دھیمی دھیمی آواز میں گیت گا رہی تھی۔ بس تب ہی میرب کے پیچھے لگ گیا۔ اور اُسی رات جب میرب سو رہی تھی میں اس کے جسم میں سما گیا۔''

''اسے چھوڑ دو تو میں تمہیں آزادی دلاؤں گا۔'' کہتے ہوئے ڈاکٹر آصف محمود مغل نے اپنے شاگردوں کو اشارہ کیا۔ شاگرد نے تھالی میں رکھا کالا دھاگہ اٹھا کر جھٹ سے میرب کی ہتھیلی پر باندھ دیا۔ دھاگہ بندھنے سے میرب کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ پہلے وہ چیخی چلائی اور پھر رونے لگی اور بولی۔

''مجھے اس سے الگ مت کرو۔ میں اس کے بنا نہیں رہ پاؤں گا۔'' ڈاکٹر آصف محمود مغل نے فرش پر رکھا بھورا بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

''اگر اسے آسانی سے نہیں چھوڑو گے تو میں تمہیں اپنے پاس رکھ لوں گا۔ ورنہ جلا کر راکھ کردوں گا۔'' میرب تڑپنے لگی۔ بری طرح رونے لگی۔ ڈاکٹر آصف محمود مغل کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

''مجھے مت جلاؤ، میں آپ کی ساری باتیں مانوں گا۔'' کہتے کہتے میرب کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

ڈاکٹر آصف محمود مغل نے وہ بیگ بند کر کے اپنے شاگرد کو دے دیا۔ کچھ دیر بعد میرب کو ہوش آیا تو وہ حیرت سے سب کو دیکھنے لگی۔

''کیسی ہو میرب؟'' ڈاکٹر آصف محمود مغل نے مسکراتے ہوئے میرب سے پوچھا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی اور بولی آپ کون ہیں؟ میں یہاں کیسے آئی؟''

ڈاکٹر آصف محمود مغل نے بازل حسین سے کہا۔

اب میرب بالکل ٹھیک ہے آپ اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔'' بازل حسین نے کہا۔

''اگر وہ پھر سے آ گیا تو؟'' ڈاکٹر آصف محمود مغل نے کہا۔

''ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ بازل صاحب! ہمارے بیگ سے کوئی بھی آزاد نہیں ہو پاتا۔ وہ گویا پوری عمر ہونے تک بیگ میں ہی قید رہے گا۔ اور بیگ میں بند دوسرے ساتھیوں کو گانے سناتا رہے گا۔ پارٹی مناتا رہے گا۔''

بازل حسین میرب کو گھر لے آئے۔

پھر جب عادل کو ڈاکٹر آصف محمود مغل نے پوری بات بتائی تو اُسے یقین ہوگیا کہ میرب بے قصور تھی۔ عادل میرب کو اپنے گھر لے گیا۔ اور ایک خوشگوار زندگی کی ابتداء کی۔ دو ماہ میرب کے ساتھ رہنے کے بعد عادل دوبئی چلا گیا۔

جب ناخن بڑھ جائیں تو ناخن ہی کاٹیں جاتے ہیں انگلیاں نہیں۔

بالکل اسی طرح جب رشتوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو غلط فہمیاں ختم کرنی چاہئیں۔ رشتے نہیں......

☆☆......☆☆



برگد والا مکان



منشی محمد عزیز میمن

جب اُس عورت کی بھٹکتی روح کو قرار ملا تو......

اس وقت میں دولت آباد کے اسٹاپ پر اترا۔ اس وقت شام کا اندھیرا مکمل طور پر پھیل چکا تھا۔ اس اسٹاپ پر اترنے والا میں واحد شخص تھا۔ بس آگے چلی گئی اور میں نے دولت آباد جانے والی کچی پگڈنڈی



نما سڑک پر اپنے قدم بڑھا دیے۔ بات اصل میں کچھ یوں تھی کہ ہماری بستی عالم پور میں ایک شخص اللہ وسایا ماچھی فوت ہوگیا تھا اور میں اس کی اطلاع دینے دولت آباد جا رہا تھا۔ کیونکہ اس کے کچھ رشتے دار دولت آباد میں رہتے تھے اور اس کی ایک بیٹی بھی دولت آباد میں بیاہی ہوئی تھی۔

ان دنوں آج کے دور کی طرح پیغام رسانی کی سہولیات اس قدر تیز ترین نہیں تھیں۔ آج کل تو منٹوں ہی میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک خبر پہنچ جاتی ہے۔ ان دنوں ایسی سہولیات کے بارے میں سوچنے والا بھی احمق معلوم ہوتا تھا اور دیہی علاقوں میں تو ایسی سہولیات کا تصور بھی نہ تھا۔

میں سر جھکائے تیزی سے دولت آباد کی طرف محو سفر تھا۔ وہ سردیوں کے دن تھے اور سردی اپنے جوبن پر تھی۔ چلتے چلتے میں نے سر اٹھا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو آسمان بادلوں سے مکمل ڈھکا ہوا تھا۔

اچانک تیز ہوا میرے جسم سے ٹکرائی اور گویا میں سن ہوگیا۔ یخ بستہ ہوا کے ساتھ بارش بھی تھی اور میں بھیگنے لگا۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا تاکہ کہیں کوئی جائے پناہ مل سکے۔ چلتے چلتے ایک مکان دکھائی دیا۔

اگر اندھیرا ہوتا تو وہ مکان بھی شاید میری نظروں سے اوجھل رہتا لیکن اچانک آسمانی بجلی چمکی اور مجھے وہ مکان دکھائی دیا۔ میں بھاگ کر اندر داخل ہوگیا۔

مکان کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر ایک کمرے میں مجھے روشنی محسوس ہوئی تو میں اُسی طرف لپکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آواز لگائی۔

''کوئی ہے؟'' میری آواز بازگشت کی صورت مجھے واپس سنائی دی۔ اس کے علاوہ ہر سو پراسرار سناٹا تھا۔ بارش اب کھل کر برسنے لگی تھی۔ اگرچہ میں نے کوٹ بھی پہن رکھا تھا اور ایک موٹا سا کمبل بھی میرے اوپر تھا۔ اس کے باوجود سردی سے میرے دانت بج رہے تھے۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور جس کمرے کی درزوں سے روشنی آ رہی تھی، اس کمرے کے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں ایک انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔

''صد شکر ہے، ارے مرے مالک۔'' میں نے اللہ کے حضور شکرانے کے طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور پھر ایک زوردار آواز لگائی۔

''بھائی صاحب! کوئی ہے؟'' لیکن میری اس پکار کے باوجود بھی خاموشی رہی، تو مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا، لیکن میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا اور میرے دل سے خوف جاتا رہا۔

کم و بیش ایک گھنٹہ بارش مسلسل برستی رہی۔ اس کے بعد ہوتے ہوتے بالکل رُک گئی۔ تب تک میری سردی بھی دور ہو چکی تھی۔ میں نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ آسمان ابھی تک بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

میں اس کمرے سے باہر نکل آیا اور ساتھ والے کمرے کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ بھی چرر...... کی آواز نکالتا ہوا کھلتا چلا گیا، لیکن اندر کا منظر دیکھ کر میری بے ساختہ چیخیں نکلتی چلی گئیں۔

اندر کمرے میں ایک پھندے کے ساتھ کسی کی لاش لٹکی ہوئی تھی۔ یقیناً صاحبِ خانہ نے کسی مجبوری میں رسّی کو گارڈر کے ساتھ باندھ کر خودکشی کی ہے۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں اس قتل کے الزام میں پھنس جاتا۔ اور یہی سوچ کر میں باہر کی طرف بھاگا اور کسی چیز سے ٹکرا کر بے ہوش ہوگیا۔

جب ہوش آیا تو میں اُسی مکان کے صحن میں پڑا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت بے ہوش رہا، کیوں کہ میرے پاس کوئی گھڑی وغیرہ نہیں تھی۔ ان دنوں ہم لوگ زیادہ تر ستاروں کی مدد سے وقت کا تعین کرتے تھے۔ (بلکہ دیہی علاقوں میں آج بھی بوڑھے بڑے بزرگ ایسی نشانیوں کی مدد سے درست وقت کا اندازہ لگا لیتے ہیں) آسمان پر چونکہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

اسی لیے مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن جب مجھے ہوش آیا تو مجھے کسی عورت کے رونے کی آواز آتی محسوس ہوئی اور یہ آواز اُسی کمرے سے

آ رہی تھی۔ جہاں میں نے کوئلے کی انگیٹھی دیکھی تھی۔

میں نے اپنے گلے میں موجود تعویذ پر ہاتھ لگایا تو تعویذ موجود تھا۔ یہ تعویذ ہمارے مرشد نے دیا تھا اور اس کی موجودگی نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ میں نے پھر ایک بار آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی اور آہستہ آہستہ اُس کمرے کی طرف چلنے لگا، جہاں سے کسی عورت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ رونے والی عورت، اس مرنے والے (خودکشی کرنے والے) شخص کی بیوی ہوگی۔ یقیناً شام کو ان دونوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہوا ہوگا اور مرد نے غصے میں آ کر خودکشی کر لی ہوگی اور یہ عورت اس کی وجہ سے رو رہی ہے۔ کیوں کہ اس کے شوہر نے خودکشی کر لی ہے۔

جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک لڑکی سر جھکائے رو رہی ہے۔ میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں سے مجھے بہت خوف محسوس ہوا میں نے کہا۔

''بہن جی! اب رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہی اللہ کی رضا تھی۔'' میرے ان الفاظ پر اُس لڑکی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، اس وقت وہ مجھے کوئی بلا لگ رہی تھی۔

''دیکھو بہن!'' میں نے پھر اُس سے کہا۔

''مجھے اپنا بھائی سمجھو اور اگر میرے لائق کوئی کام ہے تو میں حاضر ہوں۔''

''اگر تم مجھے بہن نہ کہتے تو میں تمہیں اس کا مزہ چکھاتی۔'' اس کی سنسناتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تم نے مجھے اپنی بہن کہا ہے اس لیے جاؤ معاف کیا۔''

''لیکن......'' اگرچہ میں اس کی اصلیت سے کچھ کچھ واقف ہو چکا تھا، لیکن پھر میں نے بھی اپنے حواس کو قائم کیا۔ پھر نہ جانے اس...... لڑکی کو کیا ہوا وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو ایک ڈائری نما کاپی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بظاہر وہ ڈائری بوسیدہ ہو چکی تھی، لیکن جب اس نے وہ ڈائری میرے حوالے کی اور میں نے اُسے کھول کر دیکھا تو اس میں درج تحریر پڑھی جا سکتی تھی۔

''بہتر یہی ہے کہ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس پراسرار روح کی آواز مجھے سنائی دی۔

''اور بہتر یہی ہوگا کہ کسی کو میرے بارے میں مت بتانا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آیا۔ لیکن اُس کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور میں نے بھی وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت جانی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''اللہ حافظ بہن جی۔'' میں نے الوداعی کلمات کہے اور اُس پراسرار مکان سے باہر نکل آیا۔ بارش نہ جانے کب کی تھم چکی تھی اور مطلع صاف تھا۔ میں نے اُوپر آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی تو آسمان پر جگمگاتے ستاروں نے مجھے گویا نئی طاقت بخش دی اور میں کشاں کشاں دولت آباد کی جانب چل دیا۔

☆......☆......☆

جب میں دولت آباد کے قریب پہنچا تو انسانوں سے قبل کتوں نے میرا استقبال کیا۔ اور کچھ کتے اس معاملے میں اس قدر پُرجوش تھے کہ وہ میرے قدموں کو چومنا چاہتے تھے، لیکن میں نے راستے میں سے ایک چھوٹی سی چھڑی نما لکڑی اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لی تھی کیوں کہ میں بخوبی جانتا تھا کہ سردیوں میں اتنی رات گئے یقیناً یہ مرحلہ مجھے درپیش ہوگا۔

''جاگتے رہنا۔'' کی صدا نے کتوں کی 'محبت' کو اور بڑھا دیا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش خروش کا مظاہرہ کرنے لگے۔ وہ یقیناً اپنی زبان میں گاؤں کے چوکیدار کو بتا رہے ہوں گے کہ ہم نے اس چور کو پکڑ لیا ہے اور تب ہی وہ چوکیدار ہاتھ میں لالٹین لیے تیزی سے میری جانب لپکا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور قریب تھا کہ وہ مجھے کوئی چور یا ڈاکو سمجھ کر حملہ آور ہوتا میں نے کہا۔

''چوکیدار بھائی میں مسافر ہوں اور کریم بخش ماچھی کے گھر جانا ہے۔'' تب وہ چوکیدار میرے سر کے قریب پہنچ کر لالٹین کی مدد سے میرا معائنہ کرنے

لگا۔

’’کہاں سے آرہے ہو؟‘‘ چوکیدار نے پولیس کے انداز میں مجھ سے پہلا سوال کیا۔

’’بھائی میں عالم پور سے آیا ہوں اور چاچے اللہ وسایا ماچھی کا ہمسایہ ہوں۔ میرا نام ظفر ہے اور میں ادھر کریم بخش کو فوتگی کی اطلاع دینے کے لیے آیا ہوں۔‘‘ میں نے اُسے مفصل انداز میں اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ مگر چوکیدار مطمئن نہ ہوا۔

’’رات کے اس پہر تم کہاں سے آرہے ہو؟‘‘ چوکیدار نے کسی تفتیشی افسر کی طرح مجھ سے پھر سوال کیا تو میں نے اُسے بتایا۔

’’بھائی صاحب! شام کی بس سے دولت آباد اسٹاپ پر اترا تو موسم خراب ہو چکا تھا اور اس عرصے میں میں نے برگد والے مکان میں پناہ لی تھی۔‘‘

’’کیا!‘‘ چوکیدار کی گویا چیخ نکل گئی اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور لالٹین میرے چہرے کی طرف کر دی۔ ’’تم نے اس برگد والے مکان میں پناہ لی تھی؟‘‘ اس نے تصدیق چاہی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’ناممکن۔‘‘ چوکیدار ’میں نہ مانوں‘ کی عملی تصویر بنا کھڑا تھا۔

’’او بھائی، مان جاؤ۔‘‘ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ’’میں نے واقعی اس مکان میں پناہ لی ہے کیوں کہ اریب قریب کوئی اور تو جائے پناہ تھی نہیں۔‘‘

’’اور تم اس مکان سے زندہ سلامت باہر آ گئے؟‘‘ چوکیدار نے کہا تو میں نے جواب دیا۔

’’الحمد اللہ میں اس وقت تمہارے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں، میں روح تھوڑی ہوں۔‘‘

’’اچھا چلو!‘‘ چوکیدار بادل نخواستہ بولا۔ ’’کریم بخش ماچھی کے گھر کا پتا معلوم ہے ناں؟‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ کتے اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے موجود ہونے کی اطلاع دیتے تھے لیکن فاضل نامی چوکیدار نے اپنی لاٹھی کی مدد سے انہیں دور بھگا دیا۔

اور خود لالٹین لے کر میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کریم بخش کے گھر کے سامنے پہنچ کر جب میں نے دروازے پر دستک دی تو ساتھ ہی چوکیدار نے بھی بلند آواز سے کہا۔

’’اوئے کریم بخشا! باہر آؤ تمہارا مہمان آیا ہے۔‘‘ تھوڑی دیر بعد اندر کھسر پھسر ہوتی رہی۔ پھر کریم بخش باہر نکلا تو چوکیدار نے لالٹین کی مدد سے میری طرف اشارہ کیا۔ ’’اس آدمی کو جانتے ہو؟‘‘ کریم نے میری طرف دیکھا تو شاید الجھن میں پڑ گیا۔

’’کریم بھائی میں ظفر ہوں۔ ظفر جیٹھول، چاچا اللہ وسایا کا ہمسایہ۔‘‘ میں نے اپنا تعارف کروایا تو کریم بخش تیزی سے میری طرف لپکا۔

’’ارے ظفر بھائی!! آپ خیریت تو ہے نا۔ اتنی رات گئے۔‘‘

’’بس بھائی کیا بتاؤں موسم کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔‘‘ اس سے پہلے کریم بخش کوئی بات کہتا تو چوکیدار نے کہا۔

’’لو میاں کریم بخش! اب تم اپنے مہمان کو سنبھالو، میں تو چلا اپنی نوکری پر۔‘‘

’’اچھا فاضل بھائی۔‘‘ کریم بخش نے کہا۔ ’’بہت شکریہ جو آپ نے میرے مہمان کا اتنا خیال رکھا۔‘‘

’’ذرا دھیان سے رہنا۔‘‘ چوکیدار نے جاتے جاتے پُرمزاح انداز میں کہا۔ ’’تمہارا مہمان برگد والے مکان میں رہ کر آیا ہے۔‘‘

چوکیدار تو چلا گیا تو کریم بخش مجھے اندر لے گیا۔ ایک کمرے میں اس کے بیوی بچے سو رہے تھے، وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا اور مجھے بٹھا کر لالٹین جلا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تاکہ میری خاطر مدارت کا بندوبست کر سکے۔ میں نے اُسے آواز دی۔

’’کریم بھائی بہن زینت کو سونے دو میں گھر سے کھا پی کر آیا ہوں۔ آپ آئیں ہم تھوڑی دیر باتیں کریں گے پھر سو جائیں گے۔ لیکن اس نے میری

ایک نہیں سنی اور اپنی بیوی زینت کو بیدار کر کے کہنے لگا۔

’’ارے اللہ کی بندی! تمہارے میکے سے مہمان آیا ہے اور تم سو رہی ہو۔‘‘ زینت نے پوچھا۔

’’میرے میکے سے اس وقت!‘‘

کریم بخش کہنے لگا۔ ’’اپنا ظفر آیا ہے چاچا جی کا ہمسایہ۔‘‘

’’کیا۔‘‘ زینت چونک پڑی۔ ’’ظفر بھائی آئے ہیں؟‘‘

’’یہی تو کب سے کہہ رہا ہوں۔‘‘ کریم بخش کا غصہ مصنوعی تھا۔ ’’جناب کو کب سمجھ آئے گی۔‘‘

زینت تیزی سے اس کمرے میں آئی۔ جس کمرے میں، میں بیٹھا تھا اور دیہی رسم و رواج کے مطابق اس نے میرے آگے سر جھکا دیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

’’ظفر بھائی اماں ابا کیسے ہیں؟ اماں حاجرہ کیسی ہیں۔ سارے گاؤں والوں کے کیا حال احوال ہیں؟‘‘ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے اور میں ہنس پڑا۔

’’سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تمہیں سلام کہہ رہے تھے۔‘‘ اس نے آٹا گوندھنے سے لے کر روٹی پکانے تک بھی مختلف سوال کر ڈالے اور میں اپنے جواب سے اُسے مطمئن کرتا رہا۔ مجھے اپنی روٹی یا سونے کی کوئی فکر نہیں تھی لیکن بات اصل میں کچھ یوں تھی کہ اگر میں اس وقت اللہ وسایا کی موت کی خبر زینت کو دے دیتا تو وہ اُسی وقت دولت آباد سے عالم پور جانے کی ضد کرتی اور اُس وقت کسی بھی طرح عالم پور جانا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ بات میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس دنوں ذرائع آمد و رفت، بالخصوص چھوٹے قصبوں اور دیہی علاقوں میں بہت کم تھے۔ عالم پور سے دولت آباد جانے کے لیے میں گھر سے تقریباً دن کے ایک بجے نکلا تھا اور شام بلکہ رات گئے دولت آباد کے بس اسٹاپ پر اترا تھا۔ اور یہ سب آمد و رفت کے ذرائع سست ہونے کے سبب تھا۔

زینت نے اپنی حیثیت کے مطابق میری بھرپور خدمت کی۔ کریم بخش بھی ایک سلجھا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ ورنہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو اپنی بیوی کے میکے علاقے سے آنے والے ہر شخص کو اپنی بیوی کا عاشق اور محبوب سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے گھٹیا لوگوں کی سوچ پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ خیر زینت تو کھانا کھانے کے بعد بھی گپیں لگانے کے موڈ میں تھی لیکن کریم بخش نے اُسے سمجھایا۔

’’بھلی لوکے! ظفر بھائی اتنا سفر کر کے تھک گیا ہے۔ اب تم آرام سے سو جاؤ، دن چڑھے خوب رج کے باتیں کرنا۔‘‘

کریم بخش نے علیحدہ کمرے میں اپنا اور میرا بستر لگوایا اور پھر مجھ سے کہا۔ ’’لو ظفر بھائی! آپ بھی تھک گئے ہوں گے۔ اب آرام کرو۔ باقی باتیں کل کریں گے۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے کریم بھائی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن میرا آپ تک آنے کا ایک خاص مقصد ہے۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘ کریم بخش نے سوال کیا تو میں نے چاچا اللہ وسایا کی موت کی خبر اُسے دی۔ جسے سن کر اُسے بہت صدمہ پہنچا۔ لیکن جلد ہی اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

’’بہت شکریہ ظفر بھائی۔‘‘ اس کے منہ سے تھوڑی دیر کے بعد نکلا۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی اور یہ بھی آپ نے اچھا کیا جو زینت کے سامنے یہ بات نہیں کہی۔

’’یہ بات تو میں بھی سمجھتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’زینت بہن کو اپنے والد کی وفات کا پتا ابھی چل گیا تو وہ اسی وقت عالم پور جانے کی ضد کرنے لگے گی۔‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ کریم بخش نے میری تائید کی۔ ’’خیر اب آپ بھی سو جائیں۔ صبح پہلی بس سے ہی نکل جائیں گے۔‘‘

☆......☆......☆

صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی دیہی زندگی بیدار ہو جاتی ہے۔ اس دن بھی اذانوں کے ذرا بعد میری آنکھ کھل گئی۔ صحن میں زینت کے بین کے ساتھ رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بستر سے نکا[illegible]

کے پاس تسلی دینے کے لیے گیا لیکن میرے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جلد ہی چاچا اللہ وسایا کی موت کی خبر پوری بستی میں پھیل گئی۔

ہمسایوں نے کریم بخش سے کہا۔

''کریم بھائی آپ جلد از جلد بھرجائی کو لے کر عالم پور پہنچیں۔ آپ کے ڈھور ڈنگر اور گھر بار کو ہم سنبھال لیں گے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔'' اور پھر ہم لوگ پہلی بس سے ہی عالم پور روانہ گئے۔

☆......☆......☆

چاچا اللہ وسایا کے سوئم سے فارغ ہو کر میں نے وہ ڈائری کھولی۔ جو مجھے اُس پراسرار مکین نے دی تھی۔ یہ بات تو میں سمجھ چکا تھا کہ اس لڑکی کا تعلق جنات وغیرہ سے تھا لیکن اصل حقیقت شاید اُس ڈائری میں لکھی تھی۔ تب ہی اُس پراسرار لڑکی نے وہ ڈائری مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میری مدد کرو۔ وہ ڈائری بظاہر تو بوسیدہ تھی لیکن اُس میں لکھی تحریر با آسانی پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ ڈائری دس سال پرانی تھی اور اُس میں مختلف تاریخیں درج تھیں۔ آخری تاریخ چار سال پرانی تھی۔ میں نے وہ ڈائری پڑھنی شروع کر دی۔

''میرا نام شمع ہے۔ میں اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ میرے والد کی تھوڑی سی زرعی اراضی تھی، جس سے ہونے والی آمدن سے ہماری گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ چند ڈھور ڈنگر بھی تھے۔ جب پانچ سال کی ہوئی تو پاس والے گھر میں باجی رشیدہ سے قرآن پاک پڑھنے لگی۔ اللہ کا شکر ہے کہ پڑھنے کا ویسے بھی شوق تھا، باجی جتنا سبق دیتیں اس سے کچھ زیادہ ہی یاد کر لیتی، باجی مجھ سے بہت خوش تھیں اور اکثر کہتی تھیں۔'' میری ساری شاگرد لڑکیوں میں ایک تجھ ہی سے میں خوش ہوں۔ باقی سب تو نکمی، کند ذہن اور کام چور ہیں۔''

لیکن جب میں دس سال کی ہوئی تو اس عرصے میں مجھ سے چار چھوٹے بہن بھائی اور آ چکے تھے۔ اور میری ماں مجھے ان کے کام دھندوں میں الجھائے رکھتی، کبھی کسی کو نہلانا کبھی کسی کے کپڑے تبدیل کرنا۔ میری ماں کھیت اور جانوروں کے کام میں ابا کے ساتھ مصروف رہتی تھیں اور بہن بھائیوں کو نہلانا دھلانا اور ان کی دیکھ بھال ساری میری ذمہ داری تھی اور چھوٹے بچوں کے گندے کاموں سے مجھے نفرت تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نفرت اور بڑھنے لگی۔ میں ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتی تھی اور کبھی کسی بہن اور کبھی کسی بھائی کی ٹھکائی کر دیتی۔ اگر کوئی بہن بھائی اماں ابا سے میری شکایت کرتا تو مجھے زیادہ غصہ آتا اور میں موقع ملنے پر اُن کی خوب خبر لیتی۔ قرآن مجید اگرچہ میں ناظرہ پڑھ چکی تھی، لیکن چھوٹے بہن بھائیوں کے کاموں میں اتنی مگن ہوئی کہ نماز پڑھنے اور قرآن مجید کی تلاوت سے بھی گئی۔ میرے والدین ویسے بھی ان پڑھ تھے۔ اور ان کے نزدیک محض کلمہ پڑھ لینے سے ہی انسان مکمل بن جاتا ہے۔ میری استانی نے ہمارے مذہب اسلام سے مطابق بنیادی باتیں مجھے سمجھا دی تھیں اور میں کبھی کبھار کسی غلط بات پر اماں ابا کو بھی ٹوک دیا کرتی تھی۔ جس پر وہ استہزائیہ انداز میں مجھ پر ہنستے کہ اب ہماری بیٹی ہمیں سمجھانے لگی ہے۔ لیکن ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ غصہ تو مجھے بھی ان پر بہت آتا جو ہر سال دو سال کے بعد ہمارے گھر میں ایک آدھ فرد کا اضافہ وہ ضروری سمجھتے تھے۔ دیگر حقوق فرائض کی انہیں قطعاً خبر نہ تھی۔ بہر حال ماحول اور وقت نے مجھے بہت مایوس کر دیا اور بچوں سے تو مجھے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا۔ اگر کہیں راستے میں کسی ہمسائے کا بچہ روتا ہوا مل جاتا، تو مجھے اُس پر شدید غصہ آتا اور میں ایک آدھ ہاتھ اُسے جڑ دیتی۔ جس پر وہ اور زور زور سے رونے لگتا اور مجھے گویا سکون مل جاتا۔

اسی اٹھا پٹخ اور دھینگا مشتی میں، میں جوان ہو گئی اور ارد گرد قریب سے میرے لیے رشتے آنے لگے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں۔ میں چار جماعتیں اور قرآن مجید پڑھ چکی ہوں اور یہ گویا میری اضافی خوبی تھی۔ شاید اسی خوبی کو دیکھتے ہوئے میرے لیے اشرف کا رشتہ آیا۔ ہمارے یہاں برادری سے باہر شادی کرنے کا رواج بہت ہی کم تھا اور اشرف بھی برادری سے باہر کا لڑکا تھا۔ اس لیے شاید یہ رشتہ بھی نہ ہو پاتا، لیکن اس میں بھی ایک بہت بڑی ''اضافی خوبی'' تھی اور وہ تھی دولت کی، وہ لوگ ہماری نسبت کافی امیر تھے۔ اشرف سے دو بڑے بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں اور ان کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اشرف ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا۔

ایک دو بار کے رسمی انکار کے بعد میرے والدین نے رشتے کے لیے ہاں کر دی اور یوں میں بیاہ کے اشرف کے گھر آ گئی۔ اشرف کے والد اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اشرف سے بڑے اختر بھائی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھے۔ سب سے بڑے انور کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ان لوگوں کی بڑی سی ایک حویلی تھی۔ جس کا ایک حصہ انور، ایک حصہ اختر اور تیسرا حصہ اشرف کے پاس تھا۔ اشرف کی والدہ سلیمہ خالہ کا سارے خاندان پر رعب و دبدبہ تھا اور ان کی بات حرف آخر سمجھی جاتی تھی۔

شادی کے ابتدائی سال تو بڑے پُرسکون انداز میں گزرا۔ اختر اور انور کے اپنے علیحدہ علیحدہ کاروبار تھے۔ اور انہوں نے گھریلو کاموں کے لیے ملازمین رکھے ہوئے تھے۔ اشرف کے بھی دو تین ملازم تھے۔ جو کہ گھر کے سارے کام کاج کرتے تھے۔ گویا میں تو جہنم سے نکل کر جنت میں آ گئی تھی۔ اشرف رسالے وغیرہ پڑھنے کا بھی شوقین تھا اور میں بھی چونکہ سارا دن فارغ ہوتی تھی۔ اس لیے رسالوں میں دلچسپی لینے لگی اور مطالعے کے شوق کی وجہ سے ہی اس قابل ہوئی کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کے فن سے بھی آشنا ہو گئی۔ وگرنہ تو صرف قرآن پاک کی تلاوت تک میرا پڑھنا محدود تھا۔

خیر سال بھر کے بعد میری ساس نے دبے لفظوں میں بچے کا تقاضا شروع کر دیا۔ میں نے کہا۔

''ارے خالہ! آپ کے لیے بچوں کی کون سی کمی ہے۔ بھائی انور اور اختر کے ماشاء اللہ اتنے بچے ہیں اور آپ کو ابھی سے ہماری فکر لگ گئی ہے۔''

''ارے واہ!'' سلیمہ خالہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''اختر اور انور کے تو بچے ہیں لیکن میرا اشرف خدانخواستہ تک تب اکیلا رہے گا۔''

''ارے کیوں خالہ۔'' میں نے انہیں بہلانا چاہا۔ لیکن ابھی تو مشکل سے ہماری شادی کو ایک سال ہوا ہے۔ کون سا صدیاں گزر گئی ہے۔ جو آپ یوں واویلا کر رہی ہیں۔''

''بس بیٹا مجھے اور کچھ نہیں سننا۔'' سلیمہ خالہ نے گویا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ مجھے جلد از جلد ایک عدد پوتا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے خالہ!'' مجھے ان کی بات سن کر شدید ہنسی آئی تھی، لیکن میں نے جان چھڑوانے کی خاطر گویا حامی بھر لی اور کہا۔ آپ کو ایک کیا ڈھیروں پوتے پوتیاں دوں گی۔ پھر آپ ان کے ناز نخرے برداشت کرتی رہنا۔''

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ اور ہماری شادی کو تین سال ہو گئے۔ اب تو خالہ سلیمہ کی زبان پر ہر وقت ایک ہی رٹ تھی۔ ''مجھے پوتا کب ملے گا؟'' اور میں دل ہی دل میں ہنس دیتی کہ جب مجھے اپنا بچہ اس دنیا میں آنا پسند نہیں، تو ان کے لیے پوتا کیسے آئے گا۔

دراصل بات کچھ یوں تھی۔ جب بھی مجھے اپنے پیٹ کے اندر ایک وجود پلتا محسوس ہوتا تو میں اپنی ایک رازداں نرس کے پاس چلی جاتی تھی اور اس بوجھ سے نجات حاصل کر لیتی تھی۔ لفظ بوجھ پڑھ کر آپ کو یقیناً مجھ پر غصہ آ رہا ہوگا کیوں کہ میں اپنی اولاد کو بوجھ سمجھتی تھی لیکن اس وقت مجھے یہی لگتا تھا کیوں کہ میرے میکے کے حالات میرے سامنے تھے اور اس وجہ سے مجھے بچوں کے نام سے بھی چڑ تھی۔ اور اسی وجہ سے میری اپنی جیٹھانیوں اور کسی ہمسائی سے بات نہیں بنتی تھی۔ کیوں کہ ان عورتوں کا یہ کہنا تھا کہ شادی کے بعد عورت تب تک ادھوری رہتی ہے جب تک اس کا کوئی بچہ نہ ہو جائے۔ اور میرا یہ کہنا تھا کہ میاں بیوی کی محبت تب تک قائم رہتی ہے، جب تک ان کی اولاد نہ ہو۔ جب اولاد پیدا ہو جائے تو عورت کے دل میں اپنے شوہر کی اور شوہر کے دل میں اپنی بیوی کی محبت کم

ہو جاتی ہے اور یہ بات میں نہیں چاہتی۔''

''ارے پگلی عورت۔'' مجھے سمجھانے والی اصرار کرتی۔'' بچوں کی محبت تو اُس پل کی مانند ہے۔ جو میاں بیوی کی محبت کو آپس میں ملاتی ہے، نہ کہ ختم کرتی ہے۔''

''میں اس بات کو نہیں مانتی۔'' میں صاف انکار کر دیتی تو سامنے والی اللہ توبہ کرتے ہوئے میرے پاس سے اٹھ جاتی۔

سلیمہ خالہ نے اشرف پر دوسری شادی کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ اور اشرف نے بھی ہاں کر دی۔ جب اس بات کی خبر مجھے ہوئی تو میں روتی ہوئی اشرف کے پاس گئی۔

''اشرف یہ میں کیا سن رہی ہوں؟''

''کیا سن رہی ہو؟'' اشرف نے میرے سوال کے جواب میں سوال دہرا دیا۔

''میں نے سنا ہے، آپ دوسری شادی کر رہے ہیں؟'' میں روہانسی ہوئی تو اشرف نے محض 'ہاں' کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔

''مگر کیوں؟'' میں چیخ پڑی۔'' کیا میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟''

''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔'' اشرف نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو میں گڑبڑا سی گئی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے پوچھا تو اشرف نے کہا۔

''دیکھو تم بخوبی جانتی ہو میری ماں کو اولاد کی کتنی تڑپ ہے اور تم تو شاید ان کی یہ شرط پوری نہیں کر سکتیں۔''

''لیکن اشرف یہ تو اللہ کی دین ہے۔'' میں نے گویا دلیل سے اُسے قائل کرنا چاہا۔ تو وہ استہزائیہ ہنسی ہنسا اور کہنے لگا۔

''مانا کہ میں تمہاری محبت میں پاگل ہوں لیکن احمق نہیں ہوں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں چونک اٹھی جس پر اشرف نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور کہنے لگا۔

اگر یہ دیر اللہ کی طرف سے ہوتی تو شادی میں دوسری شادی کے لیے کبھی رضامند نہ ہوتا۔ لیکن مجھے تمہاری ساری باتوں کا علم ہو چکا ہے۔ تم شاید مجھے صاحب اولاد نہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ اس سے پہلے کم از کم تین مرتبہ تمہیں میں...... تنبیہ کر چکا ہوں اور مواقع بھی دے چکا ہوں۔'' مجھے گزشتہ باتیں یاد آنے لگیں۔ واقعی اشرف نے مجھے کتنے موقع دیے کہ سیدھے راستے پر آ جاؤ، لیکن میں شاید اُسی راستے کو گلزار سمجھتی تھی جو کہ خار زار تھا۔ اور اب وقت کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔

اشرف کے لیے لڑکی پسند کی جا چکی تھی اور تاریخ بھی طے ہو چکی تھی۔ اشرف نے ایک احسان اور مجھ پر کیا تھا کہ شادی کے بعد بھی وہ ہفتے میں دو تین راتیں میرے ساتھ گزارتا تھا، لیکن میں ہی شاید ناشکری تھی جو کہ اس کے کسی ایک احسان کا بدلہ بھی نہ دے سکی۔

☆......☆......☆

نائلہ کے آ جانے سے میرا وجود سلیمہ خالہ کے لیے بالکل ہی بے معنی ہو گیا۔ نائلہ اشرف کی دوسری بیوی کا نام تھا۔ بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکی تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی وہ خوبیاں بھی مصنوعی اور ریاکاری ہی لگتی تھیں۔ وہ اگرچہ میری بہت عزت کرتی تھی۔ لیکن میں اُسے ہمیشہ حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ اور آج یہ احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں ہی کم ظرف تھی لیکن اب کیا فائدہ......

اشرف اور نائلہ کی شادی کے ایک سال بعد ہی طارق اس دنیا میں آ گیا۔ تو بوڑھی سلیمہ خالہ تو گویا آسمانوں میں اڑنے لگیں۔ طارق کی پیدائش کے موقع پر انہوں نے پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی اور آٹھ دن تک مسلسل ہمارے گھر ہلہ گلہ جاری رہا۔ جس میں سب ہی گھر والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سوائے میرے۔ لیکن کسی کو میری کیا فکر تھی، میں اپنے کمرے کے اندر ہی پڑی رہی۔ پھر اچانک اشرف اندر داخل ہوا۔

''شمع!'' میرے کانوں میں اشرف کی آواز آئی۔ اٹھو! باہر چلو سارے رشتے دار آئے ہوئے ہیں اور تمہارا پوچھ رہے ہیں۔''

''میرے سر میں شدید درد ہے۔'' میں نے بہانہ بنایا۔'' آپ ہی ان سے نپٹ لیں۔'' اور اشرف باہر چلے گئے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اشرف کے گھر میں نائلہ کی عزت و مقام اور بلند ہوتا چلا گیا اور میں کمتر سے کمتر ہوتی چلی گئی۔ ایک دن میں نے اشرف سے کہا۔'' اشرف میں حج پر جانا چاہتی ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اشرف نے خوش ہو کر کہا۔'' انور بھائی بھابی کے ہمراہ جا رہے ہیں۔ ہم بھی چلتے ہیں۔''

پھر انور بھائی اور بھابی کے علاوہ خالہ سلیمہ اشرف اور میں حج پر چلے گئے۔

دورانِ حج جب میں ایک مقام پر گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی چاہتی تھی کہ جب مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیر زمین کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔

میرے کانوں میں آواز آئی۔'' نیچے دیکھو۔'' میں نے جب زمین کی جانب دیکھا۔ تو محسوس ہوا چند ننھے ننھے وجود میرے قدموں سے چمٹے ہوئے ہیں اور میرے قدم گویا آگے اٹھنے سے قاصر ہیں۔ پھر میرے کانوں میں آواز آئی۔

''یہ وہ بچے ہیں۔ جنہیں تم نے اپنے پیٹ کے اندر ہی قتل کر دیا تھا۔'' اور میں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگی۔

☆......☆......☆

حج سے واپس آنے کے بعد گویا میرا دنیا سے ہی دل اچاٹ ہو گیا میں نے اشرف سے کہا۔

''اشرف آپ کے مجھ پر ڈھیروں احسانات ہیں۔ ایک احسان اور کریں۔ میرا ٹھکانہ کہیں اور کر دیں۔ مجھے اب تنہائی اچھی لگتی ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے اُدھر دولت آباد کے قریب میرا ایک مکان ہے۔ تم اُسی میں شفٹ ہو جاؤ۔''

اور یوں میں دولت آباد کے اِس مکان میں آ گئی۔ جس میں مرتے دم تک رہوں گی۔ شاید یہی میرا آخری ٹھکانہ ہے۔ اشرف نے دو میاں بیوی ملازم بھی میرے ساتھ بھیجے تھے۔ یہاں اب میں ان دو ملازمین کے ساتھ اکیلی رہتی ہوں۔ اشرف ایک ڈیڑھ ماہ بعد میرے پاس آ جاتا ہے۔

کبھی کبھار یوں لگتا ہے گویا دنیا ختم ہو گئی ہے۔ میرے لیے......

یہ ڈائری بھی مجھے اشرف دے گیا تھا۔ شاید اسی بات کے لیے کہ میں اپنا سارا ماضی آپ کے سامنے کھول کر رکھ سکوں......''

اس سے آگے ڈائری کے چند اوراق خالی تھے۔ آگے جا کر لکھا تھا۔'' مجھے لگتا ہے کہ اس دنیا اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھے جانا چاہیے، یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ میرے لیے دعا کرنا۔''

ڈائری کے اوراق ختم ہو چکے تھے۔ میرے کانوں میں اس بھٹکتی ہوئی روح کی آواز آئی۔

''میری مدد کرنا۔'' شاید اُس کی سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اُس پُراسرار مکان کے مالک کے متعلق چھان بین کی تو پتا چلا اس کے مالک اشرف اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان کی اولاد اس علاقے سے ہمیشہ کے لیے نقل مکانی کر چکی ہے۔ وہ مکان چونکہ پُراسرار مشہور تھا۔ اور کوئی بھی شخص اُسے خریدنے کو تیار نہ تھا۔ اسی وجہ سے خالی پڑا تھا۔

میں نے شمع کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کروائی اور اُس کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کروائی۔ چند روز بعد جب میں اپنے گھر سے باہر نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے کانوں میں شمع کی آواز آئی۔

''بھائی! آپ کا بہت شکریہ جو آپ نے میری بھٹکی ہوئی روح کو نجات دلائی۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔'' اور میں نے مسکرا کر اُسے دعا دی کہ اللہ تمہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆......☆☆



موت کا کنواں

منعم اصغر

اُس کنویں میں سکہ ڈال کر خواہش پوری ہوتی تھی

مگر کوئی دوسری خواہش کرتا تو اُس کو بلی دینا پڑتی تھی

موہت آج جلدی گھر آ گیا تھا۔ سونم نے اسے دیکھا تو سیدھی اُس کی اور چلی آئی۔

''کیا ہوا موہت جی! جاب ملی کیا؟'' سونم نے پوچھا۔

''نہیں سونی جاب نہیں ملی۔'' موہت مایوس سا تھا۔ سونم بھی پریشان ہوگئی۔ پورے دو ماہ بیت چکے تھے۔ موہت کی جاب چھوٹے اور وہ آج تک مارا مارا پھر رہا تھا مگر اُسے جاب نہیں مل رہی تھی۔

''موہت جی چنتا مت کریں۔ بھگوان سب ٹھیک کرے گا۔'' سونم پھیکا سا مسکرائی تھی مگر موہت خاموش رہا۔

''نہیں سونم بھگوان کچھ ٹھیک نہیں کرے گا، کرنا ہوتا تو اب تک ٹھیک کر چکا ہوتا۔ اب تو اکاؤنٹ میں بھی پیسے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔'' موہت نے کہا اور اُٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

''میں کل ہی مندر جاؤں گی اور پوجا کروں گی۔ بھگوان سب ٹھیک کرے گا۔ آپ فکر مت کریں موہت جی!'' سونم نے ایک نظر موہت پر ڈالی اور گہرا سانس لیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن پھر موہت جاب ڈھونڈنے نکلا تو سونم آرتی کی تھالی لیے مندر آ پہنچی۔

''اے ماتا رانی! ہماری سہائتا کرو۔ یہ کیسی درگھٹنا میں ڈال دیا ہمیں۔'' وہ ساڑی کا پلو سر پہ لیے آنکھیں بند کیے ہاتھ جوڑے دل میں کہہ رہی تھی۔

''ارے سونم تم یہاں؟'' کسی نے پکارا تو سونم نے آنکھیں کھولیں۔

''ارے گائتری تم!'' سونم نے کہا تھا۔

''ہاں میں پوجا کے لیے آئی تھی۔''

''کیا ہوا تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔'' گائتری نے پوچھا تھا۔

''ہاں گائتری! گھر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ موہت جی بھی آج کل بہت پریشان رہتے ہیں۔'' سونم نے اُسے سب بتا دیا۔

''چنتا مت کرو سونم! میرے پاس اس مسئلے کا سجھاؤ ہے۔'' گائتری نرمی سے بولی۔

''پرانے مندر کے پاس ایک پرانا کنواں ہے، جہاں لوگ اپنی اِچھا لے کر جاتے ہیں اور میں نے سُنا ہے کہ ہر اُس اِستری کی منوکامنا پوری ہوتی ہے، جو اپنی اِچھا لے کے جاتی ہے۔'' گائتری نے اُسے بتایا



اور تھوڑی باتیں کرنے کے بعد وہ وہاں سے چلی گئی مگر سونم کے دماغ کی سوئی پرانے کنویں میں اٹک گئی تھی اور اُس نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح سونم نے اپنے لیے ساڑی نکالی، نہا دھو کر مانگ نکال کر اِس میں سندور بھرا اور باہر آ گئی۔ گھر سے پرانے کنویں تک کا سفر اُس نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ پرانے مندر کے پیچھے پہنچتے ہی اسے وہ کنواں نظر آیا۔ اینٹوں کا وہ پرانا کنواں جس کے آس پاس جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کنواں ایک ویران جگہ پر تھا۔ وہ جگہ دیکھ کر اُس کا دل کانپا تھا مگر وہ یہاں تک آ کر واپس نہیں جانا چاہتی تھی، اس لیے وہ آہستگی سے چلتی ہوئی کنویں کے پاس آ پہنچی۔ کنویں کے پاس آتے ہی اس نے اندر جھانکا۔

''آں......'' اندر کنویں کی صورت دیکھ کر وہ اچھل کر پیچھے ہٹی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا، جسم پر کپکپی طاری ہوگئی مگر اس نے ہمت کی اور ایک سکہ کنویں کے اندر پھینکا۔ سکہ پانی کو چیرتا ہوا اندر گم ہوگیا۔ وہ کنویں کے نزدیک آ گئی اور پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

''اے میگھنا دیوی! ہماری سہائتا کرو۔ میں اپنی اِچھا لے کر آئی ہوں۔ میرے پتی کو جلد ہی کوئی کام مل جائے اور ہمارے گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ میں پھر آؤں گی۔'' وہ اونچی آواز میں پرارتھنا کر کے گھر واپس آنے لگی۔ اُسے لگا کہ کچھ انوکھا ضرور ہوا ہے اُس کے ساتھ مگر کیا؟ وہ نہیں جانتی تھی مگر وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ جیسی وہ گھر سے نکلی تھی واپس وہ ویسی نہیں جا رہی تھی کچھ ضرور ہوا تھا۔

☆......☆......☆

اور فقط دو دن ہی تو گزرے تھے۔

موہت خوشی خوشی گھر لوٹا تھا۔ سونم نے اس سے پوچھا۔ تو موہت نے کہا کہ اُسے جاب مل گئی ہے۔'' وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی اور اُس نے کہا۔

'' دیکھا موہت جی! میں نے پرانے کنویں کے پاس جا کر پرارتھنا کی تھی اور آپ کو جاب مل گئی۔''

موہت اس وقت اتنا خوش تھا کہ وہ اُس کی بات پر دھیان نہیں دے سکا مگر سونم کی دیورانی کے چہرے پر سایا سا لہرایا تھا۔

'' اگر ایسا ہے سونم تو بہت بڑی درگھٹنا گھٹنے والی ہے۔'' انہوں نے کہا مگر سونم نے نہیں سنا۔

☆......☆......☆

ایک بار پھر وہ پرانے کنویں کے پاس موجود تھی۔ اس بار اس نے کہا تھا کہ اُن کے پاس بہت سے پیسے آ جائیں۔''

اس نے سکہ اندر ڈالا اور واپس مڑی تو اچھل پڑی۔ سامنے ویسا ہی کنواں موجود تھا جو پیچھا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے گلے میں کانٹے اُگ آئے ہوں۔ اُس نے دوسری غلطی یہ کر دی کہ کنویں کا پانی پی لیا اور آہستہ آہستہ واپس جانے لگی۔ تھوڑا آگے گئی تو اُسے لگا جیسے کوئی اُس کے پیچھے آ رہا ہو۔ اُس نے یک دم مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ وہ بھاگنے لگی اُسے احساس ہوا کہ کچھ غلط ضرور ہوا ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے گھر آئی اور کمرے میں گھس گئی۔

☆......☆......☆

تین دن بعد اس کی طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی تھی ورنہ وہ دو دن تک سخت بخار میں جلتی رہی تھی اور تین دن بعد اُس کی یہ اِچھا بھی پوری ہو گئی تھی۔ موہت کو بہت سارے پیسے ملے تھے، کہاں سے؟ یہ کوئی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ تاہم سونم کی دیورانی نرملا کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ کوئی بہت بڑی مصیبت آئے گی۔

موہت بہت خوش تھا اس نے اِن پیسوں سے گھر خریدا اور وہ وہیں شفٹ ہو گئے اور یہ دیکھ کر سونم مزید خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اُن کا یہ گھر پرانے کنویں کے نزدیک تھا۔

ایک رات وہ پانی پینے رسوئی گھر میں آئی تو وہاں موہت بھی موجود تھا۔ وہ حیران سی ہوئی۔

'' موہت جی آپ یہاں؟'' اُس نے سوال کیا مگر وہ خاموش رہا۔

'' آپ اتنی رات کو یہاں کیوں ہیں؟ ہمارے سوال کا جواب دیں۔'' مگر وہ اسی طرح خاموش اس کی طرف پشت کیے کھڑا رہا۔ سونم نے اس کو ہاتھ سے پکڑ کر موڑا تو اُس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ وہ موہت نہیں تھا بلکہ وہ کوئی عورت تھی۔ اُس کی شکل اتنی بھیانک تھی کہ سونم کی جان نکلنے والی ہو گئی۔

'' بچاؤ...... بچاؤ۔'' وہ دیوانہ وار سب کو پکارنے لگی جب تک موہت، موہن، نرملا نیچے آئے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ جب سونم کنویں کے اوپر کھڑی ہوئی تھی۔ رات کے اس پہر وہ وہاں کیا کر رہی تھی وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ ایک دم کنویں سے دھواں نکلا اور اُس کا سارا منہ کالا ہو گیا، پھر کنویں میں آگ لگ گئی اور اس کے کپڑے جل گئے۔ یک دم وہ خواب سے بیدار ہوئی اور موہت بھی اُٹھ بیٹھا۔

'' موہت جی میں نے دیکھا کہ میں پرانے کنویں کے پاس تھی اور......''

'' سونم پلیز ریلیکس! کچھ نہیں ہوا۔ یہ صرف سپنا تھا۔'' موہت نے اُسے سمجھایا۔

'' نہیں یہ دیکھیں میرا منہ ابھی بھی کالا ہے اور میرے کپڑے بھی......'' وہ کچھ بتا رہی تھی کہ یک دم کمرے میں بہت سا پانی آ گیا۔ پانی چھت سے ایسے ٹپک رہا تھا جیسے کسی نے فوارہ کھول دیا ہو اور وہ جانتی تھی کہ وہ پانی کنویں کا ہے۔''

'' دیکھا...... دیکھا موہت جی! یہ پانی اسی کنویں کا ہے۔'' سونم بہت خوفزدہ تھی۔

'' کون سا پانی! یہاں تو کچھ بھی نہیں۔'' مگر جب موہت نے کہا تو وہ ساکت سی ہو گئی۔ یہ اس کے

ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہ سوچتی رہی۔

اور اب تو وہ مزید خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ وہ جو کام بھی کرتی اس میں کچھ ایسا ضرور ہوتا جو اسے مزید خوفزدہ کر دیتا تھا اور ایک رات......

☆......☆......☆

کنواں اس وقت ویران سا پڑا تھا اور اس کے پاس پڑی رسی آہستہ سے ہلی اور آگے بڑھنے لگی۔ رسی سانپ کی طرح بل کھاتی سونم کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ دروازے کے سامنے جا کر رسی آہستہ سے آگے بڑھی اور اس کا سرا دروازے کو لگتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا۔ رسی اسی طرح آگے بڑھتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ عین اسی وقت نرملا نے کمرے سے باہر قدم رکھا تھا اور یہ سب دیکھ کر وہ زرد پڑ گئی۔

ڈر کے مارے اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی اور تھوڑا آگے جا کے وہ چھپ کے رسی کو دیکھنے لگی۔ رسی موہت اور سونم کے کمرے میں گھس گئی تھی۔ نرملا کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر میں رسی اسی طرح باہر نکلی اور ان کے پیچھے نیند میں سوئے موہت اور سونم بھی گھسیٹتے جا رہے تھے۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے دونوں کی آنکھ کھل گئی۔ سونم کو پہلے تو کچھ سمجھ نہ آیا جب وہ سمجھی تو تب تک دیر ہو چکی تھی۔ موہت بھی خوفزدہ تھا۔

سونم چیخنے چلانے لگی خود کو آزاد کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگی اسی وقت نرملا آگے بڑھ رہی تھی کہ دیوار سے دو ہاتھ نکلے اور نرملا کو گردن سے دبوچ لیا۔

☆......☆......☆

نرملا سُن سی ہو گئی، اس کی آنکھیں ابل پڑیں، زبان باہر تک آ گئی تھی۔ موہت اور سونم کو تو وہ لے جا چکی تھی مگر اب نرملا اور موہن بھی مصیبت میں تھے۔

موہن کا سوچتے ہی نرملا میں پتا نہیں اتنی شکتی کہاں سے آ گئی کہ اس نے پورا زور لگا کر خود کو اِن ہاتھوں سے چھڑایا اور گرتی پڑتی گھر میں رکھی کانا کی مورتی کے پاس آ گری۔ بڑھتے ہاتھ کچھ دور ٹھہر گئے۔ نرملا نے وہ مورتی ہاتھ میں اٹھائی اور زیر لب کچھ پڑھتی موہن کے کمرے میں بھاگی۔ اسے جگایا اور گھر سے باہر نکل آئی۔

اس کا رُخ پرانے کنویں کی طرف تھا۔ اس نے کئی بار محسوس کیا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ سوچتے ہی خوف کی ایک تیز لہر اس کے جسم میں دوڑ جاتی۔ ایک جگہ پر وہ گری اور مورتی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اندھیرے میں اسے نظر نہیں آیا کہ مورتی کہاں پڑی ہے۔

اس نے موہن کا ہاتھ پکڑا اور آگے کی طرف بھاگنے لگی کہ کسی مندر میں گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ پرانا مندر تھا جس کے پیچھے کنواں تھا۔ وہ بھاگ کر مندر کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

☆......☆......☆

سونم اور موہت پرانے کنویں کے اوپر ساکت کھڑے اندر پانی کو تک رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ گہری نیند میں جاگے کھڑے ہیں مگر ان کا دماغ سُن سا تھا۔ اسی لمحے کنویں سے ایک خوفناک آواز آئی۔

'' آ گئے تم دونوں...... بہت اچھے، میں نے تم لوگوں کے لیے اتنا کیا ہے اور تم میرے لیے کچھ نہیں کرو گے۔ آ جاؤ میرے پاس! آ جاؤ!'' یہ آواز سنتے ہی موہت ایک دم جیسے نیند سے جاگا، اس نے سونم کا ہاتھ پکڑا اور واپس بھاگنے لگا۔ پیچھے سے زور زور سے ہنسنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

'' جاؤ گے کہاں؟'' اس کے ہنسنے کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ موہت کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ وہ کتنی ہی دیر بھاگتا رہا مگر وہ آواز اسے آتی ہی رہی۔ جب اس نے غور کیا تو اُسے پتا چلا کہ وہ کہیں بھاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اب بھی کنویں کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ جتنا بھی دور بھاگتا واپس کنویں کے پاس آ جاتا، اچانک سونم نے ہاتھ چھڑایا۔

'' موہت جی ہمیں جانا ہی ہوگا۔ انجانے میں ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ آپ بھاگ جائیں یہاں سے۔'' سونم نے روتے ہوئے کہا اور کنویں کے پاس پہنچ گئی۔ موہت اُسے پکارتا رہا مگر اس نے

کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

☆ ... ☆ ... ☆

نرملا نے مندر میں دیکھا کہ وہاں شیلاکا کی موجود تھیں۔ وہ انہیں اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سب کچھ انہیں بتا دیا۔ وہ کچھ پریشان سی ہوگئیں۔

''ہوں... جب تمہیں پتا تھا تو تم نے سونم کو روکا کیوں نہیں؟''

''ہم نے روکا مگر... دیوی ہماری سہائتا کرو۔'' وہ رونے لگی۔

''ہم اوش تمہاری سہائتا کریں گے، سونم نے انجانے میں بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ وہ کنواں کوئی عام کنواں نہیں ہے۔ وہاں کسی بری آتما کا سایا ہے۔ آج سے سو سال پہلے وہاں رات کے اندھیرے میں میگھنا نامی عورت بیٹھ کر کالی شکتیاں پراپت کرتی تھی۔ آس پاس کے لوگ اپنی اچھائیں لے کر اس کے پاس آتے تھے۔ کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے مگر سب کی اچھا پوری ہو جاتی تھی۔

پہلی اچھا پوری ہونے پر وہ کچھ نہیں لیتی تھی مگر دوسری بار اگر کوئی اپنی اچھا لے کر آتا تو اس کے پورا ہوتے ہی وہ اُن سے اُن کا سب کچھ چھین لیتی تھی۔ ہر بار ہی ایسا ہونے لگا تو آس پاس کے لوگوں کو بھی شک ہوگیا کہ یہ سب یہی کرتی ہے اور پھر ایک دن سب اسے ختم کرنے آگئے اور اُسے پتھروں، لاٹھیوں سے مار مار کر کنویں میں پھینک دیا۔

سب لوگ سمجھے کہ وہ مر گئی ہے مگر وہ مر کر بھی زندہ ہے اور اب بھی وہ ایسا ہی کرتی ہے۔ دوسری اچھا پوری ہونے پر وہ سب کچھ چھین لیتی ہے۔ وہ موہت اور سونم کو مار ڈالے گی۔'' دیوی چپ ہوگئیں تو نرملا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

اگلے دن سورج ڈھلنے سے پہلے وہ وہاں آ پہنچے، سونم کے بعد موہت بھی کنویں میں چلا گیا تھا۔ دیوی نے سب کو ایک دائرے میں بٹھایا اور خود آگ جلا کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے آگ میں کچھ پھینکا تو کنویں میں سے ایک کرب ناک چیخ نکلی تھی مگر دیوی پُرسکون بیٹھی رہیں۔ اس کے بعد وہ دہاڑی۔

''تم مجھے کیا ختم کرو گی! کبھی نہیں!! میں بھی دیکھتی ہوں تم کیا کر سکتی ہو۔''

اور پھر واقعی دیوی پریشان ہوگئی۔ اس نے آخری بار کچھ پڑھا اور کنویں سے سونم اور موہت اچھل کر باہر آئے مگر پھر واپس چلے گئے کچھ دیر بعد وہ اوپر آئے اور باہر گر گئے۔ موہت تو باہر گر گیا مگر سونم پھر اندر چلی گئی۔ ایک دم تیز تیز ہوا چلی اور وہ آتما باہر آگئی۔

اس سے پہلے کہ وہ دیوی کو ختم کرتی اس نے سرخ مرچیں ہاتھ میں لیں اور پڑھ کر اس کی طرف پھینکیں وہ چیختی ہوئی دور جا گری۔ مگر پھر اُٹھ کر وہ اس کی طرف آنے لگی۔

موہت گھر کی ہر چیز کو آگ لگا رہا تھا اور باقی پیسے وغیرہ لے کر وہ وہیں آگیا۔

اتنے پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی ابھی بہت تھے۔ دیوی نے ماچس سے تیلی نکالی اور آگ جلا کر پیسوں پر پھینک دی۔ جیسے جیسے گھر کا سارا سامان اور پیسے جل رہے تھے۔ ویسے ہی کنویں اور میگھنا کو بھی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ زور زور سے چلانے لگی۔

دیوی کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہیں اور کچھ پڑھتی رہیں۔ جب سب کچھ جل گیا انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ آتما غائب ہو چکی تھی۔ کنواں بھی جل چکا تھا۔ سونم اچھل کر باہر آ گری۔ سب اُس کی طرف دوڑے۔

دیوی نے دونوں کو چیک کیا اور کہا۔

''موہت تو ٹھیک ہے مگر چونکہ سونم نے ہی کنویں پہ آکر اچھا مانگی تھی اس لیے اُس آتما نے اسے ختم کر دیا ہے۔'' یہ سنتے ہی نرملا دہاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

سونم نے اپنی ہی پہلی خواہش کے پورا ہونے کے بعد دوسری خواہش کرکے، اپنی بلی دے دی تھی۔

☆☆......☆☆



فوزی میری ہے۔۔۔

عثمان بلوچ

اُس بے خبر عاشق کی داستان، جس کی محبت ایک جن کی قید میں چلی گئی تھی

نصف شب بیت چکی تھی۔ ہر طرف اندھیروں کا راج تھا۔ چہار سمت پھیلے سناٹے نے ماحول کو اور زیادہ پُراسرار بنا رکھا تھا...... اسی اثناء میں ایک بے خبر عاشق اپنے اندر اٹھنے والے سرکش جذبات کو سمجھنے



سے قاصر اور بے قابو خیالات کو لگام دینے کی تگ ودو کر رہا تھا کہ اچانک اس کے بے لگام خیالات نے سرکشی کی اور جھٹ سے فوزی کا خوبصورت چہرہ اور دلکش تصاویر ذہن کے محور میں گردش کرنے لگیں۔ زین نے فوراً ان خیالات کے بندھے ہوئے تسلسل کو توڑنا چاہا مگر بے قابو دل میدان میں اُتر آیا اور زین کی آنکھیں ماضی کی خوشگوار یادوں سے آنسوؤں کی جھیل بن گئیں۔

☆......☆......☆

کالج لائف کا زمانہ گزرا تو یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ زین نے جلد ہی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہ بہت خاموش طبع اور تنہائی کا دلدادہ تھا۔ ہر وقت اپنے کام میں مگن رہتا۔

لیکن یونیورسٹی لائف تو خشک مزاج کو بھی شوخ و چنچل بنا دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زین بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی ایام تو بڑی بوریت سے گزرے تھے لیکن 'فوزی' سے ملاقات کے بعد زین کی طبیعت میں نکھار آ چکا تھا۔ ہر وقت گم صم رہنے والا زین اب ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ یقیناً زین کی زندگی میں یہ تبدیلی فوزی کی مرہونِ منت تھی۔ اسی وجہ سے تو زین کبھی کبھی کہتا۔

میرا سیدھا سادھا مزاج تھا مجھے عشق ہونے کی کیا خبر
تیرے اک تبسم ناز نے میرے سارے ذوق بدل دیے

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ لمحے یادوں میں ڈھل رہے تھے۔ زین اور فوزی کی محبت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب وہ ایک دوسرے کی زندگی بن چکے تھے۔

☆......☆......☆

یہ قانون فطرت ہے کہ حالات و واقعات ایک جیسے نہیں رہتے۔ کبھی غم تو کبھی قہقہے تو کبھی بے بسی، کبھی موت تو کبھی زندگی، کبھی سوز تو کبھی ساز، غرض دنیا تغیر کا نام ہے۔ کبھی انسان خوشی سے پھولے نہیں سماتا تو کبھی اندوہ کی گہری کھائیوں میں جا گرتا ہے۔ اسی طرح زین کی آزمائش کے دن بھی شروع ہو چکے تھے۔ وہ ذاتی طور پر اتنا بے ہمت نہیں تھا۔ لیکن حوادث زمانہ کے چنگل میں پھنس کر بے بس ضرور ہو چکا تھا۔

وہ جون کی گرم دوپہر تھی۔ سورج آگ برسا رہا تھا جھلسا دینے والی گرمی میں زین تھکا ہارا گھر پہنچا تو آتے ہی اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ تھکے ماندے بدن کو سکون نصیب ہوا تو جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

بمشکل تھوڑی سی دیر گزری تھی کہ سوتے ہوئے زین کو ایسا محسوس ہوا جیسے پورا کمرہ زوردار جھٹکے سے اپنی جگہ سے سرک گیا ہے۔ دیواریں اور چھت ایسے لگ رہی تھی کہ ابھی گرنے کو ہیں۔

اُس نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا۔ شاید کہ یہ سب اس کا وہم ہو لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ محض اس کا وہم نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس کا سارا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

خوف کے مارے کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ کیونکہ پہلا موقع تھا جب اس کو یہ خوفناک مناظر دیکھنے پڑے تھے۔ پھر بھی اس نے ہمت کا دامن نہ چھوڑا اور اپنے بیڈ سے اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرتے ہوئے دل کو تسلی دی۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ باتھ روم کی ٹونٹی کھلی ہے، اور ساتھ ہی پانی گرنے کی آواز آئی۔ اس نے ہمت کی اور بیڈ سے نیچے اُتر کر باتھ کا دروازہ کھولا۔

دروازہ کھولتے ہی ایک خوفناک منظر اُس کے سامنے تھا۔ نہ بندہ نہ بندے کی ذات پر ٹونٹی چل رہی تھی اور پانی کی جگہ سرخ خون بہہ رہا تھا۔ اب تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور ساتھ ہی وہ زمین کو آ رہا۔ زمین پر گرتے ہی بیچارہ بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

''زین کیسے ہو؟'' اگلے دن آتے ہی فوزی نے نرم و نازک لہجے میں پوچھا۔ شارٹ بریک میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔

''بس ٹھیک ہوں فوزی۔'' زین نے بجھے بجھے

سے انداز میں جواب دیا۔

''خیر تو ہے بجھے بجھے سے انداز ہیں جناب کے۔'' فوزی کا لہجہ بدستور شائستہ تھا۔ زین اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہر کوشش بے سود، کیونکہ فوزی کے سامنے وہ کچھ بھی نہیں چھپا سکتا تھا۔ مرتا کیا نا کرتا آخر کار اس نے فوزی کو ٹالنے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں فوزی بس ویسے ہی طبیعت ناساز ہے۔'' زین نے جواب دیا۔ فوزی نے بھی 'ایمان بانصیب' کو ترجیح دی اور زین کی بات کو سچ سمجھا۔

☆......☆......☆

کچھ ہی دن سکون سے گزرے تھے کہ اچانک آدھی رات کے وقت زین کی دل دہلا دینے والی چیخوں سے درو دیوار کانپنے لگے۔ اس مرتبہ تو زین بالکل اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ اور کون کر رہا ہے؟

رات کے تقریباً 12 بجے تھے۔ زین کو دروازے پر دستک سنائی دی۔ پہلے تو اُس نے اسے اپنا وہم سمجھا لیکن جب دروازہ کھلنے اور قدموں کی واضح چاپ سنائی دی تو فوراً اُس نے پاس پڑے لیمپ کا بٹن دبایا۔ پھر کیا تھا...... ایک عظیم الجثہ، بدہیئت، بڑے بڑے گھنے بال، لمبے لمبے ناخن، آنکھیں انگاروں کی مانند سرخ، منتہائے نظر قد والا جثہ سامنے موجود تھا۔ اُس کے منہ سے دو لمبے باریک دانت نکل کر سینے کو چھو رہے تھے۔

ایسا بدشکل کہ دیکھ کر زین کی جان نکلنے لگی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر چیخنے کی قوت نہ تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی قوت گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ میرا کوئی گناہ نہیں، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ لیکن زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر اُس بدشکل نے زین کے اردگرد گھومنا شروع کر دیا۔ سارا کمرہ اس کی بدبو سے بھر چکا تھا۔ زین بت بنا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اک خوف تھا نا ختم ہونے والا......

اک اضطراب تھا مسلسل رہنے والا......

بے چینی حد سے زیادہ کہ اتنے میں بدشکل جثہ گویا ہوا...... ہاہاہا......

''تم فوزی کو اپنانا چاہتے ہو؟'' ہیولے کے انداز میں طنز و تعجب کے نمایاں اثرات تھے۔

''ہاہاہا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اتنا کہہ کر زین کے سر پر وہ چکی کے پاٹ کی طرح تیز گھومنے لگا اور پھر اس کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اگر تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو فوزی کو چھوڑ دو۔ ہاہاہا...... چھوڑ دو...... وہ بس میری ہے بس میری۔'' آواز کی بازگشت زین کو دور تک سنائی دے رہی تھی اور ہیولہ روپوش ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

اِن واقعات کا زین کی شخصیت پر گہرا اثر ہوا تھا۔ ہر وقت خوش باش رہنے والا زین اب بے حس ہو چکا تھا۔ اس کی گلابی رنگت اب پیلی پڑ گئی تھی۔ چہرہ مرجھایا ہوا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، طبیعت میں چڑچڑاپن اب وہ کچھ عرصہ پہلے والا زین نہ رہا تھا۔

نہ تو وہ کسی سے بات کرتا اور نہ ہی کسی سے ملنا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے یونیورسٹی سے چھٹی ہوتے ہی وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھا کہ اتنے میں فوزی بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی اور زین کو بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''زین کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں مجھ سے بھاگتے ہو؟ کیا مجھ سے اس لیے نفرت کرنے لگے ہو کہ میں نے تمہیں دل سے چاہا ہے؟ بولو خاموش کیوں ہو؟'' فوزی نے ایک ساتھ ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

''جب دل کو قرار نہ ہو تو اپنوں سے گلہ کرنے میں انسان بہت آگے نکل جاتا ہے۔

بے تکلفی جب محبت کا روپ دھارے تو محبوب کی تھوڑی سی بے رُخی بھی ناقابلِ برداشت ہو جایا کرتی ہے۔ فوزی زین کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اُسے قریبی کیفے میں لے گئی۔ غضب تو یہ تھا کہ زین کو اب فوزی

سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ اُسے جب بھی دیکھتا تو اُسے وہ بدصورت ہیولہ اور اس کی کہی ہوئی باتیں یاد آجاتیں اور پھر وہ انہیں خیالات میں گم ہوجاتا۔

''زین میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔'' زین فوزی کی بات سے چونکا ورنہ وہ تو خیالات کی خوفناک وادیوں میں کہیں کا کہیں پہنچ چکا تھا۔

''ہاں...... ہاں فوزی بس...... وہ طبیعت خراب ہے۔'' زین کے لہجے میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔

''نہیں زین مجھے سچ سچ بتاؤ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ اگر محبت ہوتی تو تم مجھ سے کچھ نہ چھپاتے۔'' فوزی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ آخر زین تو خود محبت میں لاچار تھا اور پھر فوزی جو اس کی جان تھی اتنا اصرار کررہی تھی۔ اس لیے زین نے فوزی کو سارے واقعے سے آگاہ کردیا اور فوزی کو معاملہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

''زین یہ اس وقت کی بات ہے جب میں تمہارے انتظار میں اس گھاٹی کے پاس والی بینچ پر بیٹھ جایا کرتی تھی۔'' فوزی نے زین کو بتانا شروع کیا۔

''ایک مرتبہ کافی انتظار کے بعد بھی جب آپ نے آنے میں دیر کردی تو میں جانے کے ارادے سے اٹھی ہی تھی کہ اچانک ایک بہت ہی خوبصورت، ہینڈسم، پُروجاہت چہرے والا نوجوان لڑکا میرے سامنے آکر ٹھہر گیا اور میرا راستہ روک لیا اور ساتھ ہی بڑے شائستہ لہجے میں کہنے لگا۔

''آپ کو شاید معلوم نہیں میں کئی دنوں سے آپ کو چھپ چھپ کر دیکھتا ہوں کہ شاید رخِ زیبا ہماری طرف بھی متوجہ ہو۔ میری بے قرار آنکھیں روزانہ آپ کی متلاشی رہتی ہیں۔ جب آپ کو دیکھ لیتا ہوں تو میری روح کو سرشاری نصیب ہوتی ہے۔ فوزی میں آپ سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔''

میں پھٹی پھٹی حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کے منہ سے اپنا نام سن کر مجھے اتنا خوف لاحق ہوا کہ میرا جسم تھرتھر کانپنے لگا۔ آخر نہ میں اسے جانتی تھی اور نہ ہی میں نے کبھی اُسے دیکھا تھا۔ یہ کیسا عجیب معاملہ تھا کہ ایک اجنبی اس انداز سے باک میں اپنی محبت کا بلا جھجک اظہار کرگیا تھا کہ جاتے جاتے میرا نام بھی بتا گیا تھا۔

زین! وہ رات میں نے کھلی آنکھوں کاٹی، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، اور جو واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہے تو اس نے ساری بات ہمارے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوچکی ہے کہ یہ کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی پُراسرار مخلوق ہے جو ہماری بڑھتی پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔'' فوزی تو ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولتی جارہی تھی لیکن زین اپنی جگہ ساکت و جامد ہوچکا تھا۔

''فوزی ہم انشاء اللہ حوصلہ ہارنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ مشکلات ہماری قوی ہمت کو کمزور کرسکتی ہیں۔ ہم دونوں مل کر اس صورتِ حال کا سامنا کریں گے اور کوئی ایسی راہ نکالیں گے کہ ہمیں نقصان بھی نہ پہنچے اور کام بھی بن جائے۔''

وہ دونوں ایک نیا عزم لے کر وہاں سے رخصت ہورہے تھے۔

☆......☆......☆

اصل واقعہ یوں ہوا تھا کہ 'حکیمو' جو جنات کے قبیلے کا ایک فرد تھا۔ وہ فوزی کے حسن و جمال پر دل و جان سے فریفتہ ہوگیا تھا اور اب 'حکیمو' چاہتا تھا کہ کسی طرح فوزی کو اپنا لے اور اُس نے یہ عزم کرلیا تھا کہ فوزی کو اپنانے کے لیے چاہے اُسے زین کی جان بھی لینی پڑی تو وہ یہ کام بھی کر گزرے گا۔ فی الحال اس کا یہ خیال تھا کہ شاید زین ڈرانے دھمکانے سے فوزی کو چھوڑ دے گا، اس لیے ابھی تک اس نے زین کو کوئی جانی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

ایک دن فوزی نے زین کو کہا۔ ''زین یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس بدروح (حکیمو) کو یہ معلوم ہوچکا ہو کہ ہم لوگ معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں اور اس سے نجات پانے کے لیے کوئی منصوبہ بنارہے ہیں، تو وہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا جتنا جلدی ہوسکے ہمیں کوئی راہ اختیار کرلینی چاہیے۔''

''ہاں فوزی تم نے درست بات کی ہے۔ میں

آج ہی ضرور اس معاملے کا حل نکالوں گا۔'' زین نے برجستہ جواب دیا۔ پھر وہ دونوں یونیورسٹی سے نکل کر اپنی اپنی راہ ہولیے تھے۔

☆......☆......☆

زین وہاں سے سیدھا 'پیر کرم علی شاہ صاحب' کے پاس پہنچا۔ جو اپنے علاقے کی ایک معتبر اور بزرگ و پارسا شخصیت تھی۔

زین کے خاندان کے اکثر لوگ ان کے مرید تھے اس لیے وہ زین کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ زین جب وہاں پہنچا تو شاہ صاحب کے اردگرد لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ شاہ صاحب نے زین کو آتے ہوئے دیکھا تو اپنے خادم سے فرمایا کہ زین کو میرے پاس لے آؤ۔'' اس طرح وہ شاہ صاحب کے بالکل قریب جا بیٹھا۔

''اسلام وعلیکم شاہ صاحب۔'' زین نے شاہ صاحب کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ورحمۃ، آؤ زین بیٹا کیسے ہو؟ آج بڑی مدت کے بعد آئے ہو؟'' شاہ صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''شاہ صاحب اللہ کا شکر ہے میں خیریت سے ہوں، بس پڑھائی کی وجہ سے مصروفیات زیادہ ہوتی ہے اس لیے کہیں نہیں جاتا۔'' زین نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔

''بیٹا سچ پوچھو تو تم مجھے پریشان سے لگتے ہو خیر تو ہے؟'' شاہ صاحب نے زین کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی شاہ صاحب کچھ دنوں سے میں بہت پریشان ہوں اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔'' زین نے جواب دیا۔

''چلو بیٹا پھر تھوڑی دیر کے لیے ہم اندر گھر میں چلتے ہیں وہاں مجھے کھل کر اپنا مسئلہ بتانا ٹھیک ہے۔'' شاہ صاحب نے کمالِ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زین سے کہا تو زین نے فوراً بغیر تاخیر کے سر اثبات میں ہلادیا۔

شاہ صاحب زین کو لے کر گھر میں ایک علیحدہ کمرے میں آگئے، اور اپنے سامنے والے صوفے پر زین کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ زین اُن کے سامنے بڑے ہی ادب سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''جی بیٹا اب تم بغیر کسی جھجک اور بغیر کسی خوف کے اپنا مسئلہ بتاؤ۔'' شاہ صاحب نے پیار سے پوچھا تو زین نے فوزی سے اپنی دوستی اور پھر گزشتہ واقعات جو اس کے ساتھ پیش آئے تھے یا فوزی کے ساتھ سب حرف بحرف شاہ صاحب کی خدمت میں گوش گزار کردیے۔

''ہوں یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے بیٹا! ہم نے تو جنوں کے پورے پورے خاندان کو مار بھگایا، یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' شاہ صاحب نے زین کی ڈھارس بندھائی۔ یہ کہہ کر زین کو ایک تعویذ دیا اور کہا کہ اس تعویذ کو کبھی بھی اپنے سے جدا نہیں کرنا اور جب اس طرح کی صورت حال پیش آئے تو فوراً اس تعویذ کو اپنی مٹھی میں زور سے دبا لینا اور آیت الکرسی کا ورد کرتے رہنا پھر دیکھنا وہ شیطان تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔''

زین کو شاہ صاحب نے ہدایات دیں۔ زین شاہ صاحب سے ملاقات کرکے واپس گھر آگیا۔

☆......☆......☆

چمکتے دن نے اپنا سفر مکمل کیا تو کالی رات نے اپنا خیمہ تان لیا۔ رات کی سیاہی دن کے اُجالے پر غالب آچکی تھی۔ سارے دن کے تھکے ہارے لوگ سکون کی چادر تان کر سورہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اسی اثناء میں 'حکیمو' اپنی گندی ذہنیت کے ساتھ اپنے غلیظ منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فوزی کی طرف چلا۔ فوزی کو جب اُس نے دنیا جہان سے بے خبر پایا تو دل میں بہت خوش ہوا کہ آج میری حسرتیں پوری ہوجائیں گی اور اس پھول جیسے ادھ کھلے گلاب سے خوب لطف اندوز ہوں گا اور اس خوبصورت بدن والی گڑیا کو اپنی قید میں کرلوں گا، پھر فوزی میری ہوگی...... ہاہاہا...... بس میری...... بس میری......''

اُس نے جاتے ہی فوزی کو بغیر کوئی موقع دیے

ے قابو میں کرلیا اور نامعلوم مقام کی طرف لے
فوزی کے منہ پر اُس نے مضبوطی سے اپنا غلیظ و
دار ہاتھ رکھا ہوا تھا تا کہ یہ کمزور اور بے بس مخلوق
کے پنجۂ قدرت میں بے بس ہوجائے۔
فوزی کی تو یہ حالت تھی کہ حکیمو کے قبضہ میں
ے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بیہوش ہوچکی تھی۔
سے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے
کیا ہورہا ہے۔ اور اِدھر بے خبر عاشق اپنی
میں مست شاہ صاحب کے تعویذ کو بغل میں
ے مزے سے سویا ہوا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا
س کی محبوبہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا
والی ہے۔ وہ تو اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ
سو میرے پاس آئے گا تو میں اسے خوب مزہ
ں گا پر اسے کیا معلوم؟
ں عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے
ق بیچارہ نہ ملا ، نہ زاہد ، نہ فقیر
زی اب ایسی دنیا میں پہنچ چکی تھی جہاں کا اُس
زندگی میں تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کی نظروں
کا مستقبل تاریک ہوچکا تھا، بس زین اس کی
ٹمٹاتا ہوا دیا تھا، جو عشق کی آگ سے مجبور ہوکر
پہنچ سکتا تھا۔
ین سوکر اٹھا تو فوراً اسے خیال آیا کہ یہ تعویذ جو
صاحب نے دیے تھے فوزی کو بھی دینے
۔ اسی سوچ پر اُس نے فوزی کا نمبر ڈائل کیا مگر
خبر عاشق کو کیا معلوم کہ فوزی اب رابطے کی
باہر ہے، جہاں تک اس کی رسائی مشکل
کے ذہن میں آیا کہ شاید فوزی آرام کررہی
س کی وجہ سے رابطہ نہیں ہورہا کیونکہ سوتے
اپنا موبائل آف کردیتی تھی۔ اس لیے اس
ں میں آیا کہ چلو یونیورسٹی میں ملاقات کے
ویذ اسے دے دوں گا۔''

☆......☆......☆

ب ہوتے ہی زین فوزی سے ملنے مقررہ جگہ
ن اس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ حالانکہ فوزی
اس کے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھی۔

ایک دن گزرا...... دو دن حتیٰ کہ جب تیسرے دن بھی فوزی کا کوئی اتا پتا نہ ملا تو وہ یونیورسٹی سے سیدھا شاہ صاحب کے پاس پہنچا اور سارے واقعے سے آگاہ کیا۔ شاہ صاحب تھوڑی دیر اپنا عمل کرتے رہے پھر فرمایا۔

''زین افسوس ہے تمہاری فوزی پر اس حکیمو کا داؤ چل گیا اور وہ اسے لے کر اپنے قبیلے میں جاچکا ہے۔ وہ حکیمو کی قید میں ہے۔ لیکن بیٹا فکر نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم خوب اس خبیث الفطرت کا مقابلہ کریں گے۔ زین اب جو میں کہتا جاؤں تم بس وہی کرتے جاؤ۔ تم کل رات ہوتے ہی مسجد کے پیچھے والے قبرستان میں آجانا۔'' شاہ صاحب نے زین کو ہدایات دیں۔

''ٹھیک ہے شاہ صاحب میں کل وقت سے پہلے قبرستان پہنچ جاؤں گا۔'' زین نے آمادگی کا اظہار کیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن سورج غروب ہوتے ہی زین مقررہ وقت پر قبرستان پہنچا۔ سورج غروب ہوئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ لیکن قبرستان ایک وحشت ناک منظر پیش کررہا تھا۔ گہری خاموشی...... ساکت و جامد خوفناک درخت قبرستان کی وحشت میں اور اضافہ کررہے تھے۔ زین کے ذہن میں غیر اختیاری طور پر خوفناک اور بدصورت تصاویر ابھرنے لگیں۔

جب شاہ صاحب قبرستان پہنچے تو زین کا برا حال ہوچکا تھا۔ اس کو شاہ صاحب کی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے آتے ہی زین کو سلام کیا تو زین اپنی جگہ سے تقریباً کود ہی پڑا اور شاہ صاحب کو بھی کوئی جن، بھوت خیال کیا جو بزرگ کا روپ دھار کے آدھمکا ہو۔

شاہ صاحب نے بڑی مشکل سے اُسے یقین دلایا کہ وہ اس کے پیر صاحب ہیں اور انہوں نے ہی زین کو قبرستان آنے کا کہا تھا۔ شاہ صاحب نے زین کو ایک گول دائرے میں بٹھا دیا اور تاکید کی کہ چاہیے کچھ ہوجائے تم نے اس دائرے سے نہیں نکلنا۔'' زین نے ہاں میں ہاں ملائی۔

شاہ صاحب بھی اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچ کر بیٹھ چکے تھے۔ اور زین کو کہا کہ تم آیت الکرسی کا ورد کرتے رہو اور بالکل مطمئن ہو کے بیٹھو۔'' یہ کہہ کر شاہ صاحب نے اپنا عمل شروع کردیا۔

☆......☆......☆

شاہ صاحب کے عمل شروع کرتے ہی زین نے آنکھیں مضبوطی سے بند کرلیں ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ زین نے جونہی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بینائی کو دیکھنے کی اجازت دی تو اپنے دائرے کے اردگرد بے شمار بڑے بڑے پھنکارتے ہوئے سانپوں کو دیکھا۔

زین نے اتنا خوفناک منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ زین کو یقین ہوچلا تھا کہ سانپ اس کے دائرے میں داخل ہوجائیں گے اور اسے ہلاک کر ڈالیں گے لیکن فوراً شاہ صاحب کی کہی ہوئی بات یاد آگئی کہ زین تمہیں طرح طرح کے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔

بے شمار ایسی چیزیں دیکھنی پڑیں گی جو تم نے پہلے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔ اس لیے وہ جم کر بیٹھا رہا اور زبان پر آیت الکرسی ورد تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہونا تھا۔

جب شاہ صاحب نے اپنا عمل تھوڑا تیز کیا تو زین کی آزمائش میں بھی تیزی آگئی۔ اُس نے اپنے اردگرد بہت زیادہ تپش محسوس کی، اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھتے ہی اس کی چیخیں نکل گئیں۔

کیونکہ آگ کے بلند شعلوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مصیبتیں اُس پر تسبیح کے دانوں کی طرح یکے بعد دیگرے گررہی تھیں۔ یہ تو شاہ صاحب کا کمال تھا کہ اتنی زیادہ مصیبتوں میں بھی وہ سیسہ پلائی دیوار کی مانند ثابت قدم تھے۔ زین نے تو کبھی ان واقعات کا تصور بھی نہ کیا تھا مگر یہ فوزی کی محبت ہی تھی جو اسے ثابت قدم رکھے ہوئے تھی۔ ا

س لیے پھر سے وہ ایک نیا عزم لے کر اپنی جگہ پر جم کے بیٹھ گیا۔ لیکن کہاں تک امن رہتا......؟ ایک نئی مشکل اس کا بے چینی سے انتظار کررہی تھی۔ اس نئی آنے والی مصیبت نے تو اس کے رونگٹے کھڑے کردیے تھے۔

اور وہ مکمل طور پر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ اس نے دیکھا فوزی ایک وسیع میدان میں دوڑ رہی ہے اور دو طاقتور شیر اس کا پیچھا کررہے ہیں اور قریب تھا کہ وہ شیر فوزی کو گردن سے دبوچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کردیتے۔

یہ منظر دیکھ کر ایک عاشق کو کیسے صبر ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اٹھ کر اپنے دائرے سے نکلنا چاہا تا کہ جاکر اپنی فوزی کو چھڑالے جس کی خاطر اس نے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ آج وہ اس کے سامنے بڑی بے دردی سے لٹ رہی تھی۔ لیکن شاہ صاحب کی نظر اچانک زین پر پڑی تو شاہ صاحب نے زور سے پکارا۔

''زین کیا کررہے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟ یہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب نظر کا دھوکہ ہے حقیقت میں کچھ بھی نہیں اپنی جگہ پر آرام سے بیٹھے رہو۔ باہر نہ جاؤ خدا کے لیے...... ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔''

زین جو اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔ شاہ صاحب کی آواز پر چونکا اور شاہ صاحب کی بات سمجھنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ واقعی یہ نظر کا دھوکہ تھا کیونکہ اب وہ منظر اس کی نظروں سے غائب ہوچکا تھا۔

شاہ صاحب نے بھی اختتامی مراحل کو طے کرلیا تھا اور اپنی عملیات کی طاقت سے اس خبیث الفطرت حکیمو کو اپنی قید میں کرلیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد حکیمو رسیوں میں جکڑا ہوا بے بسی کے عالم میں شاہ صاحب کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ جلد ہی شاہ صاحب نے اپنے مؤکلات کے ذریعے فوزی کو قید سے چھڑا لیا اور اس طرح ایک بے خبر عاشق کو اپنی فوزی مل گئی۔

غم کی شام ڈھل چکی تھی اور امن کی صبح پورے آب وتاب کے ساتھ زین اور فوزی کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☆☆......☆☆





مجھے چینی لادو

فوزیہ فرید احمد

اُسے کراچی دیکھنے کی خواہش، شہر عروس البلاد لے آئی تھی، مگر اُس بھری دوپہر میں......

میرا نام سلمان ہے۔ میں حیدر آباد، کوٹری کا رہائشی ہوں۔ ہم تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اسی لیے سب کا لاڈلا ہوں۔

میرے چچا کا گھر ہمارے گھر کے برابر میں ہے۔ وہ کراچی میں چادریں اور کھیس فروخت کرتے ہیں اور وہیں کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔

میرا کراچی جانے کو بڑا دل کرتا تھا۔ میں نے کئی بار ابو سے کراچی جانے کی ضد بھی کی تھی۔ مگر ٹائم کی کمی کی وجہ سے ابو اب تک میری یہ خواہش پوری نہیں کر پائے تھے۔ یہ میری پہلی خواہش تھی۔ جو اب تک پوری نہ ہو سکی تھی۔ میرے دوست تابش کو بھی کراچی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔

جب ہم پیپرز سے فارغ ہوئے تو ہم نے فیصلہ کیا اس بار کراچی لازمی جانا ہے۔ جب اس بات کا ذکر میں نے اپنے ابو سے کیا۔ تو پہلے وہ نہ مانے پھر میری ضد کے آگے مجبور ہو گئے۔ پھر انہوں نے میرے چچا سے اس بابت پر بات کی۔ چچا نے کہا کہ آپ لوگ آ جائیں ابھی یہاں کے حالات اچھے بہتر ہیں۔

☆......☆......☆

ایک اتوار دوپہر دو بجے میرا دوست تابش اپنے گھر والوں سے اجازت لے کر آ گیا۔ پھر ابو ہمیں لے کر کراچی روانہ ہو گئے۔

حیدر آباد سے کراچی تک کا سفر گو کہ اتنا تھکا دینے والا نہ تھا مگر چونکہ ہم پہلی بار اتنا سفر کر رہے تھے اس لیے تھکن بھی ہو گئی مگر ہمیں اتنی خوشی تھی کہ ہم کچھ بھی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ پھر جب کراچی شروع ہوا تو ہمارے دمکتے چہرے دیکھ کر ابو مسکرانے لگے۔

ہم چچا کے گھر پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ ہمارے چچا لانڈھی میں رہتے تھے۔ جب ہم گھر پہنچے تو چچا نے ہمارے لیے چائے کے ساتھ اچھے خاصے ناشتے کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔

نہا دھو کر فارغ ہو کر ہم نے چائے پی اور ناشتے سے انصاف کیا۔ باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ابو نے کہا چلو اب ہمیں سونا چاہیے۔ مجھے کل واپس جانا ہے۔"

چچا نے کہا۔"بھائی آپ کون سا روز روز آتے ہیں۔ کام تو ہوتے رہیں گے۔"

چچا کے بے حد اصرار پر ابو تین دن کے لیے رُک گئے۔ مگر تیسرے دن ابو ہمیں چچا کے پاس چھوڑ کر واپس حیدر آباد چلے گئے۔

ابو کے ساتھ گھومنے پھرنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ہم اداس ہو گئے۔ چچا نے جب یہ دیکھا تو وہ ہماری اداسی دور کرنے کے لیے ہمیں سی ویو لے گئے۔

سمندر کے کنارے آ کر ہماری ساری اداسی دور ہو گئی۔ یہاں ہم نے خوب انجوائے کیا۔ یہاں آنے کے بعد ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ہم جادو نگری میں پہنچ گئے ہوں۔ یہاں سے کافی دیر بعد ہماری واپسی ہوئی تھی۔ گھر آ کر ہم کھانا کھاتے ہی سو گئے۔

دوسرے دن بھی ہمارا تھکن سے برا حال تھا۔ چچا ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر خود کام پر چلے گئے۔ ہم نے خوب آرام کیا۔ جس سے ہماری تھکن دور ہو گئی۔ وہ سارا دن ہم نے آرام کرتے گزارہ تھا۔ جاتے ہوئے ابو مجھے اچھے خاصے پیسے دے گئے تھے۔ پھر چچا بھی جیب خرچ منع کرنے کے باوجود دے دیا کرتے تھے۔ اسی لیے ہمیں پیسوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔

☆......☆......☆

اس دن شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ دوپہر ڈیڑھ بجے کا وقت ہو گا۔ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ سالن جو مجھے بالکل پسند نہ آیا تھا۔ جبکہ تابش کھانا کھا چکا تھا۔ تابش کھانے سے فارغ ہو کر اب آرام سے بیٹھا تھا اور مجھے بھی کھانا کھانے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا میں کسی بھی طرح کھانا کھانے کو راضی نہیں ہوں۔ تو کہنے لگا۔

"بھائی تو بازار سے کچھ لا کر کھا لے۔"

مجھے کافی دیر سے بریانی یاد آ رہی تھی۔ اس کا اظہار میں نے تابش سے کیا۔ تو وہ بولا۔

"اچھا جب ہی میں تو میں کہوں سالن کیوں اچھا نہیں لگ رہا۔ چلو بریانی ہی لا کر کھا لو۔"

میں نے کہا کہ بریانی لینے کے لیے میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ "تو بھی ساتھ چلے گا۔"

وہ کہنے لگا۔"مجھے تو معاف رکھ۔ اتنی گرمی میں میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ جو یوں باہر خوار ہوتا پھروں۔ نا بابا نا۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

اس کے انکار پر میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو پھر میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ ایسے ہی بھوکا رہوں گا۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر بولا۔

"اٹھ جلدی کر لیکن بتائے دیتا ہوں۔ آئندہ اتنی گرمی میں تیرے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں مت جانا ابھی تو چلو بھوک سے میرا برا حال ہے۔"

پھر ہم دونوں بریانی لینے چل دیے۔ باہر کافی سناٹا تھا۔ گرمی سے وجہ سے لوگ گھروں میں تھے۔



ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک جگہ سے گزر رہے تھے کہ ہمیں اپنے پیچھے کسی عورت کی آواز آئی جو ہمیں رُکنے کو کہہ رہی تھی۔ میں رُک گیا تو تابش نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور کہنے لگا سیدھا چل۔''

میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور کہا۔

''یار دیکھنے دے۔ نا جانے کیا وجہ ہو جو اس نے ہمیں روکا ہے۔'' یہ کہہ کر میں اس عورت کے پاس گیا۔ جو پردے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔

میں نے قریب جا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟''

وہ کہنے لگی کہ بیٹا مجھے چینی لا دو۔ میرے گھر میں چینی لانے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ مہربانی کر کے تم مجھے چینی لا دو۔''

اس کے التجائیہ انداز پر میں انکار نہ کر سکا۔ اور پیسے لینے کے لیے آگے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے کچھ مڑے تڑے نوٹ میرے ہاتھ میں تھما کر کہا۔''ان پیسوں میں جتنی چینی آئے لے آؤ۔''

میں پیسے لے کر اپنے دوست کے ساتھ چینی لینے چل دیا۔

ہم چینی لے کر آئے تو وہ عورت گھر کے اندر جا چکی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ تو اندر سے کسی عورت کی آواز آئی کہ اندر آ جاؤ۔''

میں اندر جانے لگا تو میرے دوست نے میرا ہاتھ پکڑ کر اندر جانے سے روکا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''یار پاگل ہو گئے ہو کیا۔'' اندر کیوں جا رہے ہو، بس یہیں سے چینی دے اور چل۔'' پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے زور سے آواز لگائی۔

''آنٹی چینی لے لیں۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

''بیٹا! تمہاری مہربانی ہو گی تم چینی مجھے اندر آ کر دے جاؤ۔ مجھے چکر آ رہے ہیں مجھ سے چلا نہیں جا رہا ہے۔''

میں نے جیسے ہی اندر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ تابش نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

''او بھائی کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیوں جان بوجھ کر کسی مشکل میں گرفتار ہونا چاہتا ہے۔'' ہم یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہو گئی تو ہماری باتوں پر کون یقین کرے گا۔'' اس کے سمجھانے پر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ کہ واقعی مجھے اندر نہیں جانا چاہیے۔

میں نے پھر ایک بار آواز لگائی۔''آنٹی پلیز یہ چینی اور پیسے لے لیں جلدی کریں۔''

میں تھوڑی دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ جب وہ آنٹی آئیں اور نہ ہی ان کی آواز تو میں نے تابش سے کہا۔ تم ادھر ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔'' پھر اس کے منع کرنے کے باوجود میں اندر چلا گیا۔

گھر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک پلنگ تھا۔ جس پر کوئی سفید چادر منہ تک اوڑھے لیٹا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ شاید اس کا دماغ خراب تھا۔ جو اس قدر شدید گرمی میں صحن کے بیچ پڑے اس پلنگ پر جہاں دھوپ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور وہ بڑے مزے سے دھوپ سینک رہا تھا۔ جیسے گرمیوں کی نہیں سردیوں کی دھوپ ہو۔

میں نے پلنگ سے نظریں اٹھا کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ سامنے کچن تھا، اس کے برابر میں کمرہ تھا۔ گھر مکمل سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے اس خاموشی سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ جب مجھے وہ آنٹی نظر نہ آئیں تو میں نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''آنٹی! آنٹی! آپ کہاں ہیں۔ پلیز اپنا یہ سامان لے لیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'

صحن کے بیچ پلنگ پر لیٹے اس وجود سے آواز آئی۔

''یہاں دے جاؤ۔''

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی گرمی میں دھوپ میں پلنگ پر چادر اوڑھ کر لیٹنے کی کیا تک ہے۔ میں نے ذرا غور سے اس وجود کو دیکھا جو بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس وجود کو دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ پھر میں نے ہمت کر کے اس پلنگ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد اب اس گھر سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے چینی اور پیسے اس عورت کے ہاتھ کی طرف رکھے اور ان سے کہا۔

''آنٹی میں نے پیسے اور چینی رکھ دی ہے آپ اٹھا لیجیے گا۔''

باہر سے تابش کی آواز آئی۔''یار تُو وہاں کیا کرنے لگا جلدی باہر آ۔''

میں نے جیسے ہی باہر جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے مجھے اپنے پیچھے اسی عورت کی آواز آئی۔

''سنو بیٹا!''

میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ عورت اب بھی چادر منہ پر ڈالے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر قریب جا کر جیسے ہی اس عورت کے منہ پر سے چادر سرکائی۔ میں ڈر کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

پلنگ پر لیٹے اس وجود کا دھڑ تو اس عورت کا تھا مگر سر کسی بکرے کا تھا۔ جو انتہائی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اتنا بھیانک منظر نہ دیکھا تھا۔ خوف و دہشت سے میں اپنی جگہ پر سن کھڑا تھا۔ قبل اس کے کہ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑتے۔ اس وجود میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ وہ پلنگ سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اُس کا رُخ میری طرف تھا۔

یہ دیکھ کر مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی اور مجھ پر ایسی گھبراہٹ سوار ہوئی کہ بجائے دروازے سے باہر نکلنے کو جہاں کھڑا تھا۔ اسی دیوار پر چڑھ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیوار اتنی اونچی نہ تھی۔ جس پر چڑھا نہ جا سکے۔ مگر بدحواسی میں، میں ٹھیک طرح دیوار چڑھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے اپنے پیروں پر اس عورت کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس ہوا۔ میرے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

جب مجھے ہوش آیا تو پہلے تو میری سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا کہ مجھے ہوا کیا ہے۔ پھر تابش پر نظر پڑی تو مجھے تمام واقعہ نئے سرے سے یاد آ گیا۔ تابش نے کہا۔''شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔''

''یار تم مجھے یہاں کیسے لائے۔''

''چھوڑو اس قصے کو۔'' تابش نے ٹالتے ہوئے کہا۔

لیکن میرے بار بار اصرار کرنے پر اس نے بتایا کہ جب اُس نے میری چیخ کی آواز سنی تو دوڑ کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا میں دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو وہ عورت میرے پیر پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ عورت میری طرف لپکی۔ میں نے قرآنی آیات پڑھنی شروع کر دیں۔ جس سے وہ عورت چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں فوراً باہر بھاگا اور اس دیوار کی طرف گیا۔ جس پر تم آدھے اندر اور آدھے باہر کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔ تمہاری چیخ سن کر وہاں ایک صاحب آ گئے تھے۔

میں نے ان کی مدد سے تم کو دیوار سے اتارا۔

اس دوران وہاں ایک دو اور لوگ بھی آ گئے تھے۔ ان کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو ان میں سے ایک صاحب بولے۔

''ارے بیٹا! یہ گھر تو کئی دنوں سے بند پڑا ہوا ہے۔ اور ایک دو لوگوں نے اس گھر میں کرائے پر رہنے کی کوشش کی تھی، مگر ان کے ساتھ ایسے واقعات ہوئے کہ وہ دو تین دن کے اندر اندر گھر چھوڑ کر فرار ہو گئے۔''

میں نے کہا کہ انکل یہاں سے میرے دوست کو لے کر چلیں۔ پھر ان کی مدد سے ایک رکشے میں ہی ڈال کر میں تم کو یہاں لایا ہوں۔ انہوں نے راستے میں بتایا تھا کہ اس گھر میں ایک عورت کا قتل ہو گیا تھا۔ قاتل کوئی اور نہیں اس کا اپنا شوہر تھا۔ اس نے عورت کو کیوں قتل کیا۔ اس کی وجہ کوئی نہیں جان سکا۔ وہ دونوں اس گھر میں کرائے پر رہتے تھے اور اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں گئے۔ مطلب یہ کہ صرف بیوی کی لاش ملی تھی۔ شوہر کی نہ تو لاش ملی نہ وہ خود ملا اس لیے زیادہ لوگوں کا خیال ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی کو قتل کیا اور پھر خود فرار ہو گیا۔''

''تم بتاؤ تم نے ایسا کیا دیکھا۔ جو اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے۔'' تابش نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جو کچھ وہاں دیکھا تھا۔ تابش کو بتایا تو وہ پہلے تو حیران ہوا۔ پھر کہنے لگا سچ ہے کہ جو لوگ ناگہانی موت مر جاتے ہیں۔ ان کی روح بھٹکتی ہے۔ شاید اس عورت کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔''

☆......☆......☆

شام کو چچا آئے تو ہم نے انہیں بھی اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ تو وہ بھی ناراض ہونے لگے کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں بھائی جان کو کیا جواب دیتا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے تمہیں کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔''

اس واقعے کے تین چار دن بعد ہم واپس حیدرآباد آ گئے۔

اس واقعے کو گزرے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر اب بھی خوف محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایک روح سے بات کی تھی۔

☆☆......☆☆



ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، سنسنی خیز سلسلے کی گیارہویں کڑی

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی

شکل عالی سے مشابہہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہوگئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہم شکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزار دو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزار دو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کوردتی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کوردتی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

لیزا نے آہستہ سے شاہ زیب کے کان میں کہا ’’ذرا ان رقص کرنے والوں کے بدن کی پھڑکتی ہوئی بوٹیاں تو دیکھو یوں لگتا ہے کہ جسم کی بوٹی بوٹی الگ ہو جائے گی۔‘‘

’’مجھے تو کچھ اور بھی لگتا ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’ہم جس طرح ان کے درمیان گھس آئے ہیں اس رقص کے بعد کہیں ہمارے بدن کی بوٹی بوٹی بھی الگ نہ ہو جائے۔‘‘

’’اوہ.. نہیں.. اب افریقہ اتنا غیر مہذب نہیں رہا جتنا قصے کہانیوں میں بیان کیا جاتا ہے، ہاں اس کے انتہائی اندرونی علاقے کی بات میں نہیں کرتی جہاں آدم خور وغیرہ بستے ہیں، باقی علاقے تہذیب کی روشنی سے کسی حد تک آشنا ہو چکے ہیں۔ اب تمہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی اسکول نظر آئیں گے جہاں ملکی اور غیر ملکی مشنریاں ان لوگوں کو تعلیم دیتی ہیں، تم نے محسوس نہیں کیا کہ انہوں نے ہمیں اجنبی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ بہت سے مشن یہاں آتے رہتے ہیں، بہت سے ممالک یہاں مختلف منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ چینی باشندے چاک اور سیمنٹ کی فیکٹریاں چلا رہے ہیں۔ روسی ماہرین سونے کی کانیں دریافت کر رہے ہیں۔ پولینڈ والے کھاد کے کارخانے لگائے ہوئے ہیں لہٰذا افریقہ کے یہ علاقے اب اتنے پس ماندہ نہیں رہے۔‘‘

یہ لوگ سرگوشیوں کے انداز میں باتیں کرتے رہے، رقص اپنی آخری کیفیت میں پہنچ گیا تھا۔ رقاص لڑکیاں رقص کر رہی تھیں، اچانک شاہ زیب نے ایک لڑکی کو اپنے قریب آ کر رکتے ہوئے دیکھا اس کا قد کسی بھی طرح چھ فٹ سے کم نہیں تھا، اس نے اپنے چہرے پر نقش و نگار بنائے ہوئے تھے، لیکن ایک بات ذرا حیرت ناک تھی وہ یہ کہ اس کے نقوش میں بھدا پن نہیں تھا جو افریقی لڑکیوں میں پایا جاتا تھا، نہ موٹے ہونٹ نہ چوڑی ناک، چہرے کی بناوٹ بھی کتابی تھی، شاہ زیب ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔

لڑکی کی عجیب نگاہیں اسے اپنے دماغ میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ کوئی دس پندرہ سیکنڈ تک وہ شاہ زیب کے سامنے کھڑی رہی، اور اس کے بعد ڈھول کی تھاپ پر تھرکتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ شاہ زیب نے لیزا کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

’’آؤ شاہ زیب یہاں سے چلیں۔‘‘

’’کیا بات ہے لیزا، تمہارا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔‘‘

’’نہیں کوئی بات نہیں، بس کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ ویسے بھی اب رقص ختم ہونے والا ہے، آخری

مراحل میں ہے۔‘‘ لیزا کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈھول بند ہو گئے اور ایک دم سکوت چھا گیا۔ شاہ زیب نے لیزا کا ہاتھ پکڑا اور یہ لوگ واپسی کے لیے مڑ گئے۔

وہ کچھ خاموش خاموش سی تھی، یہ لوگ دریا کے کنارے اسی جگہ آ گئے جہاں کشتی موجود تھی، لیزا نے صاف اور ہموار جگہ دیکھ کر وہاں پر ڈیرہ ڈال دیا، کشتی سے کچھ چیزیں اتار کر زمین پر بچھا دی گئیں، شاہ زیب نے لیزا سے پوچھا ’’کیا تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟‘‘

’’اگر تم کہو تو تمہارے لیے بندوبست کر دوں؟‘‘

’’نہیں... مجھے بھوک نہیں لگ رہی، لیکن ایک سوال میں تم سے ضرور کروں گا۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’تم اچانک کچھ سنجیدہ سی ہو گئیں۔‘‘

’’ہاں.. جانے کیوں اس لڑکی کا اچانک تمہارے سامنے اس طرح کھڑے ہو جانا مجھے ناگوار گزرا ہے۔ عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟‘‘

’’ہاں محسوس کیا تھا، تمہارا کیا خیال ہے، کیا بات ہو سکتی ہے؟‘‘

’’کچھ نہیں، یہ لوگ اب بھی کہیں کہیں پسماندہ ہیں، لڑکی تمہاری طرف متوجہ نہ ہو گئی ہو، اگر ایسا ہے تو وہ تمہارے لیے مشکل بن سکتی ہے۔‘‘

’’اوہ....‘‘ شاہ زیب ہنس پڑا ’’اچھی بات ہے افریقہ کی اس مہم میں کم از کم یہ تجربہ بھی ہو جائے گا۔‘‘

لیزا نے پہلی بار ایسی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو، اس کے ہونٹ کپکپائے اور پھر وہ ہنسنے لگی۔

’’ہاں ٹھیک ہے، اگر وہ تمہاری طرف راغب ہو جائے تو پھر تم یہیں رہ جانا۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’ظاہر ہے وہ تمہارے ساتھ تو یہاں سے جائے گی نہیں۔‘‘

’’ارے باپ رے.. اس کا مطلب...؟‘‘

’’ہاں ہاں کوئی ہرج نہیں ہے، یہاں کی زندگی اتنی بری تو نہیں ہے۔‘‘

’’تم نے مجھے خوفزدہ کر دیا ہے لیزا، میں ایسا بھیانک تجربہ بھی نہیں چاہتا، چلو ابھی اسی وقت یہاں سے نکل چلیں، میں خوفزدہ ہو گیا ہوں۔‘‘

لیزا پھر ہنسنے لگی ’’بس اتنی دلچسپی ہے تمہیں ایڈونچر سے؟‘‘

’’ہاں اگر صورت حال ایسی ہو تو پھر اتنی ہی دلچسپی لینا کافی ہے۔‘‘ شاہ زیب نے کہا اور وہ ہنستی رہی، وہ لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

’’اوکے.. شب بخیر۔‘‘ شاہ زیب نے جواب دیا اور لیزا کروٹ بدل کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

شاہ زیب اس کے انداز پر غور کر رہا تھا، یورپ میں لڑکیاں بہت بے باک ہوتی ہیں، شاہ زیب نے ایسی افریقی لڑکیوں کو بھی دیکھا تھا جو یورپ کی آبادیوں میں وہاں کے باشندوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئی تھیں، لیکن لیزا کے اندر ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ بالکل مشرقیت کا حامل... جانے کتنی دیر اس کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر نیند آ گئی۔

شاہ زیب کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کتنی دیر سویا ہے، یکا یک ہی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے ایک نسوانی ہاتھ کو اپنی گردن میں حمائل ہوتے محسوس کیا، حواس جاگ گئے شاہ زیب نے سوچا کہ یا تو لیزا نے سوتے میں کروٹ بدلی ہے یا پھر ماحول اس پر اثر انداز ہو گیا ہے۔ شاہ زیب نے آنکھیں کھول کر اس کا چہرہ دیکھا لیکن دوسرے لمحے شاہ زیب بری طرح اچھل پڑا، اس کے سامنے چاند کی روشنی میں ایک چہرہ نمایاں تھا، آدھا سفید اور آدھا نیلا، یہ وہی

لڑکی تھی جو رقص کے دوران اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے آنکھیں دھوکہ دے رہی ہوں۔ شاہ زیب پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس طرح اٹھ جانے سے اس کا بازو شاہ زیب کی گردن سے نکل گیا تھا، شاہ زیب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر لڑکی کی طرف دیکھا وہ عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں پراسراری چمک تھی۔ پھر شاہ زیب نے گردن گھما کر لیزا کو دیکھا جو نہایت بے ترتیبی سے سو رہی تھی۔ جنگلی لڑکی کچھ دیر اسی طرح بیٹھی شاہ زیب کو دیکھتی رہی، پھر اٹھ گئی اور اس کے بعد اسی پراسرار انداز میں چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئی، شاہ زیب کے اوسان خطا تھے اس کی اسی طرح آمد، یہ بے تکلفی اور پھر خاموش واپسی بے حد پراسرار تھی، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

شاہ زیب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے اس چھوٹی قیامت کو وہ عقب سے دیکھتا رہا۔ پراسرار چاندنی میں وہ ست روی سے آگے بڑھ رہی تھی اور اس کے وجود میں پھریریاں سی دوڑ رہی تھیں۔ چلتے ہوئے وہ عقب سے اتنی حسین نظر آرہی تھی کہ ذہن بھٹک جائے، لیکن شاہ زیب جیسے آدمی کا ذہن کہاں بھٹکتا ہے جس کی زندگی ہی خوف و ہراس سے عبارت ہوگئی ہو، شاہ زیب کے دل میں اس کے وجود کی دلکشی سے زیادہ اپنی سلامتی کی فکر پیدا ہوگئی تھی۔ یہ نئی مصیبت کہاں سے گلے پڑ رہی تھی۔

وقت اب تک شاہ زیب کو اپنے ساتھ لے کر سفر کر رہا تھا اور اس کے اندر ایک نئی تبدیلی ہوجاتی تھی۔ لیزا کے ساتھ یہاں تک آنے کا پروگرام نہیں تھا۔ یہ سارا پروگرام اس نے خود ہی بنایا تھا ورنہ شاہ زیب کبھی اس کی ہمت نہ کر پاتا۔ شاہ زیب دیکھتا رہ گیا اور وہ پراسرار ساحرہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ لیزا ایسے پیارے انداز میں سو رہی تھی کہ دل خواہ مخواہ دھڑکنے لگا، اس نے آنے والی بلا پر لعنت بھیجی۔ اس سے بہتر تو لیزا کا نظارہ تھا جو چاندنی کی دلہن بنے زمین پر بے ترتیب پڑی ہوئی تھی۔ شاہ زیب اس سے نظریں ہٹا کر پھر پراسرار ساحرہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکی تھی کون، کیا چاہتی ہے یہ، صحرائے اعظم کی یہ حسینہ اگر لیزا کے بیان کے مطابق مہربان ہوگئی تو اس کا کیا بنے گا۔ کیا شاہ زیب کی کیفیت ان بے شمار مہم جوؤں کی سی نہ ہوگی جو کسی جنگلی لڑکی کی قید میں زندگی کے دن تڑپ کر گزار دیتے ہیں۔ لیزا نے کراہ کر کروٹ بدلی تو وہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آگیا۔ اس حسینہ کا تصور ذہن سے محو نہیں ہوا تھا، بیٹھے بیٹھے تھکن ہونے لگی تو وہ لیٹ گیا۔ کیا فائدہ اب ان احمقانہ سوچوں میں پھنسے رہنے کا وہ جو کچھ بھی چاہتی ہے اگر فطرت کے مطابق غور کیا جائے تو کوئی عجیب بات نہیں تھی، لیکن شاہ زیب نے بھی ابھی تک کسی لڑکی سے آگے بڑھ کر عشق نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ اس قسم کی کوئی حرکت کرنا چاہتا تھا۔

ذہن میں سناٹے در آئے، نیند شاید حملہ آور تھی، پکی نیند جاگا تھا، پھر اس لڑکی کی بانہوں کا خیال آیا، دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہو، اس کے وجود کی نزاکتیں یکساں ہوتی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ شاہ زیب اب تک ان سب سے بچتا چلا آیا تھا۔ شاہ زیب الجھنوں میں گھرا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ سورج کی کرنوں نے پپوٹوں میں سرخ رنگ بکھیر دیا اور لیزا نے زور سے جھنجھوڑا تو وہ اٹھ گیا، لیزا کو دیکھا اور پھر خوفزدہ نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاہ زیب سمجھا تھا کہ وہ طلسمی حسینہ پھر سے واپس آگئی ہے لیکن یہ بات نہیں تھی طلسمی حسینہ تو نہیں آئی تھی لیکن سورج کی کرنیں افریقہ کی روایتی گرمی جذب کر کے بدن میں چبھنے لگی تھیں، شاہ زیب بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیزا نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''کیا بات ہے، کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟''

''خواب...'' شاہ زیب نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے کسی بھیانک خواب سے چونک گیا ہوں۔''

''آہ... لیزا بھیانک خواب تو میں جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا رہتا ہوں۔''

''آنکھوں سے تو تم صرف مجھے دیکھتے ہو، کیا میں کوئی بھیانک خواب ہوں۔''

''ارے نہیں، میرا مطلب ہے کہ صحرائے اعظم کی زندگی ہولناک واقعات اور ہمارے ساتھ پیش آنے والے یہ حادثات سب کچھ ایک بھیانک خواب ہی تو ہیں۔'' شاہ زیب نے جلدی سے بات برابر کرنے کی کوشش کی۔

''خیر اگر تم مجھے بھی ایک بھیانک خواب قرار دیتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جو تمہارا دل چاہے سمجھو۔''

''غلط فہمیوں کا شکار ہوکر میں تم سے جھگڑا نہیں کروں گا۔ درحقیقت یہاں کی زندگی سے کچھ الجھن سی ہونے لگی ہے۔''

''کمال ہے، مہم جو تو یہاں اپنی آدھی عمر گزار دیتے ہیں۔''

''میں صرف آوارہ گرد ہوں اور مہمات سے میرا واسطہ نہیں پڑا۔''

''اچھا اب فضول باتیں چھوڑو اور ناشتا کرلو، مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔''

لیزا نے کھانے پینے کی اشیاء سجادیں اور شاہ زیب اس کے ساتھ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ اس کے دل میں بار ہا یہ خیال آیا کہ وہ لیزا کو اس عجیب و غریب لڑکی کے بارے میں بتائے لیکن یہ اس کا تجربہ تھا کہ لڑکیاں کہیں کی بھی ہوں ان کے سوچنے کا انداز ایک ہی ہوتا ہے، اگر بدقسمتی سے کبھی لیزا کے عالم ہوش میں وہ لڑکی شاہ زیب کے سامنے آگئی تو لیزا کی نگاہیں قابل دید ہوتیں اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ لیزا اسے چھوڑ کر یہاں سے چلی جائے۔ کم از کم لیزا کی موجودگی میں اس بات کے امکانات تو تھے کہ ایک بار پھر مہذب زندگی میں لوٹ جاؤں گا، ہر چند کہ شاہ زیب لیزا کو اس سلسلے میں مجبور نہیں کرسکتا تھا لیکن یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن وہ بھی اکتا کر ضرور شاہ زیب سے کہے گی کہ چلو یہاں واپس چلتے ہیں اور شاہ زیب اس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

''کیا خیال ہے اب یہاں سے چلا جائے؟'' ناشتے کے بعد لیزا نے کہا۔ ''میں نے آگے کے راستوں کا تعین کرلیا ہے۔''

''آگے کے لیے؟'' شاہ زیب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''پھر؟''

''مم... میں سمجھا پیچھے کے لیے۔''

''نہیں ڈیئر شاہ زیب، ابھی تو صحرائے اعظم کے حسین ترین علاقے باقی ہیں، جب یہاں تک آئے ہو تو کم از کم دل میں یہ حسرت لے کر تو نہ جاؤ کہ صحرائے اعظم کے ان علاقوں کو تم نے نہیں دیکھا جو روایتی حیثیت کے حامل ہیں۔''

شاہ زیب نے دل ہی دل میں کہا کہ محترمہ، میری حسرت تو کچھ اور ہی ہے، لیکن کیا کروں میری حسرتیں بھی میری طرح بدنصیب ہیں، ورنہ جہاں تک روایتوں کا تعلق ہے میری اپنی روایات ایسی عجیب و غریب ہیں کہ اگر تفصیلات بتادوں تو آپ کبھی یقین نہ کریں گی یا اگر یقین کرلیا تو مجھے داغ مفارقت دے جائیں گی، چنانچہ شاہ زیب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموشی سے گردن ہلادی۔

''اب ہم یہاں سے نیا سافال چلیں گے۔'' لیزا نے کچھ دیر بعد کہا ''ہماری کشتی یہیں رہے گی اور ہم ان لوگوں سے گھوڑے حاصل کرلیں گے۔''

''یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ممکن ہوسکتا ہے؟'' شاہ زیب نے کہا۔

لیزا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیوں نہیں، اب تک ہمیں کون سی دقت ہوئی ہے؟''

جواب میں شاہ زیب نے گردن ہلادی تھی، لیزا خاصی دیر تک وہاں رکی اور اس کے بعد بستی میں آگئی جو بلاشبہ قدیم و جدید کا امتزاج تھی، ایک طرف ننگ دھڑنگ وحشی ادھر سے ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے تو دوسری طرف اس قسم کے انتظامات بھی تھے جن سے یہ احساس ہو کہ وہ بالکل ہی غیر مہذب نہیں ہیں۔ لیزا نے گھوڑوں کے سلسلے

میں کسی سے گفتگو کی اور پتا نہیں کس انداز میں معاملات طے کر لیے وہ شخص انہیں اپنے ساتھ لے گیا اور دو چاق و چوبند توانا گھوڑے ان دونوں کے حوالے کر دیے۔ ضمانت کے طور پر کشتی اس کے سپرد کر دی گئی تھی۔ دیر ضروری تیاریوں کے بعد یہ لوگ نیاسافال کی طرف چل پڑے۔

تنگ درے پر پیچ گھاٹیاں درخت جنگل، تقریباً چار یا پانچ گھنٹے تک گھوڑوں کا یہ سفر مسلسل کرنا پڑا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ سفر کی رفتار تیز نہ تھی لیکن گھوڑوں کی پشت پر چار یا پانچ گھنٹے گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام ہڈیاں زبان حال سے چیخنے لگیں اور کم از کم شاہ زیب یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہڈیاں درد سے کراہ رہی ہیں، لیکن اس نے لیزا سے کوئی سوال نہیں کیا کہ یہ شان مردانگی کے خلاف تھا۔

پانچ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد ان لوگوں نے ایک سر سبز اور ہرے بھرے میدان میں قیام کیا۔

''کیا یہی نیاسافال ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''نہیں ظاہر ہے چار پانچ گھنٹے کے اس سفر کے بعد اب گھوڑوں میں بھی سکت نہیں رہی تھی کہ وہاں تک مزید دوڑ سکیں اور اس کے علاوہ ہم لوگ بھی تھک گئے ہیں۔ کل صبح تین گھنٹے کا سفر مزید کرنا پڑے گا اور اس کے بعد ہم نیاسافال پہنچ جائیں گے۔''

تقریباً آٹھ گھنٹے کا سفر، اف میرے خدا واپسی میں اگر یہ سفر مستقل کرنا پڑا تو کیا ہوگا؟''

''یہ تو تم پر منحصر ہے ڈیئر، کیا ضروری ہے کہ ہم مسلسل سفر کریں میں تو دراصل اس جگہ پہنچنا چاہتی تھی اس لیے میں نے مسلسل چار پانچ گھنٹے سفر کر ڈالا اور پھر ہمارے پاس وقت بھی تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں وقت ضائع کیا جائے۔''

شاہ زیب نے فوراً تائید میں گردن ہلا دی، لیزا نے شاید شاہ زیب کے طنزیہ انداز کو محسوس نہیں کیا تھا اس کے بعد وہی معمولات.. کھانا پینا، گہری نیند.. سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہوا تھا۔ صبح کو بھی معمول کے مطابق آنکھ کھلی۔ لیزا نے ناشتا شاہ زیب کے سامنے رکھ دیا اور ہنس کر بولی۔

''تم اپنی دھن کے پکے ہو ڈیئر شاہ زیب۔''

''کیوں، تمہیں یہ بات کیوں سوجھی؟''

''بس ایسے ہی...'' یہ کہتے ہوئے اس کا انداز عجیب سا ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے کہا۔

''آخر یہ نیاسافال کیا چیز ہے جس کے لیے ہم اتنا لمبا سفر طے کر رہے ہیں۔''

''حسین ترین جگہ، علاقائی حیثیت سے بے مثال، نیاسافال سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر گرین لیک ہے، تم اسے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ صاف و شفاف لیکن سبز پانی.. جبکہ لیک کی گہرائی میں کائی بھی نہیں ہے، سبزی بھی قدرتی ہے، اگر تم اس جھیل سے پانی نکالو گے تب بھی تمہیں یہ کسی برتن میں صاف نظر آئے گا۔''

''گڈ.. کہیں یہ چشمہ حیات تو نہیں؟''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''آب حیات کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟''

''نہیں تم مجھے بتاؤ۔''

''چشمہ حیات.. جس میں سے چند قطرے پینے کے بعد انسان ابد تک کے لیے جیتا ہے۔''

''توبہ... ایسا جینا بھی کس کام کا؟''

''کیوں؟''

''بڑھاپا کتنی بدترین چیز ہوتی ہے تم نے غور نہیں کیا؟''

''مگر آب حیات پینے کے بعد انسان بوڑھا بھی نہیں ہوتا۔'' شاہ زیب نے بیزاری سے کہا۔

''مگر تم یہ بتاؤ کہ نیاسافال جا کر ہم کیا کریں گے؟''

''اب تک کیا کرتے رہے ہیں؟'' لیزا نے الٹا شاہ زیب سے سوال کر دیا۔

''میرے خیال میں کچھ نہیں۔''

''تو پھر وہاں جا کر بھی کچھ نہیں کریں گے بس خوبصورت جگہ ہے اور میں تمہیں اس علاقے سے پوری طرح روشناس کرا دینا چاہتی ہوں، ویسے تم سے ایک بات کہوں تمہیں خوشی ہوگی۔''

''ہاں ہاں... کہو بہت عرصے سے میں خوشیوں کو ترسا ہوا ہوں۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''وہاں بہت سے سیاح آتے ہیں، ہو سکتا ہے تمہیں وہاں مختلف ملکوں کے لوگ نظر آ جائیں''

''کیا واقعی؟'' شاہ زیب خوشی سے اچھل پڑا، ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں امید کی شمع روشن ہوئی تھی، انہی میں سے کوئی ایسا سیاح نظر آ جائے جس نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا ہو اور شاہ زیب کو اس کی خدمت کرنے کا موقع مل جائے، لیزا کو اگر دھوکہ دینا پڑے تو کوئی ہرج نہیں ہے، وہ ان علاقوں کی رہنے والی تھی، واپس چلی جائے گی، لیکن شاہ زیب کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔

شاہ زیب نیاسافال جانے کے لیے خوشدلی سے تیار ہو گیا تھا، گھوڑوں کی ننگی پشت بلاشبہ گوشت سے پر تھی، اگر گھوڑے اس قدر جاندار نہ ہوتے اور ان کی پشت پر سوکھی ہڈیاں ہوتیں تو پھر خدا ہی حافظ تھا، یہ لوگ بغیر زین کے سفر کرتے رہے، تین گھنٹے کا مسلسل سفر مصیبت ثابت ہوا تھا لیکن لیزا پر سکون نظر آ رہی تھی۔

پھر نیاسافال کا سلسلہ شروع ہو گیا.. آسمان کی بلندیوں سے پانی گر رہا تھا، بڑی بڑی سفید دھاریں حسین شکل میں بہت دور تک ایک پہاڑی دیوار سے نیچے لڑھک رہی تھیں، نیچے ایک پر شور ندی بہہ رہی تھی، اطراف کے علاقے اس قدر سر سبز اور حسین تھے کہ الفاظ میں بیان مشکل ہے، جہاں تک نگاہ جاتی برف پوش چوٹیاں اور سبزہ زار نظر آتے۔ شاہ زیب اس علاقے میں آ کر کھو گیا، لیکن شاہ زیب کی نگاہ اطراف میں بھٹک رہی تھی، اکا دکا خیمے نظر آ رہے تھے اور شاہ زیب ان خیموں کے نزدیک صرف اس نظریے سے پہنچا تھا کہ ممکن ہے کچھ غیر ملکی سیاحوں سے ملاقات ہو جائے، لیکن غیر ملکی سیاحوں کو بھی پتا چل گیا تھا کہ شاہ زیب یہاں آنے والا ہے اور اس کا ساتھ جو بھی حاصل کرتا ہے اس کے لیے مصیبتیں کھڑی ہو جاتی ہیں، چنانچہ اتفاق سے غیر ملکی ایک بھی نہیں تھا، البتہ افریقہ کے مختلف حصوں سے لوگ آئے ہوئے تھے جو نیم مہذب تھے، چنانچہ ان سے ملاقات کرنا بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔ شاہ زیب اور لیزا نے بھی ایک جگہ ڈیرہ ڈال دیا، گو ان کے پاس خیمہ نہیں تھا لیکن یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی، آسمان ابر آلود تھا اور آبشار کی وجہ سے ماحول میں ایک حسین خنکی رچی ہوئی تھی۔

''کہو کیسی جگہ ہے؟'' لیزا نے شاہ زیب سے سوال کیا۔

''بے حد حسین... تمہاری موجودگی نے اسے اور بھی حسین بنا دیا ہے۔''

''جب تم یہ الفاظ ادا کرتے ہو تو مجھے ہنسی آنے لگتی ہے۔'' لیزا نے کہا۔

''کیوں؟'' شاہ زیب نے متعجبانہ انداز میں منہ کھول دیا۔

''تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو کسی کی موجودگی سے متاثر ہوتے ہیں۔''

''اوہ نہیں... ایسی بات نہیں ہے ڈیئر.. دراصل میں جن لوگوں میں سے ہوں، ان کے بارے میں ذرا کم ہی لوگوں کو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔''

''ہاں... مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم بے حد عجیب انسان ہو۔''

''ویسے مجھے تم پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک چھوٹی سی بات پر مجھے کس قدر اہمیت دی ہے۔''

''چھوٹی سی بات؟''

''ہاں تمہارے پاپا کے سلسلے میں میں نے تھوڑا سا کام کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں تم نے اپنا قیمتی وقت

میرے ساتھ ضائع کر دیا۔‘‘
لیزا شاہ زیب کو عجیب سے انداز میں دیکھنے لگی، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔
’’نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، پاپا کا مسئلہ اسی وقت ختم ہو گیا تھا۔‘‘
’’پھر؟‘‘
’’اس پیکر کے آگے ایک طویل دیوار ہے جسے عبور کرنے کے لیے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو جرأت کرنا ہوگی۔‘‘ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ شاہ زیب خاموش ہی ہو گیا تھا، اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ اس دیوار کو عبور کرنے کی جرأت نہ کی جائے، پتا نہیں اس دیوار کے دوسری طرف کیا موجود ہو۔
ان لوگوں نے نیاسا فال پر پورا دن گزارا اور اس کے بعد لیزا دوسری صبح شاہ زیب کو ساتھ لے کر گرین لیک چل پڑی، اس بات پر اس نے بہت مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ اتفاق سے ان دنوں میں یہاں سیاح موجود نہیں ہیں۔
گرین لیک واقعی دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھا، پانی واقعی سبز تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ اس علاقت میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی سمندر نما جھیل بلاشبہ بالکل سبز ہی تھی اس کا پانی بھی ہاتھوں میں لے کر دیکھا، اس میں ہلکی سی سبزی کی آمیزش پائی تھی۔
’’کہو اتنی عجیب چیز کو نہ دیکھتے تو کیا بعد میں اس کا افسوس نہ ہوتا۔‘‘ لیزا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
’’ہاں... یقیناً حیرت انگیز بات ہے کیا اس کا کبھی کیمیاوی تجزیہ کیا گیا ہے؟‘‘
’’بے شمار بار، لیکن ابھی تک اس کے بارے میں کوئی حتمی رپورٹ شائع نہیں ہوئی کہ اس کے پانی کا رنگ سبز کیوں ہے؟‘‘
’’پینے میں یہ پانی کیسا ہے؟‘‘
’’پی کر دیکھو۔‘‘
’’کہیں میرے سر پر سبزہ تو نہیں اگ آئے گا؟‘‘
’’نہیں تم بالکل ٹھیک رہو گے۔‘‘
شاہ زیب نے پانی چکھ کر دیکھا، واقعی شیریں تھا، افریقہ میں ایسے عجائبات کی کمی نہیں ہے، ویسے گرین لیک کے آس پاس کافی جانور کلیلیں کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے، شکاریوں کے لیے تو یہ جگہ جنت سے کم نہیں تھی۔ یہ لوگ دیر تک گرین لیک کے آس پاس کے علاقوں کی سیر کرتے رہے۔
’’کیا خیال ہے یہیں رکو گے یا واپسی کا سفر کریں۔‘‘ لیزا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
’’کیوں.. کیا یہاں قیام نہیں کرو گی؟‘‘
’’بے مقصد ہی رہے گا۔‘‘ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں لیزا اور کیا کہہ سکتی تھی، یہ الفاظ بھی نجانے اس نے کتنی مشکل سے ادا کیے تھے۔
شام کے جھٹپٹے فضاؤں میں اتر آئے تھے۔ زمین پر دھند لکا سا پھیلتا جا رہا تھا۔ گرین لیک کے آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا، ویسے بھی اب یہ بھیانک ویرانے عادت بن گئے تھے۔ شاہ زیب اور لیزا واپس چل پڑے۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ جھیل کے ساتھ ہی کسی خوبصورت جگہ کا انتخاب کر کے قیام کے انتظامات کیے جائیں گے۔ گھوڑے سست رفتاری سے چل رہے تھے کہ اچانک ہی کچھ ہوا۔ ایک ہلکی سی سرسراہٹ شاہ زیب نے بھی سنی اور اس کے ساتھ ہی لیزا کے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ابھری اور وہ الف ہو گیا، لیکن اس نے دونوں پاؤں اٹھا کر نیچے رکھنے کی کوشش کی تو اوندھے منہ زمین پر آ رہا اور وہ نیچے گر پڑی۔
شاہ زیب کی سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آیا، لیکن اس نے ایک عجیب و غریب مڑی سی شے ضرور دیکھی جو گھوڑے کے اگلے پیروں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی، سنسناہٹ اسی کی وجہ سے تھی، ابھی شاہ زیب لیزا کے سلسلے میں

کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اس کا گھوڑا بھی اس طرح الف ہو گیا اور شاہ زیب نے پھرتی سے اپنے بدن کو سادھ لیا تاکہ گھوڑا منہ کے بل بھی گرے تو کم از کم وہ سر کے بل نیچے نہ آئے، لیکن شاہ زیب کے گھوڑے کے دونوں پاؤں سلامت تھے۔ اس نے اگلے دونوں پاؤں زمین پر مارے اور ایسا جان توڑ کر بھاگا کہ شاہ زیب کو اپنے آپ کو گھوڑے کی پشت پر قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔
شاہ زیب کے منہ سے ارے ارے کی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ گھوڑے کی لگام مضبوطی سے پکڑے ہوئے اس سے چمٹا رہا ورنہ یقینی طور پر نیچے گرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ گھوڑا یوں دوڑ رہا تھا جیسے اس کی دم میں آگ لگی ہوئی ہو۔ شاہ زیب اسے سنبھالنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو گیا تو اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ شاہ زیب اس کے گردن سے ایسے چمٹا ہوا تھا جیسے اس کی پشت پر بالوں کی جگہ ایک انسان اگ آیا ہو۔ ذرا بھی جنبش کرتا تو یقینی طور پر گھوڑے کی پشت سے نیچے گرنے سے بچا نہیں رہ سکتا تھا۔
گھوڑا دوڑتا رہا اور شاہ زیب اس کی پشت سے چمٹا رہا ہر لمحے یہی احساس ہوتا تھا کہ اب گھوڑا ٹھوکر کھائے گا اور زمین پر آ رہے گا، لیزا کے لیے ایک لمحے بھی ذہن میں خیال نہیں آیا تھا کہ اس کا کیا ہوا ہوگا۔ گھوڑے سے گرنے کے بعد زندہ بچی یا مر گئی۔ یہ حادثہ اتنا ہی اچانک ہوا تھا کہ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔
آہستہ آہستہ گھوڑے کی رفتار سست ہونے لگی شاہ زیب ہوش و حواس سے عاری ہو چکا تھا، کان بند ہو گئے تھے، حواس نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بالآخر گھوڑا رک گیا، لیکن اب چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا اور شاہ زیب کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ گرین لیک سے کس طرف نکل آیا ہے۔ یہ راستہ نیاسا فال کی طرف جاتا ہے یا کسی اور طرف، شاہ زیب گھوڑے کی پشت پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، گھوڑا اب بالکل نارمل تھا، شاہ زیب نے پہلے گھوڑے کا چاروں طرف سے جائزہ لیا اور اس کے بعد اطراف کا جائزہ لینے لگا۔
اس کے اطراف درخت ہی درخت بکھرے ہوئے تھے، غالباً کوئی جنگل تھا، لیکن بہت زیادہ گھنا نہیں تھا، چھدرے چھدرے درخت کافی فاصلے پر اگے ہوئے تھے، لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے، لیزا سے جدا ہونے کے بعد تو وہ بالکل ہی بے یار و مددگار رہ گیا تھا، اسے ان بے شمار مہم جوؤں کی کہانیاں یاد آ گئیں جنہوں نے صحرائے اعظم میں بھوک اور پیاس سے دم توڑ دیا تھا، گھوڑے نے پلٹ کر اس انداز میں شاہ زیب کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ کب تک یہ مروت جاری رکھی جائے، ابھی ایک لات گھما کر دوں گا اور نیچے جا پڑو گے۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود ہی میری پشت سے نیچے اتر آؤ۔
شاہ زیب بوکھلائے ہوئے انداز میں گھوڑے کی پشت سے نیچے اتر گیا، درحقیقت گھوڑے کا مقصد ہی یہی تھا۔ اس نے گردن ڈال دی اور گھاس کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ شاہ زیب اپنی جگہ احمقوں کی طرح کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔
پھر اسے خیال آیا کہ یہ سب کیا ہوا، کیا یہ سب کچھ اتفاق تھا یا اس میں کوئی راز پوشیدہ تھا، لیزا کا گھوڑا اچھا خاصا تھا، اس نے ٹھوکر کیسے کھائی اور اس کے ساتھ یہ تمام واقعہ کیسے بیتا اور پھر شاہ زیب کا گھوڑا بھی ایسے بھاگا تھا جیسے.... وہ مڑی تڑی چیز شاہ زیب کو بھی نظر آئی تھی اور سنسناتی ہوئی لیزا کے پیروں کے پاس سے گزر گئی تھی اور اس کے بعد اس کے گھوڑے کی یہ حالت ہوئی تھی، گویا یہ کوئی اتفاقیہ واقعہ یا حادثہ نہیں تھا بلکہ اس میں یقینی طور پر کوئی راز پوشیدہ تھا، لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے ذہن قاصر تھا اور جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو انسان کو چاہیے کہ وہ جہاں بھی ہو لمبا لیٹ جائے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ شاہ زیب نے بھی ایسا ہی کیا۔ گھوڑے کے سموں کی آواز اور اس کے منہ سے نکلنے والی ہنہناہٹ اسے اپنے ساتھ کسی اور جاندار کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی، لیکن اس جنگل میں اس کے اور گھوڑے کے علاوہ اور بھی بہت سے جاندار ہوں گے اور اگر وہ جاندار اس کی طرح نہ ہوئے تو کیا ہوگا......

خونخوار اور وحشی درندے.. صحرائے اعظم افریقہ.. ویرانہ تنہا انسان اور اجنبی گھوڑا، واہ کیا عمدہ صورت حال ہے ایسے میں کسی جانور کو اس کی تلاش میں کوئی دقت نہیں ہوگی، ٹہلتا ہوا آئے گا اور اسے اپنا نوالہ بنائے گا۔ پورا بدن پسینے سے تر ہو گیا۔ شاہ زیب خوف سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، وہ مثال غلط ہو گئی تھی کہ تنہا انسان کو ایسے حالات میں زمین پر لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھنا چاہیے۔ خیالات خود بخود اس کے ذہن میں رینگ آتے ہیں۔

اس وقت تو جو خیال شاہ زیب کے ذہن میں رینگا تھا وہ بہت ہی ہولناک تھا۔ شاہ زیب نے خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھا اب تو درخت بھی دھندلانے لگے تھے، صرف یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ انسانی سائے کھڑے ہوئے ہوں اور اسے دیکھ رہے ہوں۔ اس ویرانے میں اس پر جو کیفیت بیت رہی تھی اسے وہی جانتا تھا، گھوڑے کو بار بار چمکار لیتا تھا تاکہ اس کی شناسائی گھوڑے سے ہو جائے اور وہ یہ سوچ کر کسی اور طرف نکل جانے کا کوشش نہ کرے کہ یہ بھی کوئی آدمی ہے جس سے بات چیت نہیں ہو سکتی، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوڑے کے قریب بیٹھ گیا۔

شاہ زیب اس کی خوشامد کرنا چاہتا تھا۔ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میرے بھائی مجھے چھوڑ کر فرار ہونے کی کوشش مت کرنا.. وہ شاید اس کا مقصد سمجھ گیا تھا چنانچہ اس نے بھی شاہ زیب سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اس کے چہرے کے تاثرات بھی شاہ زیب سے مختلف نہیں ہیں۔ رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ بھی تلاش نہیں کی جا سکتی تھی۔ جاتا تو کہاں جاتا بیچارہ، دیر تک وہ خوفزدہ بیٹھا رہا اور اس کے بعد گھوڑے سے چند گز کے فاصلے پر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا، خوف و دہشت سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، ہر لمحے یہی احساس ہوتا تھا کہ کسی درخت کے عقب سے شیر کی غراہٹ سنائی دے گی دو خونخوار آنکھیں اسے گھوریں گی ایک جست لگائی جائے گی اور پھر شاہ زیب کا بدن اس درندے کے جبڑوں کی زد میں ہوگا۔

وہ دل ہی دل میں لیزا کو گالیاں دینے لگا، خدا غارت کرے ان عورتوں کو، جہاں بھی ہوتی ہیں مردوں کے لیے مصیبت کا سامان ہی فراہم کرتی ہیں، لیزا زبردستی اپنی مہم جوئی کا ثبوت دینے کے لیے شاہ زیب کو پکڑ لائی تھی اور یہاں لانے کے بعد ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ اب خود بھی پتا نہیں کس عالم میں ہوگی، مر گئی ہو تو اچھا ہے۔ گھوڑے سے گر کر بھیجہ نکل گیا ہو خدا کرے، شاہ زیب اسے کوستا رہا، خواہ مخواہ اسے برباد کرنے کے لیے یہاں لے آئی۔

دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے جن سے نجات پانے کا طریقہ یہی تھا کہ اپنے آپ کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ کر گھٹنوں میں منہ دے کر سو جایا جائے۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ ایک سرسراہٹ سنائی دی اور شاہ زیب اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت دیکھنے والے اگر اس کا چہرہ دیکھ لیتے تو شاید ہفتوں ہنستے رہتے، شاہ زیب کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا، سرسراہٹ کی وجہ تو اس کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن کافی فاصلے پر ایک روشنی سی محسوس ہوئی، کسی نے شاید آگ جلا رکھی تھی، اس جگہ پر آخر آگ کس نے روشن کی ہوگی، لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کرنے والا تو کوئی انسان ہی ہو سکتا ہے، کیا اس جگہ کوئی انسان بھی موجود ہے۔

شاہ زیب ہچکچاہٹ کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ آخر انسان ہی تھا، وہ لوگ بھی تو انسان ہی تھے جنہوں نے بڑی بڑی مہمات سر کیں اور انتہائی خوفناک حالات میں بھی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے۔ اس نے سوچا کہ آگ سامنے ہے تو اس کا راز جاننے کی کوشش کیوں نہ کی جائے، بڑی ہمت کرنے کے بعد اس نے آگ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ قدم گو من من بھر کے ہو رہے تھے، لیکن وہ آگ کے قریب پہنچ گیا۔

چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کی گئی تھی۔ لیکن اطراف میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، شاہ زیب حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا، آگ روشن کرنے کے لیے لکڑیاں جس انداز میں جمع کی گئی تھیں ان سے یہی اندازہ ہوتا تھا

کہ یہ کسی انسان کا ہی کارنامہ ہے، لیکن وہ انسان کہاں ہے؟ کیا وہ شاہ زیب کی گھات میں ہے۔

اس کا دل چاہا کہ گڑگڑا کر اس سے کہے کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے، لیکن مردانہ غیرت آڑے آئی اور وہ یہ آواز نہ دے سکا۔ وہ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر آگ کے قریب بیٹھ گیا، اب جو کوئی بھی ہے اور جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے کر لے۔

دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا اور پھر واقعی حیرت ہونے لگی آگ مدھم پڑتی جا رہی تھی، شاہ زیب نے سوچا کہ آگ جلا کر کہاں فرار ہو گیا اور پھر اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر پڑی تو وہ دہشت سے اچھل پڑا۔ کوئی بیٹھا ہوا تھا صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن تھا کوئی انسان ہی، اس سے پہلے بھی شاہ زیب یہ جگہ دیکھ چکا تھا، لیکن وہ یہاں موجود نہیں تھا اور اب اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ زیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا، جب اس کی طرف سے کوئی جنبش نہ ہوئی تو وہ خود ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور لرزتے قدموں سے اس کے قریب پہنچ گیا، ایک بار پھر اسے ایک شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا۔

وہ ایک عورت تھی، بلند و بالا قد و قامت کی مالک اور شاید جوان بھی، قریب سے دیکھنے پر یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا تھا، گھٹنوں میں سر دیے اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ پر اس نے گردن اٹھائی۔ عجیب پراسرار سا انداز تھا، لیکن شاہ زیب کو حیرت سے چند قدم پیچھے ہٹ جانا پڑا، یہ صورت اس کے لیے اجنبی نہیں تھی، تیسری بار وہ اس کے سامنے آئی تھی۔

پہلی بار اس وقت جب وہ رقص کے دوران شاہ زیب کے نزدیک آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری بار اس وقت جب رات کو وہ شاہ زیب کے بالکل نزدیک تھی اور تیسری بار اب... چند لمحے وہ شاہ زیب کو دیکھتی رہی اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، شاہ زیب کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بے حد دلکش تھی جب اس نے پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا تھا جو اس نے اپنا چہرہ رنگوں سے رنگا ہوا تھا، دوبارہ بھی رنگے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی وہ شاہ زیب کے سامنے آئی تھی، لیکن اس وقت اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں تھا، سوائے اس کی صورت کے اصل رنگ کے۔ مسکراہٹ میں بڑی دلکشی تھی خدوخال بھی بے حد حسین تھے، چمپئی رنگ، کسی قدر موٹے ہونٹ لیکن انتہائی پرکشش ستواں ناک اور سب سے حسین چیز جو اس کے چہرے پر تھی وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ گہری سیاہ دل میں اتر جانے والی حسین آنکھیں۔

شاہ زیب ایک لمحے کے لیے اس کے سحر میں کھو گیا، اس ایک لمحے میں شاہ زیب کو یاد نہ رہا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے؟ وہ شاہ زیب کو دیکھ کر مسکراتی رہی اس طرح بیٹھنے سے اس کے لمبے سیاہ بال زمین پر بکھر گئے تھے چند لمحات اسی طرح گزر گئے اور اس کے بعد شاہ زیب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''میں تم سے تیسری بار مل رہا ہوں۔'' اس نے شاہ زیب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تب وہ بھی اس لڑکی کے سامنے بیٹھ گیا ''اور میرا خیال ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے۔''

وہ اسی خاموشی سے شاہ زیب کو دیکھتی رہی جواب بھی نہیں دے رہی تھی، شاہ زیب نے کچھ دیر انتظار کیا اور بولا۔

''اگر اس کی کوئی خاص وجہ ہے تو بہتر یہ ہے کہ مجھے بتا دیا جائے، اس وقت جب تم ناچ رہی تھیں اور اس وقت جب تم میرے قریب تھیں، میں نے تمہیں ایک عجیب کیفیت میں دیکھا تھا اور اب تیسری بار تم مجھے یہاں مل رہی ہو، یقینی امر ہے کہ تم نے میرا تعاقب کیا ہے، تم جو کوئی بھی ہو بہتر ہے کہ مجھے اپنے بارے میں بتا دو اس طرح خاموش رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا''

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ختم ہو گئی اور اب وہ سادہ سی آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھولے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا قد و قامت تھا، وہ ریڈ انڈین کی طرز کی کسی کھال کی

پتلون پہنے ہوئے تھی جس کی چوڑی بیلٹ اس کی پتلی سی کمر پر کسی ہوئی تھی۔ اوپری جسم پر بھی ریڈ انڈین اسٹائل کا ہی لباس تھا جس میں لوہے کے کچھ ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔

لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، بلند و بالا قد انتہائی متناسب بدن، وہ گھوی اور ایک دوشاخہ درخت کی جانب چل پڑی۔ شاہ زیب اس طرف سے گھوڑے کی کھر کھر کی آواز بخوبی سن رہا تھا۔ ویسے بھی ظاہری امر تھا کہ وہ گھوڑے پر ہی یہاں تک آئی ہوگی۔ لیکن بات شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کیا اس نے شاہ زیب کا تعاقب کیا تھا، مگر اس کی وجہ کیا اس کے پس پردہ بھی کوئی خاص بات تھی اور ان لوگوں کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ اس خطرناک لڑکی کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔

وہ مڑی تو شاہ زیب کو یاد آ گئی جو لیزا کے گھوڑے کی ٹانگوں کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی، یہ لڑکی واقعی بے حد پراسرار تھی مگر شاہ زیب سے اسے کیا دلچسپی ہوگی۔ وہ انتظار کرتا رہا اور چند لمحوں میں وہ واپس آ گئی۔ کچھ چیزیں اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھیں اس نے نیچے بیٹھ کر کسی درخت کے چوڑے پتے زمین پر بچھائے اور پھر ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکال کر ان پتوں پر رکھ دی، شاہ زیب نے غور سے دیکھا تو کسی جانور کی بھنی ہوئی ران تھی۔ شاہ زیب کے منہ میں پانی بھر آیا اور یہ احساس ہوا کہ آنتیں پیٹ میں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اس نے پانی کا ایک برتن بھی شاہ زیب کے سامنے رکھ دیا جو لکڑی سے بنا ہوا تھا، گویا وہ شاہ زیب کی ضیافت کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس قدر خاموش تھی۔

شاہ زیب نے اس کی جانب دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کرکے گردن ہلائی اور ران کی جانب اسی طرح اشارہ کیا جیسے اس سے کہہ رہی ہو کہ دیر نہ کی جائے شاہ زیب نے اسے بھی کھانے کی پیشکش کی لیکن وہ پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی اور شاہ زیب دانتوں سے ران کا گوشت ادھیڑنے لگا، انتہائی نرم اور خستہ گوشت تھے۔ بالکل پھیکا نمک وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، لیکن بھنا ہوا تھا، چنانچہ وہ ران کو دانتوں سے ادھیڑ کر معدے میں اتارتا رہا، وہ مطمئن انداز میں بیٹھی تھی، معدے میں کچھ وزن پیدا ہوا اور طبیعت پر بحالی سی آ گئی۔ اب تک کی جو کیفیت تھی وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ابھی تک شاہ زیب کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اس سے شاہ زیب نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتی وہ بظاہر افریقی نہیں محسوس ہوتی تھی، لیکن یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ افریقی قبائلیوں کے ساتھ رقص کرتی تھی۔

معدے کے وزن نے آنکھوں میں نیند لانی شروع کر دی تھی چنانچہ شاہ زیب وہیں لیٹ گیا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، اس نے دوبارہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دے کر چھپا لیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ اسی طرح بیٹھی رہی، شاہ زیب کو جانے کیوں ایک بے چینی کا احساس ہونے لگا، لیکن پھر نیند نے تمام احساسات چھین لیے اور وہ گہری نیند سو گیا۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، لڑکی کہیں نہیں تھی لیکن ایک گھوڑا شاہ زیب سے کچھ فاصلے پر نظر آ گیا، یہ شاہ زیب ہی کا گھوڑا تھا، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور درخت کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹے کینوس کا ایک تھیلا وہاں موجود تھا جو انتہائی جدید ساخت کا تھا، اس میں زپ لگی ہوئی تھی، اس افریقی لڑکی کے پاس اس تھیلے کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔ شاہ زیب نے تھیلے کو ٹٹول کر دیکھا جانے کیا الم غلم اس میں بھرا ہوا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے، ایک لمحے کے لیے سوچا کہ تھیلا اٹھا کر کندھوں پر باندھے اور گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں سے فرار ہو جائے، لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے بعد اس نے لڑکی کو دیکھ لیا، وہ گھوڑے پر واپس آ رہی تھی، اس کے شانوں پر کوئی چیز لٹکی ہوئی تھی۔ قریب آئی تو شاہ زیب نے دیکھا کہ شانوں پر لٹکی ہوئی چیز ہرن ہے جسے اس نے شکار کیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ہرن کو اتار کر نیچے پھینک دیا اور پھر خود بھی گھوڑے سے نیچے اتر آئی اس کے انداز میں اتنی پھرتی اور مستعدی تھی کہ

شاہ زیب کو اندازہ ہو گیا کہ وہ انتہائی طاقتور اور پھرتیلی لڑکی ہے۔ اس نے تھیلے کے قریب پہنچ کر اس کا تالا کھولا اور ایک لمبا سا چھرا نکال لیا۔ اس نے چھرا ہرن کی گردن پر پھیر دیا اور ہرن کی گردن سے تازہ تازہ خون بہہ نکلا۔ پھر اس نے دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر مروڑا۔ ٹانگیں ٹوٹ گئیں، شاہ زیب نے اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس کی تھی۔ اتنی طاقتور لڑکی شاید اس سے پہلے شاہ زیب نے نہیں دیکھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے انگلیوں کی مدد سے ہرن کی پوری کھال اتار پھینکی۔ اس نے پھر ایک کپڑا لیا اور ہرن کے اندرونی بدن کو صاف کر دیا۔

شاہ زیب نے سوچا کہ حرام خوری مناسب نہیں ہے۔ وہ صبح کے ناشتے کا ہی نہیں غالباً دن بھر کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی، چنانچہ تھوڑی سی کارروائی شاہ زیب کی طرف سے بھی ہونی چاہیے۔ اس نے فوراً ہی خشک لکڑیوں کی ٹکٹکیاں تلاش کیں اور ان پر ایک ایسی لکڑی رکھی جو ہرن کو آگ پر گھما سکے۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع کرکے اس نے نیچے رکھ دیں، وہ مسکراتی نگاہوں سے کئی بار شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے تھیلے میں سے ماچس نکال کر شاہ زیب کی طرف اچھال دی اور شاہ زیب نے دل ہی دل میں سوچا کہ محترمہ تمام انتظامات سے لیس ہیں، شاہ زیب نے لکڑیاں سلگا دیں۔

اس دوران وہ ہرن کو اچھی طرح صاف کر چکی تھی۔ پھر اس نے ٹکٹکی پر رکھی ہوئی لکڑی اٹھائی اور ہرن کو اس میں پرو دیا، ہرن کافی وزنی تھا، لیکن لڑکی نے اسے اس طرح اس لکڑی میں پرو دیا تھا جیسے وہ بے وزن ہو شاہ زیب کو اپنے مستقبل کا خیال آ گیا، جس وقت بھی اسے طیش آ گیا اسی وقت شاہ زیب کو بھی ہرن کی طرح اس ٹکٹکی پر بھننا پڑے گا۔

وہ پانی سے ہاتھ دھو کر ایک سمت جا بیٹھی، گویا اب اس نے باقی ذمے داری شاہ زیب کے سپرد کر دی تھی، جب ہرن تیار ہو گیا تو وہ اٹھی۔ چھرا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اسے اپنی پتلون سے صاف کیا اور اس کا دستہ زور سے ہرن کے بازو پر مارا، ہرن کے بازو کی ہڈی تک کٹ گئی تھی۔ وہ اطمینان سے چھرے کو ہرن کی پسلیوں میں چبھو کر اور اس کی ران ہاتھ میں لیے آگے بڑھ گئی اور اپنی جگہ بیٹھ کر اسے دانتوں سے ادھیڑنے لگی، گویا اب شاہ زیب کو اپنے لیے گوشت حاصل کرنا تھا۔ شاہ زیب نے چھرا ہرن کی پسلیوں سے نکال کر اس کی مانند اس کے دوسرے ہاتھ پر نہیں مارا خواہ مخواہ اس کے سامنے بے عزتی ہوتی۔ گوشت ہی کٹ جاتا تو دوسری بات تھی ہڈی کیسے کاٹی جا سکتی تھی۔ شاہ زیب نے ہرن کے گوشت کو ہڈی تک کاٹ لیا اور پھر چھرے کو اس جگہ سے گزارنے لگا جہاں جوڑ ہوتا ہے، اس میں شاہ زیب کو دقت نہیں ہوئی تھی پھر وہ اپنے حصے کا بازو لے کر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور دونوں پیٹ بھرنے لگے۔ لڑکی کے انداز میں بڑی وحشت تھی۔ ایک ران کھانے کے بعد اس نے دوسری ران اسی انداز میں اٹھائی اور اسے بھی چٹ کر گئی جبکہ شاہ زیب کے لیے ایک بازو کھانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

شکم سیر ہونے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ یہاں سے آگے کا سفر کرنا چاہتی ہے، شاہ زیب نے ایک بار پھر اس سے عرض کیا کہ اب اسے جانے دیا جائے، لیکن اس کے منہ سے کچھ نہیں نکلا تھا۔ شاہ زیب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”محترمہ اگر آپ میری زبان نہیں سمجھتیں تو اپنی ہی زبان میں کچھ بکواس فرمایئے۔“

اس نے کینوس کا تھیلا اٹھا کر کندھوں پر باندھا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے انگلی سے شاہ زیب کے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا، مقصد یہ تھا کہ شاہ زیب بھی اپنا گھوڑا لے آئے اور شاہ زیب نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا گھوڑا سنبھال لیا اور پھر ان کا سفر شروع ہو گیا، گھوڑے کی پشت پر وہ اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے ساری زندگی گھوڑے کی سواری میں ہی گزار دی ہو۔

دوپہر کو وہی گوشت کھایا گیا جو صبح کو بھونا گیا تھا، لیکن یہاں اس نے باقی ماندہ گوشت محفوظ کرنے کے بجائے ایک طرف پھینک دیا۔ شاہ زیب نے پراضطراب نگاہوں سے اس کی یہ حرکت دیکھی تھی۔ لیکن اس کے انداز.

میں اعتماد تھا جیسے اس کے بعد اسے تازہ گوشت مل جانے کا یقین تھا۔

دو پہر کا سورج ڈھل گیا، گرمی نے پورا بدن پسینہ پسینہ کر دیا تھا، تیز ہوا چل رہی تھی، لیکن انتہائی گرم تھی اور جسم کے کھلے ہوئے حصے بری طرح جھلس کر رہ گئے تھے، واقعی پورا بدن شدید تھکن کا شکار تھا، لیکن شاہ زیب کی نگاہ جب بھی ساتھ والے گھوڑے سوار پر پڑتی وہ دل ہی دل میں اس کی قوت برداشت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ پاتا۔ اس کے چہرے پر تھکن کی ایک شکن بھی نہیں تھی، وہ بڑے اطمینان سے چاروں طرف کے مناظر دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

شاہ زیب کو ایک لمحے کے لیے تھوڑی سی جھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اس گونگی ہم سفر کا کیا کیا جائے۔ کاش وہ بولنا جانتی تو کم از کم زبان کو زنگ نہ لگتا، بہت سے عقدے حل ہو جاتے۔ شاہ زیب نے دانت پیس کر اسے دیکھا لیکن اس وقت لڑکی بھی شاہ زیب کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ جب بھی اس کے چہرے پر نگاہ پڑتی تو ایک لمحے کے لیے ذہن بھٹک جاتا تھا، شاہ زیب کے ذہن سے غصے کے تاثرات نکل گئے اور وہ اسے مبہوت انداز میں دیکھتا رہا۔

شام گہری ہو گئی ایک جگہ قیام کے لیے منتخب کر لی گئی، صحرائے اعظم کے بارے میں ظاہر ہے اس سے زیادہ معلومات کس کو ہو سکتی تھیں، جس جگہ اس نے قیام کیا تھا وہاں جنگلات تو نہ ہونے کے برابر تھے لیکن جانور یہاں بھی بھٹک رہے تھے۔ شاہ زیب نے گھاس کا ایک قطعہ منتخب کیا اور وہاں لمبا لمبا لیٹ گیا۔ بدن کے ساتھ ساتھ سر بھی چکرا رہا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی ذہن کو کچھ سکون محسوس ہوا تو شاہ زیب نے کہنیوں کے بل ٹک کر اس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں اور اسے دبے قدموں ایک جانب بڑھتے ہوئے دیکھا اور پھر ایک اور منظر شاہ زیب کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

مڑی ہوئی ایک لکڑی جیسا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا جو سنسناتا ہوا اس کے ہاتھ سے نکلا اور سامنے دوڑنے والے ہرن کے ایک بچے کی ٹانگوں میں لگا وہ بری طرح اچھل کر نیچے گرا جبکہ لکڑی کا وہ ٹکڑا واپس اس لڑکی کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ شاہ زیب کے اندازے کے مطابق یہ بومرینگ ہی تھا۔ اب شاہ زیب کو اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ لیزا کے گھوڑے کو جس چیز نے ناکارہ کیا تھا وہ یہی بومرینگ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہی خاتون نے لیزا کا پتا صاف کیا تھا، مگر کیوں، اگر یہ خاتون شاہ زیب پر مہربان ہو گئی تھیں تو ان مہربانیوں کے اظہار کا دوسرا طریقہ بھی ہو سکتا تھا۔

ہرن کے بچے کو اٹھا کر وہ اسی طرف آتی ہوئی دکھائی دی اور شاہ زیب اپنے کام کے لیے تیار ہو گیا کیونکہ ظاہر تھا کہ گھریلو خواتین کی طرح اس شکار کو بھوننے کا انتظام کرنا تھا۔ ذمہ داری ایک بار قبول کر لی تھی تو اب اسے نبھانا ہی چاہیے تھا تاکہ تعاون کا اظہار ہوتا رہے اور یہ ہولناک حسینہ شاہ زیب سے بدظن نہ ہونے پائے، چنانچہ شاہ زیب اور اس لڑکی نے وہی کیا جو وہ صبح کر چکے تھے، شکم سیر ہونے کے بعد بدن پر عجیب سی تھکن سوار ہو گئی اور شاہ زیب وہیں لیٹ گیا، پھر جانے کب آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹا تو رات ہی کا وقت تھا، لیکن پورے دنوں کی چاندنی نے پورے جنگل کو منور کر رکھا تھا، شاہ زیب نے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ اس کے قریب ہی بے سدھ لیٹی ہوئی تھی، وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بدن میں عجیب سی چپچپاہٹ تھی، پسینے اور گرمی نے بیڑہ غرق کر دیا تھا، خیال آیا کہ کاش پانی ہوتا تو نہا لیتا، پھر اس کے دماغ میں جانے کیا سمائی کہ ایک طرف چل پڑا، درندوں کا خوف دامن گیر تھا، لیکن اس وقت نجانے کہاں سے اتنی ساری بہادری آ گئی اور پھر اس بہادری کا صلہ بھی مل گیا۔

وہ اچانک ہی ایک جھیل کے کنارے پہنچا تھا جو درختوں نے پوشیدہ کر رکھی تھی، کچھ دیر رک کر وہ اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتا رہا اور پھر کچھ آزادیاں حاصل کر کے اس نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔

پانی اتنا شفاف تھا کہ چاندنی میں اس کی تہہ تک نظر آتی تھی، شاہ زیب نے غور سے دیکھا لیکن اسے کوئی آبی

جانور نظر نہ آیا۔ وہ اطمینان سے نہاتا رہا اور قدرت کی صناعیوں کی داد دیتا رہا۔ پھر ان صناعیوں میں ایک صناعی کا اضافہ ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اتفاقیہ طور پر ہی اس طرف اٹھ گئی تھیں، ایک لمحے کے لیے تو دل دھک سے رہ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آبی جانور آ گیا ہو۔ لیکن چاندنی میں شاہ زیب نے اسے دیکھا تو اس کے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی، شاہ زیب اس کی آمد کو محسوس نہ کر سکا اور نہ ہی اسے اندازہ ہوا تھا کہ کب وہ پانی میں داخل ہوئی وہ کوئی جل پری ہی لگ رہی تھی، شاہ زیب ساکت ہو کر اس پری کو دیکھنے لگا جو کسی پری کی مانند پانی میں کلیلیں کر رہی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال قیامت بنے ہوئے تھے، جب بھی وہ کروٹ بدل کر پانی کی تہہ میں ترچھی تیرتی ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے کمان سے تیر چھوڑا ہو، تیرنے کا انداز بھی شاہ زیب کے لیے بالکل اجنبی اور انوکھا تھا، وہ شاہ زیب کے اطراف ہی میں چکرا رہی تھی اور وہ شدت حیرت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس کے پورے بدن میں چیونٹیاں تیرنے لگی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان پر چاند کے بجائے سورج دوبارہ نکل آیا ہو۔

شاہ زیب کی آنکھوں میں جلن پیدا ہونے لگی، شاہ زیب نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس پر نگاہیں ہی نہ ٹک پا رہی تھیں، پھر اچانک یہ احساس ہوا کہ جس طرح وہ اسے دیکھ سکتا ہے اسی طرح وہ بھی اسے دیکھ سکتی ہے اور جانے کیوں مشرق اس کے ذہن میں آ رچا۔

شاہ زیب نے کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ آفت کی پرکالہ بار بار اس کے سامنے آ جاتی جیسے اس کا راستہ روکنا چاہتی ہو۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی چاہتی ہو کہ جانے والا خود رکے مگر ان تلوں میں تیل تھا ہی کب؟

پھر کنارے پر آ کر شاہ زیب نے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی اور اسے دیکھتا رہا، وہ چاندنی کا ہیولا بنی جھیل گردی کرتی رہی۔ بلاشبہ یہ اس کی زندگی کا اتنا حسین منظر تھا کہ اس نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ ایک طرح سے جائز نہیں ہے۔ ذہن پر خواہ مخواہ اخلاقیات کے لبادے آ پڑے اور وہ وہاں سے پلٹ آیا، یہ الگ بات تھی کہ دل کو قرار نہ تھا۔ شاہ زیب نے آنکھیں بند کیں تو وہ پوری جھیل سمیت آنکھوں میں اتر آئی۔

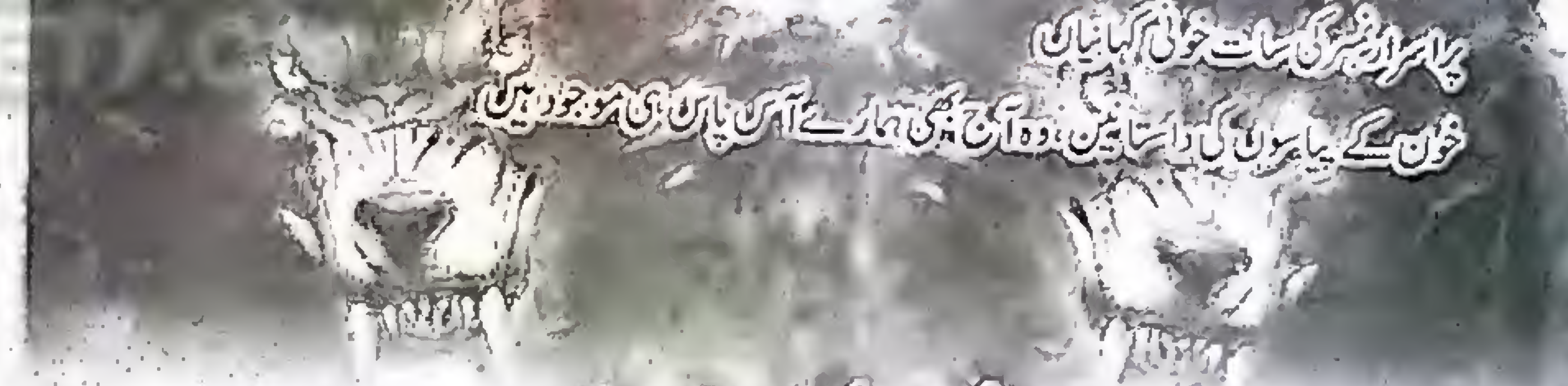
ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آیا کہ شاید وہ اس کے رویے سے بددل ہو گئی ہو، وہ تو اپنے طور پر شاہ زیب کا ساتھ قبول کر چکی تھی لیکن شاہ زیب نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور زمین پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ آ گئی تھی، شاہ زیب نے آنکھوں میں درز پیدا کر کے اسے دیکھا اور شاہ زیب پر یہ راز افشا ہوا کہ بھیگا حسن کتنا دلفریب اور توبہ شکن ہوتا ہے، اس نے شاہ زیب کی طرف نہیں دیکھا اور کچھ فاصلے پر جا کر اپنے مخصوص انداز میں یعنی گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ شاہ زیب نے پوری آنکھیں کھول دیں، پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا کیا خیالات گردش کر رہے تھے، لیکن شاہ زیب اپنے خیالات کا اظہار اس پر قطعی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے کروٹ بدل لی تاکہ لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے نہ رہے، کچھ دیر یونہی لیٹا رہا پھر نیند کی دیوی آنکھوں میں پیوست ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔

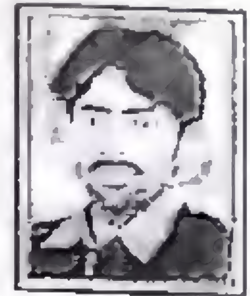
☆......☆......☆

دوسری صبح پرسکون تھی، ناشتا رات کے بھنے گوشت کا ہی تھا، پتا نہیں کیوں لڑکی نے نیا شکار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاہ زیب نے اسے دیکھا اور رات کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا، لیکن اس نے فوراً ہی نگاہیں پھیر لیں۔ وہ بھی اپنے چہرے سے کسی خاص کیفیت کا شکار نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں بیزاری تھی نہ روٹھا پن، جیسے جو کچھ ہوا ہو وہ اس کے لیے بالکل تعجب خیز نہ ہو، شاہ زیب نے اگر اس کی نسوانیت کو قبول نہیں کیا تھا تو اس نے اس پر ناراضگی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے، شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟ جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔)



خون کا پیاسا



شاہد رفیق سہو

اُس نوجوان کی خونخوار کہانی، جس کے اندر لہو کا رسیا شیطان سرایت کر گیا تھا

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں کراچی کی ایک کاٹن مل میں سپروائزر تھا اور آج پورے دو ماہ بعد میں عید کی چھٹیوں پر گھر جا رہا تھا۔ کام کا لوڈ زیادہ تھا اس لیے بڑی مشکل سے عید کی صرف دو چھٹیاں ملیں۔ میں نے جلدی جلدی ضروری سامان اٹھایا اور سفری بیگ میں ڈال کر ریلوے اسٹیشن کا رُخ کیا۔ عید کی خریداری میں دو روز قبل کر چکا تھا۔ اسٹیشن سے ٹکٹ لے کر میں پسینجر ٹرین میں سوار ہو گیا۔ کراچی سے میرے گاؤں کا سفر تقریباً 60 کلومیٹر تھا۔ دو ماہ بعد گاؤں جا رہا تھا۔ بہت خوش تھا۔ سوچوں میں سفر کا کچھ پتا نہ چلا۔ پتا اُس وقت چلا جب گاڑی میرے اسٹیشن پر رُکی۔ میں نے سفری بیگ سنبھالا اور نیچے اُتر گیا۔ جنوری کا مہینہ تھا۔ سخت سردی تھی رات کے نو بجے تھے ایک طرف اسٹیشن کی چھوٹی سی عمارت تھی جہاں لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی۔

گاڑی اسٹیشن پر ایک منٹ ٹھہری، میں نے گزرتے ہوئے ایک نظر مسافر خانے پر ڈالی۔ اس وقت مسافر خانہ خالی پڑا تھا۔ میں اپنے گاؤں کے واحد راستے پر چل دیا۔ ارد گرد تمام زمین بنجر پڑی تھی۔ ہر طرف جا بجا جھاڑیاں اور سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ اندھیرا اور دھند اس قدر زیادہ تھی کہ تین چار گز کے فاصلے سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن تھوڑا سا چلنے کے بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں۔ اب مجھے زیادہ دور تک نظر آ رہا تھا اور میں آسانی سے سرکنڈوں اور جھاڑیوں سے راستہ بناتے ہوئے آگے جا رہا تھا۔

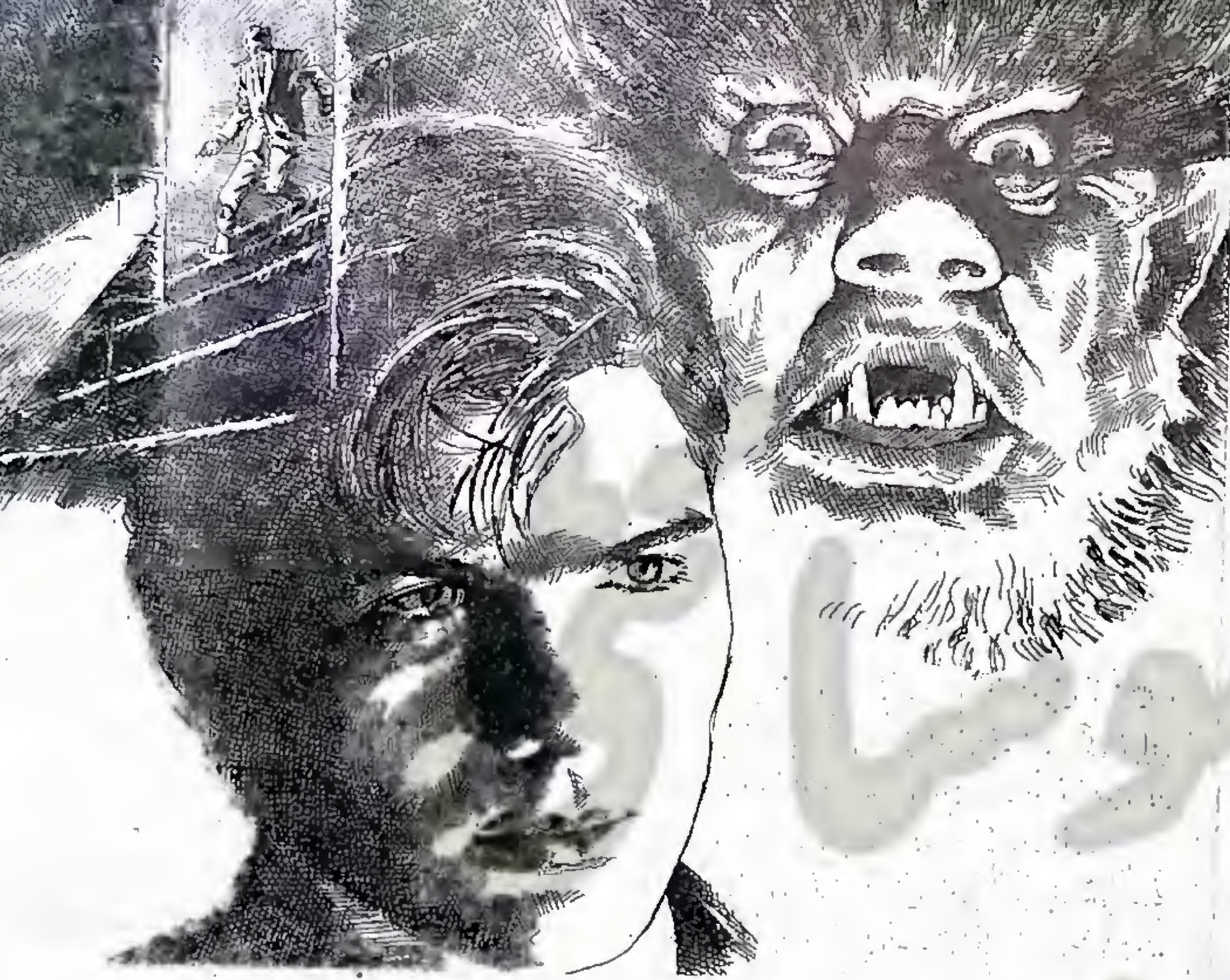
چلتے چلتے اچانک مجھے ایک سایا نظر آیا۔ میں نے غور کیا تو وہ کوئی بوڑھا آدمی تھا۔ جو جھک کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے تیزی سے قدم بڑھائے اور بوڑھے سے جا ملا۔

”السلام علیکم بابا جی!“ میں نے قریب جا کر کہا۔ بوڑھے نے جواب میں نظر بھر کر مجھے دیکھا اور بولا۔

”گاؤں جا رہے ہو نوجوان۔“

”جی بابا جی! ابھی ابھی گاڑی سے اُترا ہوں۔ بابا جی آپ نے کہاں جانا ہے۔“

”میں نے بیٹا اسی راستے پر تھوڑا سا آگے جانا ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔ اندھیرے کی وجہ سے بوڑھے کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری ناک اور منہ سرد ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے سرخ اور ہاتھ برف ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اتنی سردی کے باوجود بوڑھے نے چادر تو کیا کوئی ہلکا سا سوئٹر بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ وہ صرف ایک ہلکے کپڑے کے



دھوتی کرتے میں ملبوس تھا جبکہ میرے جسم پر ایک گرم سوئٹر اور بھاری چادر بھی سردی کو روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ میں نے بوڑھے سے اس بارے میں سوال کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے چلتا رہا۔

پھر تقریباً بیس منٹ تک خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد آگے مٹی کا بنا ہوا چھوٹا سا مکان آ گیا۔

”لو بھئی میرا گھر تو آ گیا۔“ بوڑھا بولا۔

”ٹھیک ہے بابا جی خدا حافظ۔ میں تو ابھی اور آگے چلوں گا۔“

”ارے بیٹا! آ ہی گئے ہو تو میرے ساتھ چائے پی کر جانا۔ ابھی پانچ منٹ میں بنا کر پلا دوں گا۔ دیکھو تم کس طرح کپکپا رہے ہو۔ گرم چائے تمہاری سردی دور کر دے گی۔“

میں نے بوڑھے سے معذرت چاہی اور کہا کہ مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔“ مگر بوڑھے نے میری ایک نہ چلنے دی اور اصرار کر کے مکان کے اندر لے آیا۔ میں بابا کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک طرف الماری میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ جس کی کمزور روشنی کمرے کا اندھیرا دور کرنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ ”شاید بوڑھا اکیلا ہی رہتا ہے۔“ میں دل ہی دل میں اندازے لگا رہا تھا۔ ایک طرف چارپائی پڑی ہوئی تھی۔

”تم آرام سے یہاں بیٹھو، میں چائے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ یہ کہتا ہوا بوڑھا مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ بوڑھے کے جانے کے بعد میں نے کاندھے سے چادر اُتار کر ایک طرف رکھ دی اور سفری بیگ کاندھے سے اُتار کر ابھی رکھنے ہی والا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے مجھے کمر کے گرد دونوں ہاتھ ڈال کر





جکڑ لیا۔ دونوں ہاتھ جھریوں سے پُر تھے جس سے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جکڑنے والا بوڑھے کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ لیکن گرفت اس قدر سخت تھی کہ میری ہڈیاں چیخ گئیں۔ میں نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرا شمار گاؤں کے کڑیل جوانوں میں ہوتا تھا۔ لیکن بوڑھے کے سامنے میں بے بس ہوگیا تھا۔ پھر جیسے میری گردن میں آگ کی طرح تپتی دو سلاخیں دھنس گئی ہوں۔ تکلیف کے مارے میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خبیث بوڑھا میری گردن میں دانت گاڑ کر میرا لہو پی رہا تھا۔ پھر اچانک زندگی کے بچاؤ کے احساس نے تمام میری پوشیدہ صلاحیتیں بیدار کردیں۔ مجھے اپنے بچاؤ کا خیال آیا۔ میں نے خود کو قدرے نیچا کیا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔ توقع کے عین مطابق بوڑھے کے قدم زمین سے اوپر اُٹھتے چلے گئے۔ اور اسی لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں الٹا دوڑا اور پوری قوت سے خود کو کمرے کی دیوار سے ٹکرادیا۔ اس کے ساتھ ہی بوڑھے کی گرفت نرم ہوتی چلی گئی۔ میں نے اپنے جسم کو ایک بھرپور جھٹکا دیا اور بوڑھے کی گرفت سے آزاد ہوگیا۔

اب بوڑھے کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ دیے کی دھیمی دھیمی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُف اس قدر بھیانک چہرہ۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی کمزور دل کا آدمی اسے دیکھ لیتا تو یقیناً خوف کی شدت سے اس کا دل پھٹ جاتا۔ چمگادڑ کی مانند لمبے لمبے کان، نوکیلی ناک لال، سرخ آنکھیں اور ہونٹوں سے باہر کو نکلے ہوئے دو بڑے بڑے سفید دانت جن پر میرا خون لگا ہوا تھا۔

''میں تمہارا خون ضرور پیوں گا۔'' بوڑھے کے حلق سے کھرکھراتی ہوئی غیر انسانی آواز بلند ہوئی اور اس کے ساتھ ہی وہ کسی بھوکے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اچھل کر بوڑھے کے منہ پر ٹھوکر رسید کی۔ بوڑھا چکرا کر دور جا پڑا۔ لیکن سپرنگ کی طرح اچھل کر دوبارہ میرے مقابل آگیا۔ اس کا خوفناک چہرہ غصے کی شدت سے بگڑ کر مزید خوفناک ہوگیا تھا۔ اُس نے ایک جست لگائی اور مجھے دبوچ لیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ کبھی میں اوپر ہوتا تو کبھی بوڑھا، بوڑھے کی کوشش تھی کہ وہ میری گردن دبوچ لے اور میں نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ اسی طرح اوپر نیچے ہوتے ہوئے اچانک میرا بازو کسی شے سے ٹکرایا۔ وہ چیز سفری بیگ تھا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے مجھے اس نئے چھرے کا خیال آیا جو میں قربانی کے لیے شہر سے لایا تھا۔ خوش قسمتی سے اس بار بوڑھا نیچے آگیا۔ میں بوڑھے کی چھاتی پر سوار تھا۔ میں نے جیسے ہی بیگ میں سے چھرا نکالنے کے لیے اس میں ہاتھ ڈالا بوڑھے نے ایک ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس سے میری گردن پکڑ لی۔

بوڑھے کے بڑے بڑے ناخن میری گردن میں چبھ رہے تھے۔ اس کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جارہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے میرے گلے کو دبا رہا تھا۔ میری آنکھیں باہر نکلنے کو بے قرار تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ میری آنکھیں واقعی اُبل کر میری موت کا باعث بنتیں میں چھرا نکالنے میں کامیاب ہوگیا اور پھر ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں نے چھرا بوڑھے کی گردن پر پھیر دیا۔ گردن سے کسی قربانی کے بکرے کی طرح خون کے فوارے نکل پڑے۔ اس خون کے چند چھینٹے مجھ پر بھی پڑے۔ میرے جسم کے جس حصے پر بھی بوڑھے کے خون کے چھینٹے پڑے ایسا محسوس ہوا جیسے تیزاب گر پڑا ہو۔ بوڑھے کی گرفت اب ڈھیلی پڑ چکی تھی اور میں نے اپنا کام جاری رکھا جب تک اس کی گردن لٹک نہیں گئی۔ وہ کچھ دیر زمین پر تڑپتا رہا پھر ساکت ہوگیا۔

میں نے پھرتی سے اپنی چادر اور سفری بیگ اٹھائے اور تیزی کے ساتھ مکان سے باہر نکل آیا۔ اگرچہ میں بوڑھے کو ختم کرچکا تھا لیکن اب بھی اس کی دہشت مجھ پر سوار تھی کہ کہیں وہ دوبارہ نہ اُٹھ کھڑا ہو اس لیے میں اس علاقے سے تیزی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ بڈھا شیطان مجھے نہایت غلط راستے پر لے آیا تھا۔ الحمد للہ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں صحیح راستے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

گھر والے میری آمد پر بہت خوش تھے۔ جب انہوں نے میری غیر حالت اور چند ایک جگہ پر زخم دیکھے تو فکر مند ہوئے لیکن میں نے بہانہ کردیا کہ آتے ہوئے گاڑی میں چکر آنے سے گر پڑا تھا۔ جس سے معمولی سی خراشیں آگئیں۔ دراصل میں کسی کو اصل قصہ نہ بتانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر کسی نے میری بات پر یقین نہ کیا تو بوڑھے کے قتل کے الزام میں پکڑا جاؤں گا۔

عید آئی اور گزر گئی ساتھ ہی دو چھٹیاں بھی ختم ہوگئیں۔ میں واپس شہر چلا گیا۔ زندگی کی گاڑی ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔

☆......☆......☆

ایک ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ اسی دوران بوڑھے کا لگایا ہوا زخم بھی ٹھیک ہوگیا تھا۔

لیکن پھر ایک دن مجھ پر ایک بھیانک حقیقت آشکار ہوئی۔ ہوا کچھ یوں کہ چھٹی کے بعد میں مل کے کسی کام سے ایک کاریگر کے گھر گیا۔ رات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر بلا لیا۔

اظہر عباس میرا بہت اچھا واقف کار تھا۔ میں اس کے گھر پہلے بھی ایک دو بار آچکا تھا۔ اس کی بیوی رخسانہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''اظہر عباس کہاں ہے؟'' جواب ملا۔

''وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے اور رات دیر سے واپس آئے گا۔''

اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں ایک ہوس بھری دعوت سی نظر آئی۔ جسے میں فوری طور پر سمجھ نہ سکا۔ اس کا جواب سن کر میں یہ کہہ کر اُٹھ گیا کہ کل کسی وقت آؤں گا۔ لیکن رخسانہ فوراً بولی۔

''اب آ ہی گئے ہیں تو چائے پی کر جائیے گا۔'' یہ سُن کر مجھے مجبوراً رُکنا پڑا۔ وہ چائے بنانے کے لیے اندر چلی گئی۔

ابھی مجھے بیٹھے ہوئے تھوڑی سی دیر گزری تھی کہ وہ دوبارہ دیوان خانے میں داخل ہوئی مگر اب کی بار وہ برہنہ حالت میں تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے ایک نظر میں اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لے لیا۔ دبیز جسم اور قیامت خیز سی اٹھان۔ چند لمحے وہ میری طرف غور سے دیکھتی رہی پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اسی ایک لمحے میں اظہر عباس کا کردار میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہوا۔ وہ نہایت عیاش آدمی تھا۔ شراب اور عورت اس کی مرغوب غذا تھی۔ شہر بھر کی طوائفیں اس کی واقف کار تھیں۔ اپنی تنخواہ کا زیادہ تر حصہ وہ انہی دو کاموں میں صرف کرتا تھا۔ اکثر رات گئے واپس لوٹتا تھا۔ اپنی بیوی کے ساتھ بھی اس کا رویہ بہتر نہ تھا۔ ہر وقت اسے مارتا پیٹتا رہتا تھا اور جہاں تک میرا خیال تھا اس کی ازدواجی ضروریات کا بھی خیال نہیں رکھتا تھا۔ ایسے حالات میں اس کی بیوی کا بہک جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

''اکرم بابو میری پیاس بجھا دو۔ میرے رگ و پے میں شعلے بھڑک رہے ہیں اکرم بابو۔ ان پر اپنی سرد محبت کا پانی ڈال دو۔'' وہ جذبات سے بھرپور لہجے میں بولے چلی جارہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا تمام جسم کپکپا رہا تھا۔ اس کے حسین لمس نے میرے جسم میں آگ سی لگادی اور پھر میں بھی جذبات کی رو میں بہہ نکلا۔ میرے جسم میں لگنے والی آگ اور تیز ہوگئی۔ پھر عین اسی لمحے جب میں جذبات کی انتہا پر تھا مجھے اچانک احساس ہونے لگا جیسے میرے سارے جسم کے بال کھڑے ہورہے ہوں۔ ایک دم میرے کان بڑے بڑے ہوگئے۔ ناک کسی جنگلی سؤر کی طرح لمبا ہوگیا۔ ہاتھوں کے ناخن بڑھ کر دو دو انچ لمبے ہوگئے اور ہونٹوں سے دو لمبے اور نوکیلے سفید دانت باہر نکل آئے۔ میں ایک عفریت میں تبدیل ہوچکا تھا۔ میری گرفت ایک دم سخت ہوگئی۔ میں نے ایک ہاتھ رخسانہ کے منہ پر رکھا اور اسے چیخنے کا موقع دیے بغیر دونوں دانت اس کی سرخ و سفید گردن میں گاڑ دیے اور پھر میں نے اسے اس وقت چھوڑا جب میں اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نہ پی چکا تھا۔

اس کا بے جان جسم دھپ کی آواز سے فرش پر جاگرا۔ پھر شاید چند لمحوں بعد ہی میں ہوش میں آگیا۔

ہوش میں آنے کے بعد مجھے یہ سب خواب خواب سا لگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں سویا ہوا تھا اور ابھی نیند سے اُٹھا ہوں۔ میں نے حیرت سے ایک نظر زمین پر پڑی اظہر کی بیوی کی لاش پر ڈالی اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا تو میرا ہاتھ تازہ خون سے تر ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ

سب حقیقت تھی۔

میں بجلی کی سی تیزی سے اظہر عباس کے گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کا گھر کچی آبادی میں دوسرے گھروں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اوپر سے رات کا اندھیرا...... مجھے پوری اُمید تھی کہ کسی نے مجھے یہاں آتے جاتے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں سیدھا اپنے مکان میں آ گیا۔

میں بری طرح سے ڈرا ہوا تھا کہ اگر کسی نے مجھے وہاں دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا۔ پولیس مجھے پکڑ لے گی۔ میں سچ بھی بتاؤں گا تو بھی کوئی میری بات پر یقین نہ کرے گا کہ یہ سب جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے تو ایک خواب دیکھا تھا۔ ڈراؤنا خواب۔ جس میں میں نہیں تھا بلکہ وہ تو کوئی اور ہی شیطان تھا۔ جو میرے اندر موجود تھا۔

پوری رات طرح طرح کے وسوسوں میں کٹی۔ لیکن مجھے اس وقت قدرے اطمینان ہوا جب اگلے دن پولیس کے سامنے کسی بندے نے بھی میرے خلاف بیان نہ دیا سب کا یہی کہنا تھا کہ انہوں نے تو کسی قسم کی چیخ کی آواز بھی نہیں سنی۔

اظہر عباس کا بیان تھا کہ جب وہ رات ساڑھے دس بجے گھر واپس آیا تو گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر حیران رہ گیا اور جب اندر داخل ہوا تو بیوی کی لاش سامنے پڑی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ قاتل اظہر عباس ہے لیکن، اظہر عباس کے پاس اپنی غیر موجودگی کا ثبوت موجود تھا۔ جس کی وجہ سے پولیس اسے گرفتار نہ کر سکی۔ میرے علاوہ کسی کاریگر کو بھی یہ بات معلوم نہ تھی کہ رات میں مل کے کام کے سلسلے میں اظہر عباس کے گھر گیا تھا۔

پولیس دو چار دن شور مچاتی رہی اور بالآخر ناکام ہو کر سکون سے بیٹھ گئی۔ اتنا عرصہ میں بھی سکون میں رہا اور مجھے وہ شیطانی دورہ دوبارہ نہ پڑا میں سمجھ رہا تھا کہ اب دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن یہ میری غلط فہمی تھی۔

☆......☆......☆

ٹھیک ایک ماہ بعد ایک دن میری طبیعت میں بے چینی سی آ گئی۔ میرا من کچھ پیاسا پیاسا سا تھا۔ یہ پیاس پانی وغیرہ کی نہیں تھی بلکہ انسانی خون کی تھی۔ گرم گرم انسانی خون، اب میں کسی کی صحت مند گردن کو دیکھتا تو میرے منہ میں پانی بھر آتا اور بے اختیار دل چاہتا کہ اس پر ٹوٹ پڑوں۔ میں بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

اس دن والی خواب کی سی کیفیت آج پھر طاری تھی۔ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹتے جا رہے تھے اور پھر اپنی پیاس سے مجبور ہو کر اس رات میں شہر سے باہر ایک ویران راستے پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ مقامی لوگ شہر آنے جانے کے لیے یہ راستہ استعمال کرتے تھے۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا رہا لیکن وہاں سے کوئی نہ گزرا۔ ابھی مایوس ہو کر واپس جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک سایا آتا دکھائی دیا۔ میری پیاس بھڑک اٹھی اور میں مکمل طور پر شیطانی روپ میں آ گیا۔ وہ کوئی نوجوان آدمی تھا۔ میں نے قریب آتے ہی ایک جست لگا کر اسے دبوچ لیا اور دانت اس کی گردن میں گاڑھ کر گرم گرم تازہ خون پینے لگا۔

وہ میری گرفت میں بری طرح تڑپ رہا تھا اور بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ لیکن میری گرفت سے نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی اور پھر آہستہ آہستہ اس کی مزاحمت کمزور پڑتی گئی اور پھر بالکل ختم ہو گئی۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کا خون پینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں نئی جان آ گئی ہو۔ مجھے ایک عجیب فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک نشے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے بعد میں گھر آ گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن جب میں سو کر اٹھا تو وہ خوابی کیفیت ختم ہو چکی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس چکر سے بہت پریشان تھا۔ مجھے اب پوری طرح یقین ہو گیا تھا کہ میں شیطانی طاقتوں کے شکنجے میں آ گیا ہوں۔

لیکن اس کے بچاؤ کا میرے پاس کوئی حل نہ تھا اور ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ یہ شیطانی کیفیت ٹھیک ایک ماہ بعد طاری ہوتی تھی اور یہ چاند کے زوال کے دن ہوتے تھے۔ بوڑھے شیطان سے ملاقات، رخسانہ کا قتل اور یہ تازہ واقعہ ٹھیک ایک ایک ماہ کے وقفے کے بعد ظہور پذیر ہوئے تھے۔

کچھ عرصہ بعد میں دوبارہ اپنے گاؤں گیا تو کافی پریشان تھا کیونکہ مجھے خون پیے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ یہ ماہ قمری کے زوال کے دن تھے۔ شیطانی کیفیت کسی وقت بھی طاری ہوسکتی تھی۔

ثناء گاؤں کی ایک خوبصورت دوشیزہ تھی۔ میں اسے ذاتی طور پر پسند کرتا تھا۔ میرے خیال میں وہ بھی مجھے پسند کرتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی اس بات کا اظہار نہ کیا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میرا شمار گاؤں کے کڑیل اور وجیہہ جوانوں میں ہوتا تھا۔ دوسرا دو انسانوں کا خون پینے کے بعد تو میرا رنگ وروپ ہی بدل گیا تھا۔ میرا چہرہ انار کی مانند سرخ ہوگیا تھا۔ جس نے میری خوبصورتی اور وجاہت کو چار چاند لگا دیے تھے۔

میرا خیال ہے کہ اگر سنگ دل سے سنگ دل لڑکی بھی اس وقت مجھے ایک نظر دیکھ لیتی تو اس کے دل میں بھی میرے لیے کوئی نرم گوشہ ضرور پیدا ہوجاتا۔ ثناء تو پہلے ہی مجھے پسند کرتی تھی۔ اس بار تو وہ مجھ پر دل وجان سے فدا ہوگئی تھی۔ وہ بار بار اپنے نسوانی حربوں سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

اس کی اسی حوصلہ افزائی نے میرے لیے راستہ ہموار کردیا۔ پھر جیسے ہی مجھے تنہائی ملی میں نے اسے اپنے دل کی بات بتادی اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ آج رات کنویں کے پاس آکر مجھ سے ملے۔ ثناء نے بھی ملاقات کی حامی بھرلی۔

☆......☆......☆

رات کے وقت میں گھر سے چپکے سے نکلا اور کنویں پر آ گیا۔ کنویں کے اردگرد چاروں طرف گنے کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان سے ایک پگڈنڈی گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ میں گنے کے ایک کھیت میں دبک کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر نظر رکھ سکتا تھا۔ مجھے کھیت میں بیٹھے کافی دیر گزر گئی ثناء تھی کہ لیٹ ہوئی جارہی تھی۔

آخر یہ طویل انتظار ختم ہوا مجھے ثناء گاؤں والی پگڈنڈی پر آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر میں کھیت سے باہر نکل آیا۔ جب وہ میرے قریب آگئی تو میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

''بہت دیر کردی ثناء؟ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔'' میں نے ہلکی سی ناراضگی سے کہا۔

''وہ دراصل امی، ابا ابھی تک جاگ رہے تھے۔ پھر جیسے ہی وہ سوئے میں اِدھر آ گئی۔'' ثناء میری آغوش میں تھی اور میں اسے بے اختیار پیار کررہا تھا کہ اچانک میری طبیعت بے چین سی ہوگئی۔ میرے جسم کے تمام بال آہستہ آہستہ کھڑے ہورہے تھے اور اس کے بعد مجھے خود پر کوئی اختیار نہ رہا۔ وہی پرانی خوابی کیفیت دوبارہ طاری ہوچکی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ میری حالت بدلنے لگی میرے سر اور جسم کے سارے بال سرکنڈوں کی طرح کھڑے ہوگئے اور میں شیطانی روپ میں آ گیا۔ اب وہاں میری جگہ ایک بھیانک عفریت تھی جس کی آغوش میں ثناء دبی ہوئی تھی۔

پھر جیسے ہی ثناء کو میری گرفت میں سختی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ دہشت نے اس کے حواس خطا کردیے تھے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہ سکی۔ میں نے اس کے منہ پر زور سے ہاتھ جما دیا اور دونوں دانت اس کی گردن میں گاڑھ دیے اور اسے تب چھوڑا جب میں اس کے جسم کا سارا خون پی چکا تھا۔

ثناء کی لاش میری آغوش میں جھول رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ بہت گڑبڑ ہوچکی ہے کیونکہ میں اب شیطانی کیفیت سے نکل چکا تھا۔

وہ ثناء جسے میں محبت کرتا تھا آج میرے ہاتھوں ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ میرے ذہن میں بچ نکلنے کا ایک خیال آیا کہ کیوں نہ لاش کنویں میں پھینک دوں۔ اس طرح یہ ایک اتفاقی حادثہ بن سکتا تھا اور پھر میں نے لاش اُٹھا کر کنویں میں پھینک دی اور خود چپکے سے گھر آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن جب گاؤں کی عورتیں کنویں سے پانی بھرنے گئیں تو انہیں ثناء کی پھولی ہوئی لاش نظر آئی۔ کچھ

لوگوں نے کنویں سے لاش نکالی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ ثناء رات کو رفع حاجت کو آئی ہوگی اور پھر پانی نکالتے ہوئے کنویں میں پھسل کر گر پڑی۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ کسی نے بھی اس کی گردن پر موجود دانتوں کے دو باریک سوراخ پر دھیان نہ دیا۔ ثناء کی موت پر اس کی ماں اس قدر روئی کہ میرا دل بھی دہل کر رہ گیا۔ اسے گاؤں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔

اس واقعے کے بعد میرا دل بہت اُداس ہو گیا تھا۔ مجھے خود اپنے وجود سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس خباثت کی زندگی سے تو بہتر ہے کہ میں خود کو موت کے حوالے کردوں۔ لیکن پھر جانے کیا سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اب تک میں تین انسانوں کا خون پی چکا تھا۔ اور اب اس بات پر سچ کی مہر ثبت ہو چکی تھی کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

ایک دن مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کسی عامل سے رجوع کروں۔ شاید وہی مجھے اس چکر سے نجات دلا دے۔ معلوم کرنے پر مجھے ایک مشہور ترین عامل کا پتا چل ہی گیا۔ اس کا نام رحمت اللہ تھا۔ رحمت اللہ لوگوں کے جن بھوت نکالنے میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بڑی دھوم تھی۔ لوگوں کے کہنے کے مطابق اس کے پاس کالے علم کی بہت بڑی طاقت تھی۔ میں بھی اس کے پاس جا پہنچا۔

اس وقت اس کے مکان پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ لوگ باری باری اندر جا رہے تھے۔ میں ایک طرف بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر بعد جب سب لوگ فارغ ہو گئے تو میں بھی اندر چلا گیا۔

عامل رحمت اللہ نے مجھے دیکھا تو چونک پڑا۔ میں اس کے پاس پہنچا اس نے مجھے بیٹھ کر پوری بات بتانے کا کہا۔ میں نے شروع سے اب تک پیش آنے والے تمام حالات اس کے گوش گزار کر دیے۔

میری بات سُن کر اس نے کہا کہ اسے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ میرے جسم پر کوئی بڑی شیطانی قوت قابض ہے کیونکہ اس کے پوشیدہ مؤکل میرے اندر داخل ہوتے ہی ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ یہ قوت ایک بدروح کی تھی۔ میرے جسم پر کوئی شیطانی بدروح قابض ہو گئی تھی۔

رحمت اللہ نے مجھے تسلی دی کہ وہ میرے جسم سے اس بدروح کو نکلنے پر مجبور کر دے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ پر آج رات ایک عمل کرے گا جس سے بدروح جسم سے نکل بھاگے گی۔ اس سے رات دوبارہ ملنے کا وقت لے کر میں واپس چلا گیا۔

☆......☆......☆

رات کے وقت میں دوبارہ رحمت اللہ کے گھر آیا۔ وہ میرا ہی منتظر تھا۔ عامل کہنے لگا کہ یہ عمل کرنے کے لیے ہمیں کسی قبرستان میں جانا ہوگا۔

چنانچہ ہم دونوں ایک قریبی قبرستان جا پہنچے۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ قبرستان کا ماحول بڑا پُر ہیبت تھا۔ وہ مجھے لے کر آگے بڑھتا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلتا رہا۔ آخر قبرستان کے دوسرے کونے پر ایک پرانی قبر کے پاس پہنچ کر ہم رُک گئے۔

یہ بہت پرانی قبر تھی۔ عامل قبر کے ایک طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور مجھے کہنے لگا کہ اس کے سامنے قبر کی دوسری طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤں۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور قبر کے دوسری طرف اس کے سامنے جا بیٹھا۔ اس نے دونوں آنکھیں مجھ پر گاڑھ دیں اور عمل پڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد ہی مجھے بے چینی ہونے لگی۔ وہ بلند آواز میں منتر پڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے منتر آگے بڑھ رہا تھا۔ میری بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور پھر میں نے شیطانی روپ دھارنا شروع کر دیا۔ میرے حلق سے غیر انسانی چیخیں گونج رہی تھیں۔ مجھے روپ بدلتا دیکھ کر اسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے جبکہ میرے جسم میں لگنے والی آگ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

پھر اچانک وہ کچھ ہو گیا جس کی عامل کو کوئی توقع نہ تھی۔ میں نے ایک چھلانگ لگائی اور قبر کے دوسری طرف بیٹھے عامل کو دبوچ لیا۔ اس اچانک افتاد نے اس کے اوسان خطا کر دیے اور وہ عمل بھول کر مجھ سے بچاؤ کی کوشش کرنے لگا۔ مگر میری شیطانی طاقت کے آگے اس کی حیثیت ایک چیونٹی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ میری گرفت

سے نکلنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ جبکہ میں کسی درندے کی طرح اس کا لہو پیتا رہا۔

اس کا سارا خون پینے کے بعد میں وہاں سے نکل آیا جبکہ عامل کی لاش وہیں قبرستان میں پڑی رہ گئی۔

اس کے بعد میں نے دوبارہ کسی عامل سے رجوع نہ کیا۔ مجھے جب بھی پیاس لگتی کسی انسان کا خون پی لیتا اسی طرح مجھے ایک دن انسانی خون کی طلب ہوئی تو میں گاؤں کی طرف چل دیا۔

ابھی میں گاؤں سے کافی فاصلے پر تھا کہ مجھے کوئی آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مکمل شیطان کا روپ دھار لیا۔ اور پھر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں نے اسے دبوچنے کے لیے ایک جست لگائی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ میری گرفت میں ہوتا اور میں اس کا خون پی رہا ہوتا۔

لیکن اس بار کچھ اُلٹ ہی ہو گیا۔ جیسے ہی میرے ہاتھ آنے والے انسان کے جسم سے ٹکرائے اس کے بعد مجھے صرف اتنا ہی یاد رہا کہ میں کئی فٹ دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا اور پھر جب تاریکی کی یہ سیاہ چادر دور ہوئی تو میں نے خود کو ایک کمرے میں آرام دہ بستر پر پایا۔

میرے قریب ہی ایک نورانی صورت باریش بزرگ کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مسکرائے اور بولے۔

''گھبراؤ نہیں بیٹا...... رات میں ہی تمہیں راستے سے اُٹھا کر لایا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم پر ایک خطرناک بدروح قابض ہے۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ تم مجھے شروع سے ہی ساری بات بتاؤ۔''

میں نے جواب میں بزرگ کو شیطان بوڑھے کو مارنے سے لے کر کل رات تک کے حالات و واقعات تفصیلاً بتا دیے۔

میری بات سُن کر بزرگ کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گئے اور پھر بولے۔

''بیٹا یہ خبیث بدروح دراصل بوڑھے کے جسم میں موجود تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کے لگائے ہوئے زخم کے راستے یہ تمہارے جسم میں داخل ہو کر خون میں شامل ہو گئی ہے۔ اب اس بدروح سے نجات کا صرف ایک طریقہ ہے کہ تمہیں ختم کر دیا جائے۔ تمہارے ختم ہونے کے بعد یہ بدروح تمہارے جسم سے نکل جائے گی اور پھر دوبارہ کسی کے جسم میں داخل نہ ہوگی۔''

''لیکن بابا کیا اس بدروح سے نجات کی کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ یعنی میری موت کے علاوہ۔'' میری بات سُن کر ایک بار پھر بزرگ کچھ سوچتے رہے اور پھر بولے۔

''دیکھو بیٹا اس دنیا میں میرے پاس کیا کسی کے پاس بھی اس بدروح کو تمہارے جسم سے نکالنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہاں لیکن ایک راستہ ہے کہ اس بدروح کو تمہارے جسم میں اس طرح قید کیا جائے کہ یہ اپنے شیطانی مقاصد کے لیے تمہارا جسم استعمال نہ کر سکے اور اس کے لیے تمہارے سینے پر مہر سلیمانی گرم کر کے لگانی ہوگی۔''

اس کے بعد بوڑھے نے مجھے ایک انگوٹھی دکھائی جس پر کچھ الفاظ اُبھرے ہوئے تھے۔

''یہ مہر سلیمانی ہے۔'' بزرگ نے آگ منگائی اور انگوٹھی اس میں دبا دی۔ کچھ دیر بعد ہی انگوٹھی تپ کر سرخ ہو گئی۔ انگوٹھی کی سرخی دیکھ کر پہلے تو میرے پسینے چھوٹ گئے مگر پھر بزرگ کے حوصلہ دینے پر میں مان گیا کہ چلو اس عارضی تکلیف کے بعد ہمیشہ کے لیے عذاب سے جان چھوٹ جائے گی۔ بزرگ نے سرخ انگوٹھی ایک چمٹے سے پکڑی اور مضبوطی سے میرے سینے پر بائیں جانب ٹھپہ لگا دیا۔ تکلیف کی شدت سے میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو بزرگ میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے سینے کی طرف دیکھا تو کوئی دوا لگی ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر درد کا نام و نشان نہ تھا۔ بلکہ ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔

اس طرح کچھ دن میں بزرگ کی دی ہوئی دوا سینے پر لگاتا رہا حتیٰ کہ زخم بالکل ٹھیک ہو گیا۔ البتہ سینے پر مہر سلیمانی کا اَن مٹ نشان آج بھی موجود ہے۔ جو شاید موت کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔

☆☆......☆☆



خالہ بیگم!

غوثیہ نجیب

اُس گھر کا خونی آسیب آخر خالہ بیگم کی جان لے ہی گیا مگر......

خالد اور سبین نے شادی کے شروع دنوں میں ہی یہ اپارٹمنٹ خرید لیا تھا مگر اب جبکہ خالد کا ٹرانسفر مستقل پنڈی ہو گیا تو ان کو یہ اپارٹمنٹ بیچنا پڑا۔ خالد نے پہلے ایک ہفتے دوست کے گھر رہائش اختیار کی مگر چونکہ اب اپنی فیملی کو بھی مستقل بلانا تھا اس لیے فوری رہائش کا بندوبست اشد ضروری ہو گیا تھا۔

کافی بھاگ دوڑ کے بعد پنڈی کے مضافاتی علاقے میں ایک گھر ملا، قیمت بھی کم تھی حالانکہ آس پاس رہائش کم تھی، آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر خالد نے سوچا اتنا اچھا بنا بنایا گھر مل رہا ہے، قیمت بھی کافی کم ہے اور آبادی بھی وقت کے ساتھ ہو ہی جائے گی۔ آج کل تو مکانوں کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ لوگ اس طرح کی جگہ کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ ذرا کم قیمت اور اچھے بنے ہوئے مکان مل جائیں۔

خیر مکان خرید لیا گیا۔ اب سبین اور بچے بھی آ گئے۔ سبین تھوڑا پریشان ہو گئی کہ یہ علاقہ ذرا سنسان تھا، خالی پلاٹس کافی تھے۔ ذرا ہٹ کر بنگلوز بنے تھے مگر خالد نے تسلی دی کہ اتنا نہ سوچو، ہمارا گھر بہت خوبصورت ہے۔ اتنا اچھا گھر ملا ہے، اب اس کو کیسے ڈیکوریٹ کرنا ہے۔ کس طرح صفائی کرنا ہے، یہ سوچو۔“

اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

سبین اور خالد کی دو بیٹیاں سارہ اور حوریہ تھیں اور بیٹا چھوٹا تھا اس کا نام حسن تھا۔ حسن بہت پیارا بچہ تھا، ذرا حساس بھی زیادہ تھا۔ لاڈلا ہونے کی وجہ سے ایک حد تک ڈرپوک بھی ہو گیا تھا۔ سارہ اور حوریہ جن کی عمریں 10 اور 8 سال تھیں اور حسن 6 سال کا بہنوں کا بے حد لاڈلا تھا۔ سبین اور خالد بھی حسن کو بہت زیادہ چاہتے تھے کیونکہ وہ بہت چھوٹا تھا اور ابھی ناسمجھ تھا۔ سارہ اور حوریہ ذرا سمجھدار تھیں۔

خالد اور سبین نے مل کر گھر کی تمام صفائی اچھی طرح کر لی تھی۔ سارہ حوریہ اور حسن نے بھی چھوٹے موٹے کاموں میں مدد کر دی تھی، اس طرح کافی حد تک گھر سیٹ ہو گیا تھا۔ فرنیچر سب ان لوگوں نے نیا لیا تھا۔ سب خوش تھے کہ اب تمام کام ہو گیا بس سکون سے بچے چھٹیاں بھی انجوائے کریں گے۔ ابھی بچوں کے یہاں اسکولز میں ایڈمیشن بھی کروانا تھے۔

سبین اور خالد نے اپنا بیڈروم ذرا ہٹ کر لیا اور تینوں بچوں کے کمرے ایک ساتھ تھے۔ سارہ اور حوریہ ایک ساتھ تھیں اور حسن کو الگ کمرہ دے دیا گیا۔ اس کے تمام Toys مثلاً Spider Man اور Pokemon وغیرہ اس کا Nintendo Game سب الگ اس کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔ حسن بہت خوش تھا کہ اب اُسے بہنوں کے ساتھ کمرہ شیئر نہیں کرنا تھا۔ اس طرح تمام سیٹنگ ہو گئی۔

☆......☆......☆

صبح جب خالد آفس چلے گئے تو سبین نے سوچا تھوڑی دیر گیٹ کے باہر کھڑی ہو جاتی ہوں۔ آتے جاتے کوئی ماسی نظر آئے تو اُس سے کسی کام والی ماسی کا پتا چل سکتا ہے۔ اب گھر کے کام وہ اکیلے تو نہیں کر سکتی۔ 20 منٹ کھڑے رہنے کے بعد اس کو ایک ماسی جاتی نظر آئی تو سبین نے آواز دے کر اس کو بلایا اور پھر کچھ دیر اُس سے بات چیت کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔

”تم کہاں کام کرتی ہو اور کیا پیسے لوگی وغیرہ۔“

ماسی نے سبین کو غور سے دیکھا اور بولی۔

”آپ اس گھر میں رہنے آئی ہیں۔“ سبین بولی۔

”ہاں کیوں کیا بات ہے؟“

ماسی بولی۔ ”نہیں بس ایسے ہی پوچھ لیا۔“ وہ کچھ عجیب طرح سے بات کر رہی تھی پھر بولی۔ ”میں تو باجی بہت مصروف ہوں۔ کل تک ایک عورت کام کرنے والی لا دوں گی آپ کو۔ اس کو کام کی ضرورت بھی بہت زیادہ ہے۔ غریب ہے بیچاری۔“



''اچھا ٹھیک ہے کل صبح 9 بجے تک اس عورت کو لے آنا، میں رکھ لوں گی۔ مجھے بہت ضرورت ہے اس وقت کام والی کی۔'' یوں وہ عورت چلی گئی مگر سبین کو لگا وہ تھوڑا ہچکچا رہی تھی اس کے گھر کام کرنے سے۔

☆......☆......☆

خالد نے شام کو آ کر تمام دن کی روداد پوچھی اور بچوں کا دن کیسا گزرا۔ بچوں نے خوشی خوشی جواب دیا ابو ہم نے بہت انجوائے کیا۔ یہاں تو ٹریفک کا شور بھی نہیں آتا۔ سکون ہے ہم نے T.V بھی دیکھا۔ Games کھیلے اور باہر لان میں پودوں اور گھاس کو پانی دیا۔ بہت Enjoy کیا۔''

سبین نے کچن میں کھانا تیار کر کے Table پر لگایا اور کھانے کے دوران اس نے خالد کو بتایا کہ ایک کام کرنے والی عورت سے آج بات کی تھی۔ کل وہ کسی ماسی کو لے کر آئے گی۔ ویسے وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا بھی مگر اُس نے ٹال دیا۔''

خالد ہنسا اور بولا۔

''اوہو! اب تم ماسیوں کے موڈ بھی اتنی توجہ سے چیک کرنے لگی ہو۔ ارے بھئی وہ نہیں تو دوسری تو آ رہی ہے۔''

اور یوں کھانے کے کچھ دیر بعد سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔

☆......☆......☆

رات کے کوئی 3 بجے ہوں گے اچانک زوردار آواز آئی۔

جیسے کسی نے زور سے دروازہ بند کیا ہو۔ آواز اوپر چھت پر بنے کمرے سے آئی تھی۔ چھت پر ایک کمرہ بنا تھا جو بند تھا۔ اس کو تالا لگا تھا اور اوپر ایک اسٹور تھا جس کو خالد نے مزدوروں سے صاف کروالیا تھا اور کچھ سامان اس میں رکھ دیا تھا خالی کارٹن وغیرہ۔ سبین نے ڈر کر خالد سے کہا۔

''آپ اوپر جا کر دیکھیں کون ہے۔'' مگر خالد نے کہا۔

''بھئی ہوا تیز ہے۔ دروازہ ہوا سے بند ہو گیا ہوگا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔''

☆......☆......☆

صبح خالد آفس چلے گئے۔ بچے ابھی سو رہے تھے وہ 10 بجے تک اٹھتے تھے۔ چھٹیاں جو تھیں۔ گیٹ پر کوئی تھا۔ مسلسل بیل بج رہی تھی۔ سبین نے جا کر دیکھا تو ماسی تھی۔ اُس کے ساتھ کوئی بوڑھی عورت تھی۔ سبین نے پوچھا۔

''ارے تم کام کیسے کرو گی۔ ہمارا کام زیادہ ہے۔ جھاڑو برتن اور کپڑے، اس کے علاوہ ڈسٹنگ بھی ہے۔ تم کافی بوڑھی اور کمزور ہو۔'' عورت نے غور سے دیکھا اور بولی۔

''آپ کو کام چاہیے، میرے بوڑھے ہونے سے آپ کو مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

سبین کو اُس کی بات اچھی نہیں لگی پھر بھی اس نے برداشت کیا اور بولی۔

''ارے نہیں میں تو اس وجہ سے کہہ رہی تھی کہ آپ تھک جائیں گی۔'' وہ عورت بولی۔

''میں سب کام کر لوں گی آپ بے فکر ہو جائیں۔''

اور یوں وہ بوڑھی عورت اندر آ گئی۔ اس نے اپنا نام شانتی بتایا۔ وہ ہندو تھی اور یہ بات سبین کو کھٹکی مگر اب کوئی چارہ نہ تھا۔ شانتی نے جلدی جلدی تمام برتن دھو کر صفائی شروع کر دی۔

سبین نے خالد کو فون کر کے ہفتے بھر کا سامان منگوالیا۔ جس میں گوشت اور سبزی شامل تھے۔ خالد نے آفس سے ایک لڑکے کو جو چائے وغیرہ بناتا تھا وہ سامان خرید کر گھر پہنچانے کو کہہ دیا اور اس طرح وہ سامان لے کر گھر آیا۔ سبین نے اس کو کچھ پیسے دیے اور کہا۔

''تم آفس جاؤ اب اور کوئی کام نہیں۔''

گوشت اس نے ٹیبل پر رکھ دیا اور سبزی بنانے لاؤنج میں آ گئی۔ کٹنگ میں ٹائم لگ گیا۔ ماسی کام کر کے جانے والی تھی۔ سبین نے کہا کہ جاتے ہوئے گیٹ بند کر جانا۔ وہ خود لاک ہو جاتا ہے۔'' اور خود کام میں لگ گئی۔ کچن میں آئی تو گوشت بہت تھوڑا سا اور بکھرا پڑا تھا اس کو فکر ہوئی کہ کیا ماسی وہ گوشت لے گئی۔ مگر اُس کے ہاتھ میں تو کچھ نہ تھا۔ پانچ کلو گوشت میں اب صرف چند ہڈیاں ہی پڑی تھیں۔

سبین نے وہ گوشت بھی پھینک دیا۔ اس کو اچھا نہیں لگا اور آج صرف سبزی کی ڈشز ہی بنالیں۔

شام کو خالد جب گھر آیا تو سبین نے پورا واقعہ بتایا۔

وہ ہنس دیا اور بولا۔ ''چلو ماسی نے پہلے ہی دن تم کو چونا لگا دیا، سارا گوشت گھر لے گئی اور تم کو پتا بھی نہیں چلا۔''

سبین نے بھی اس بات کو اور نہیں بڑھایا۔ کھانے کے بعد سب سو گئے اور صبح وہی روٹین تھی۔ بڑھیا عورت آئی اور سیدھی کچن میں گئی۔ سبین اور بچے ناشتا کر چکے تھے۔

سبین نے سوچا آج ذرا الماری کی صفائی کر لوں ترتیب بدل لوں چیزوں کی تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کا تمام زیور غائب تھا۔ خوف سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی کہ خالد سے ڈانٹ بھی پڑے گی کہ تم گھر کا خیال نہیں رکھتی ہو۔ کبھی گوشت غائب کبھی کچھ اور اب زیور جو لاکھوں روپے کا تھا اس کی بھی حفاظت نہ کر سکیں۔

سبین نے شام کو خالد کے آنے کے بعد بھی اس کو کچھ نہ بتانے کا عہد کر لیا سب نے کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر T.V دیکھا۔ پھر سب اپنے کمروں میں آرام کرنے چل دیے۔ سبین کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اُس کو اپنے زیور کی فکر تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا کہ زور زور سے ڈھولک کی آواز آئی جیسے کسی گھر میں شادی ہو۔ چھت سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی بہت واضح آواز آ رہی تھی۔

''خالد اُٹھو جلدی اٹھو اوپر جا کر دیکھو کیا شور مچا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' خالد نے اُٹھ کر سبین کی طرف اور پھر اپنی گھڑی دیکھی 4 بج رہے تھے۔ وہ بولا۔

''ارے یار مجھے سونے دو کل میری آفس میں میٹنگ بھی ہے۔ تم کو پتا نہیں کون سی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ مجھے تو سب پرسکون لگ رہا ہے۔ بچے بھی سب سو رہے ہیں، تم بھی سو جاؤ اور فالتو باتوں اور وہم میں نہ پڑو۔ لگتا ہے آج کل تم کچھ زیادہ حساس ہو گئی ہو۔''

یہ کہہ کر خالد پھر سو گیا اور سبین بھی آیت الکرسی کا ورد کرتے دوبارہ سو گئی۔

صبح پھر وہی گھر کے کام تھے۔ سبین نے سوچا کہ وہ اپنی خالہ کو ان باتوں کے بابت بتائے۔ وہ نمازی پرہیزگار اور وظائف وغیرہ جانتی ہیں۔ کافی لوگوں کی مدد کرتی رہتی ہیں۔ ان کو محلے پڑوس اور رشتہ دار 'خالہ بیگم' کے نام سے پکارتے تھے۔ سبین نے اُن کو فون کیا اور ساری صورت حال واضح طور پر بتا دی۔ خالہ بیگم نے کچھ وظائف پڑھنے کو دیے اور کہا کہ ان کی بہو ذرا میکے رہنے گئی ہے۔ وہ ایک دو دن میں آ جائے تو وہ سبین کے گھر آ جائیں گی اور تمام چیزوں کا جائزہ لیں گی۔ ملتان سے آنے میں اُن کو زیادہ ٹائم نہیں لگے گا۔

☆......☆......☆

سبین نے یہ بات خالد کو نہیں بتائی صرف یہ بتایا کہ میں سارا دن اکیلی ہوتی ہوں سوچا خالہ بیگم کو کچھ دن کے لیے بلا لوں۔ خالد نے کوئی اعتراض نہ کیا بولا۔

''اچھا جو تم چاہو کرو، تمہارا گھر ہے باس۔''

☆......☆......☆

خالہ بیگم تیسرے دن پہنچ گئیں۔ وہ بہت تھک گئی تھیں۔ لنچ کے بعد حسن کے کمرے میں آرام کرنے لیٹ گئیں۔ سبین نے حسن کے کمرے میں ایک اور سنگل بیڈ لگا کر اُن کے رہنے کا انتظام کر دیا تھا۔

رات کے کھانے میں سبین نے بہت اہتمام کیا، خالہ بیگم کی دعوت ہو گئی۔ سب باتیں کرتے رہے اور پھر اپنے کمروں میں جا کر لیٹ گئے۔

رات ایک بجے کا وقت ہوگا۔ سبین کو لگا کسی طاقت نے اس کو اوپر اٹھایا ہوا ہے اور وہ ہوا میں معلق ہے۔ عجیب کیفیت تھی وہ نیند کے غلبے میں تھی اچانک اس کو کسی نے زور سے پٹخ دیا۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی یہ خواب ہوگا اور قرآنی آیات کا ورد کرتے دوبارہ سونے کی کوشش کی۔ اتنے میں حسن کے کمرے سے چیخوں کی آواز آئی۔ سارا گھر اُٹھ گیا اور سب حسن کے کمرے کی سمت بھاگے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ خالہ بیگم تسبیح لیے

زور زور سے کچھ پڑھ رہی تھیں اور کمرے میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ حسن نے سبین اور خالد کو دیکھ کر بیڈ سے چھلانگ لگائی اور الماری کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں ایک لڑکی بال کھولے بھیانک شکل لیے ان سب کو گھور رہی تھی۔ جیسے جیسے وظیفہ تیز آواز سے پڑھا جارہا تھا کہ اچانک وہ لڑکی غائب ہونا شروع ہوئی دروازہ زور سے بند ہوا اور تیز ٹھنڈک کا احساس ختم ہونا شروع ہوگیا، ورنہ لگتا تھا کہ برف کی سل جیسے ہاتھ پاؤں ہوگئے ہوں۔

خالہ بیگم نے تمام رات جائے نماز بچھا کر پڑھتے گزار دی۔ وہ تھک گئیں مگر سونے نہیں لیٹیں اُن کی وجہ سے آج حسن کو اس عفریت سے نجات مل گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔

صبح فجر کی نماز پڑھ کر خالہ بیگم سوگئیں۔ سبین نے خالد کو کہا کہ اب وہ فوراً یہ گھر بیچ دے۔ ہم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ معصوم بچوں کے ساتھ اس آسیب زدہ گھر میں رہنا محال ہے۔''

خالد نے کہا کہ اتنی جلدی کیسے یہ سب ہوگا۔ تم فکر نہ کرو میں کوشش کررہا ہوں کہ کسی طرح ہم یہ گھر بدل لیں مگر ابھی تو ہم کو آئے بیس دن ہوئے ہیں اور یہ آفت آگئی۔ کون اتنی جلدی خریدے گا ہم سے یہ گھر۔'' وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔

سبین نے سب کو ناشتا دیا اور ماسی کا انتظار کرنے لگی۔ آج وہ دیر سے آئی اور آتے ہی کچن میں گھس گئی۔ جب وہ کام سے فارغ ہوئی تو حسن کے کمرے کی صفائی رہ گئی۔ سبین نے کہا اس کمرے کی صفائی کیوں نہیں کی تم نے تو وہ بڑھیا بولی۔

''وہاں کوئی عورت سو رہی ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گی۔''

سبین نے کہا کہ تم کو اس سے کیا۔ تم کام کرو اور جاؤ۔''

''اچھا'' اور پھر وہ حسن کے کمرے کی صفائی کرنے لگی۔ اتنے میں خالہ بیگم اُٹھ گئیں اور اُس عورت کو دیکھ کر خاموشی سے باتھ روم گئیں، وضو کرکے آئیں تو وہ جاچکی تھی۔ انہوں نے سبین سے کہا کہ پہلی فرصت میں اس عورت کو کام سے ہٹادو۔'' ابھی وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ بڑھیا خالہ بیگم کو گھورتی ہوئی باہر جانے لگی اور بولی۔

''مجھے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے۔ مجھے گاؤں جانا ہے۔'' اور سبین کو مڑ کر دیکھے بغیر وہ جلدی سے گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

خالہ بیگم نے سبین کو ہر وقت باوضو رہنے کو کہا اور دونوں لڑکیوں پر پانی دم کرکے چھڑک دیا اور پلا بھی دیا۔ حسن سو رہا تھا اس نے پانی نہیں پیا۔ اب سبین کام کرتے وقت بھی باوضو رہتی۔ ہر وقت آیت الکرسی کا ورد زبان پر جاری رہتا۔ بچیاں الگ خوفزدہ تھیں۔ ابھی سب بیٹھے ہی تھے کہ اچانک چھت پر پھر زوردار آواز آئی اور دھڑ دھڑ دروازہ بجنا شروع ہوگیا۔ خالہ بیگم نے قرآت شروع کردی تو فوری آواز بند ہوگئی۔

☆......☆......☆

سب نے شام کی چائے لان میں پی اور خالد کا انتظام کررہے تھے کہ وہ آئے تو بتائیں کہ کس طرح کام والی عورت جلدی سے بھاگی اور پھر چھت پر آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔

مگر خالد کو آج کام زیادہ تھا وہ تقریباً 8 بجے تک آئے۔ اتنے میں حسن کی چیخ سنائی دی۔ سب کمرے میں گئے مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ بہت خوفزدہ لگ رہا تھا۔ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ اس نے کیا کہنا تھا وہ خود بھول گیا۔ خیر خالد نے اُسے گود میں اٹھایا اور لاؤنج میں آگئے۔ وہاں آکر اس کو لٹا دیا۔ شربت پلایا۔ اب وہ کچھ نارمل لگ رہا تھا۔ سب نے کھانا کھایا، باتیں کرتے کرتے رات کافی ہوگئی۔ T.V پر نیوز دیکھتے خالد کی آنکھ لگ گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک عورت حسن کو اُٹھا کر اپنے ساتھ سنسان جگہ لے جارہی ہے۔ اس نے سفید لباس پہنا ہے اور وہ بہت بھیانک شکل کی ہے۔ اب حسن کے رونے کی آواز آئی تو عورت نے اُس کو مارنے کی کوشش کی۔ اچانک خالد سوتے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے اپنے اوپر آیت الکرسی پڑھ کر دم کی اور بچوں کے کمرے کی طرف گیا۔ سب سو رہے تھے حسن اور خالہ بیگم اور سارہ اور حوریہ بھی محوِ خواب تھیں۔ خالد نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے وہ دوبارہ سوگیا۔ اچانک سوتے میں اس کو سبین کی چیخوں کی آواز آئی مگر وہ وہم سمجھا لیکن بار بار آواز آنے پر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

آواز ڈرائنگ روم کی طرف سے آرہی تھی۔ ایک عورت سفید لباس پہنے حسن کو آواز دے کر بلا رہی تھی اور سبین کو دیکھ کر غرا رہی تھی۔ اس کی بھیانک شکل تھی۔ وہ وہی عورت تھی جو خالد کے خواب میں حسن کو اُٹھا کر لے جارہی تھی۔ سبین ڈر کے مارے اپنی جگہ سے ہل نہیں پارہی تھی۔ اچانک وہ خوفناک عورت ہوا میں معلق ہوکر چھت پر چپک گئی۔ اس کے ہاتھوں میں خون لگا تھا۔ خالد نے سبین کو جھنجوڑا۔

''جلدی کرو سبین! ہم کو ابھی اسی وقت یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اب ہم یہاں ایک منٹ نہیں رُکیں گے۔'' خالد نے حسن کو گود میں اٹھایا اور سبین نے جلدی سے سارہ اور حوریہ کو ساتھ لیا اور بھاگتی ہوئی خالہ بیگم کو ساتھ لے کر باہر آنے کو کہا خالہ بیگم مسلسل قرآنی آیات کا ورد باآواز بلند کررہی تھیں۔

حسن ڈر کے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس کو خالد نے جلدی سے اُٹھا کر گاڑی میں لاکر لٹا دیا تھا۔ سبین نے سارہ اور حوریہ کو پیچھے گاڑی کی سیٹ پر بٹھا کر دروازہ لاک کیا اور گھر سے نکلتے وہ قرآنِ پاک بھی ساتھ لائی تھی اور اُسے گاڑی میں رکھ دیا تاکہ بحفاظت رہیں۔

اب خالہ بیگم کی آواز مدھم پڑنے لگی۔ وہ تھک گئی تھیں، شاید ضعیف العمری کا تقاضا تھا۔ سبین نے اُن کو باہر آنے کو کہا۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھیں۔ کسی نے اُن کو پیچھے سے زور سے دھکا دے دیا وہ بے چاری گر گئیں۔ تکلیف کی شدت سے وہ تڑپ گئیں۔

سبین اور خالد نے اُن کو اٹھانے کی کوشش کی اور وہ اُٹھ گئیں مگر جیسے ہی وہ آگے بڑھیں اُن کے اوپر کوئی چیز آکر گری۔ وہ اپنا گلا چھڑانے لگیں اور پھر وظیفہ شروع کیا۔ تو اُس چیز نے ان کو چھوڑ دیا۔ اب انہوں نے سبین سے کہا کہ تم لوگ چلے جاؤ مجھے نہیں لگتا کہ یہ عفریت، یہ بلا میرا پیچھا چھوڑے گی۔''

خالد بولا۔ ''نہیں ہم آپ کو لے کر جائیں گے۔'' اچانک تیز بارش شروع ہوگئی اور آندھی کے ساتھ ہی مین گیٹ اتنی زور سے بج رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی بے چین روح اس کو بجارہی ہے۔ خالد نے خالہ بیگم کو ہاتھ سے پکڑ کر آگے بڑھنے کو کہا۔

اتنے میں چھت سے کوئی چیز آکر پھر سے خالہ بیگم کے سر پر لگی وہ تڑپ کر گر گئیں اور اُن کے سر سے خون کا فوارہ بہنے لگا۔ سبین اور خالد ڈر گئے یہ کیا ہوگیا۔ وہ چلانے لگے۔

خالہ بیگم نے بارش کے زور میں اپنی دھیمی آواز میں اُن کو جانے کو کہا اور بولیں۔

''بیٹا تم لوگ جاؤ! میرا وقت آگیا ہے۔ یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کو تنگ کیا۔ قرآنی آیات پڑھیں۔ تم سب کو بچایا، اب یہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔'' یہ کہہ کر خالہ بیگم کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ انہوں نے خالد اور سبین کی فیملی کو بچا کر اطمینان پالیا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی تھیں۔

خالد اور سبین گاڑی میں بیٹھ کر زور زور سے رونے لگے، بچیاں بھی رو رہی تھیں۔ شور سے حسن بھی ہوش میں آگیا تھا۔ گاڑی آگے بڑھاتے خالد اور سبین سوچ رہے تھے ہم کو خالہ بیگم نے اس عفریت زدہ گھر سے بچالیا مگر ہم ان کو نہ بچاسکے۔ اُن کے آنسو نہیں رُک رہے تھے۔ واپس جاتے تو جان کو خطرہ تھا۔ خالد نے گیٹ سے ٹکراتے جیسے تیسے گاڑی سڑک پر نکال لی۔

اِس طرح اِن سب نے اپنی جان بچالی مگر خالہ بیگم...... کیا وہ اسی لیے اُن کے گھر آئی تھیں کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ کیا اُن کو اُن کی مٹی یہاں کھینچ کر لائی تھی؟ یہ سوال ہنوز تشنہ ہیں۔ خالہ بیگم نے اپنی جان دے کر پانچ جانیں بچالی تھیں۔ شیطانی آتما نے انہیں اس نیکی کے لیے اُن کے خون سے اپنی پیاس بجھالی تھی۔

آج بھی وہ وقت یاد کرتے ہیں تو اس خوفناک رات کی کرب انگیزی اُن کو رُلا دیتی ہے۔ شاید وہ جب تک زندہ ہیں اس خوفناک رات کو نہیں بھولیں گے۔

☆☆......☆☆



ایک سربستہ راز

حاسم وقاص

اُس شخص کی داستانِ غضب، جسے اپنی بیوی کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان قربان کرنا پڑی

جمال کی موت اچانک اور غیر متوقع انداز میں ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہے۔ کیوں کہ کمرے میں بجلی کی ایک تار ٹوٹ کے اس کے مردہ جسم کے قریب جھول رہی تھی۔ پولیس کو تفتیش کے دوران بہت سی دوسری چیزوں کے ہمراہ ایک ڈائری بھی ملی۔ جس میں جمال کی تحریریں موجود تھیں۔ لگتا تھا وہ کوئی وہمی قسم کا شخص تھا۔

اس کے گھر کے قریب ایک خستہ حال مکان واقع تھا۔ جو بہت عرصے سے غیر آباد پڑا تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ بیس بائیس برس قبل اس مکان کا مالک اپنی بیوی کی موت کے بعد اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اپنے چھ سالہ بیٹے کو ساتھ لے کر کسی دوسرے شہر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹا مر گئے ہوں گے۔ تب سے یہ گھر خالی پڑا ہے۔

جمال کو اس مکان سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس ڈائری میں بار بار اس مکان کا ذکر تھا۔ اور یہ خوف بھی کہ اُسے مار دیا جائے گا۔ اس کی تحریر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی انجانے خطرے کی وجہ سے پریشان ہے اور اس کو ہلاک کرنے والا اور کوئی نہیں ہوگا بلکہ وہ خود ہی اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لے گا۔ یعنی اس کا خودکشی کا ارادہ تھا۔ جس کے لیے اُس نے بڑا آسان طریقہ اختیار کیا۔ اور بجلی کی تار کاٹ کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ لیکن اس میں بھی صداقت نہیں تھی کیوں کہ اس کے جسم کے کسی بھی حصے پر ایسا کوئی نشان نہیں تھا۔ جس سے شک ہوتا کہ اس کی موت بجلی کا کرنٹ لگنے سے واقع ہوئی ہے۔ البتہ اس کی گردن پر سوئی چبھنے کے دو تین نشانات تھے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے سوئی کے ذریعے اپنے جسم میں زہر پہنچا کر اپنے آپ کو مار ڈالا ہو۔ لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس کی تردید ہوگئی۔

پولیس والوں کو یقین تھا کہ جمال کی موت پُراسرار انداز میں واقع ہوئی ہے۔ ان دنوں گاؤں میں بھی عجیب وغریب واقعات ہو رہے تھے۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ جمال ملک کا بلند پایہ اور معروف شاعر اور فلسفی تھا۔

وہ عام آدمیوں کے برعکس بڑی اہم شخصیت کا مالک تھا۔ مگر پھر بھی اُس کی پوری زندگی وہم اور خوف کی دلدل میں گزری تھی۔ اسے کسی نے قتل نہیں کیا بلکہ وہ اپنے ہی وہم کی دہشت سے مر گیا۔

جب میں نے بحیثیت پولیس انسپکٹر کیس کی مزید تفتیش کی اور جمال کے ماضی کو کریدا۔ اس کے کمرے میں پڑے ہوئے ہر کاغذ کا مطالعہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ کالے جادو میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ وہ انتہائی ذہین تھا اور باپ کی موت کے بعد تعلیم مکمل ہونے تک ہر امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہو کر وظیفہ حاصل کرتا رہا۔

کالج کے آخری سال میں اس کا معاشقہ اپنی ایک کلاس فیلو شازی سے ہوگیا اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد اُسے اپنے ہی کالج میں پروفیسر کی ملازمت مل گئی۔ اور پھر اس نے شازی سے شادی کر لی۔ اور دونوں خوش خرم زندگی گزارنے لگے۔ کہتے ہیں خوشی کے دن مختصر ہوتے ہیں اور آنکھ جھپکتے ہی گزر جاتے ہیں۔ جبکہ رنج وغم کا دورہ طویل ہوتا ہے۔ جمال کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا۔

شادی کے دو سال بعد شازی کی بے رحم موت نے اُسے سے جدا کر دیا۔ شازی کی بے وقت موت کو اس نے شدت سے محسوس کیا۔ اور اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی ہوگئی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ حتیٰ کہ بیمار پڑ گیا۔ جس کی وجہ سے اُسے طویل رخصت لینی پڑی۔ اس دوران اُسے بہت سے لوگوں نے تعویذ گنڈے کرنے والوں کے پاس بھی آتے جاتے دیکھا اور پھر ایک دن وہ اپنے گھر سے نہیں بلکہ شہر ہی سے ایسے غائب ہوا کہ پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا۔

مزید معلومات حاصل کرنے پر جمال کے ایک ہمسائے نے بتایا کہ جمال جاتے وقت اپنے ساتھ صرف ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس اور گھر میں رکھا فریزر لے گیا تھا۔ باقی تمام چیزیں گھر میں ہی پڑی رہیں۔ اس کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ گاؤں سے



پیشتر کسی جوگی کے ساتھ بھی کچھ عرصہ پہاڑوں کی تاریک غاروں میں گزار چکا تھا۔

گاؤں آنے کے بعد اس نے اس غیر آباد مکان میں رہائش اختیار کی۔ اور جب گاؤں کے لوگوں میں اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں تو اس نے یہ کہہ کر لوگوں کا منہ بند کرنے کی کوشش کی کہ یہ مکان اس کی اپنی جائیداد ہے۔ جس میں رہنے کا اُسے پورا حق حاصل ہے۔

لوگ خاموش ہوگئے...... کسی کو کیا پڑی تھی کہ جائیداد کے بارے میں اس سے ثبوت طلب کرکے شرمندگی اٹھاتے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد جمال کے بارے میں مختلف افواہیں لوگوں میں گشت کرنے لگیں کہ وہ پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک ہے۔ نیز یہ کہ وہ گھر میں اکیلا نہیں رہتا۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ مقیم ہے۔ وہ کون ہے......؟ کسی کو معلوم نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اُسے کسی نے دیکھا تھا۔ وہ عورت ہے یا مرد۔ کسی کو علم نہیں تھا۔ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ کوئی کہتا کہ جمال جرائم پیشہ ہے اور کسی گھناؤنے جرم کا مرتکب ہونے کے بعد وہ اس چھوٹے سے گمنام گاؤں میں آ کر رہنے لگا ہے۔ تاکہ پولیس کی گرفتاری سے بچا رہے۔ کوئی کہتا کہ وہ کوئی مجرم نہیں ہوسکتا۔ انتہائی شریف کم گو اور تنہائی پسند قسم کا آدمی ہے۔

جمال کے متعلق کسی من چلے نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ شہر سے کسی عورت کو بھگا کر لایا ہے۔ اور وہی عورت اس کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ لیکن جب کہنے والے سے پوچھا گیا کہ اس نے عورت کو دیکھا ہے۔ تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مختصر یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

☆......☆......☆

حقیقت کا کسی کو علم نہ تھا۔ سب ہی لاعلم تھے۔

ایک دن ایک بوڑھے کسان نے بتایا کہ وہ رات کو دیر تک کھیتوں کو پانی دینے کے بعد جب گھر لوٹ رہا تھا۔ تو اس کا گزر اس خستہ حال مکان کے قریب سے ہوا۔ اس نے اندر سے باتیں کرنے کی آواز سنی تو دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ لیکن عورت کی آواز بے حد خفیف تھی۔ اس لیے اس کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

بوڑھے کسان کی اس مصدقہ خبر کے بعد لوگوں کو یقین ہوگیا کہ جمال کسی عورت کو بھگا کر لایا ہے اور پکڑے جانے کے خوف سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔

ان باتوں میں کہاں تک حقیقت تھی۔ کوئی بھی شخص یقین سے کچھ کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا لیکن ان افواہوں کی وجہ سے گاؤں والے رفتہ رفتہ جمال سے نفرت کرنے لگے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جمال جب کبھی کسی ضرورت کے تحت گھر آتا تو لوگ نفرت اور خوف کے سبب منہ پھیر لیتے۔ حالانکہ جمال نے کوئی بھی ایسی بات نہ کی تھی۔ جس سے کسی کو شکایت کا موقع ملتا یا کسی کی دل شکنی ہوتی۔ بلکہ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ گاؤں والے اُسے اپنے کنبے کا فرد سمجھیں۔ مگر حالات اس قدر پر اسرار ہو کر بگڑتے چلے گئے کہ قربت کا موقع ہی نہ آیا۔

وقت گزرتا گیا۔ لوگوں نے جمال کو بے ضرر سمجھتے ہوئے اس پر توجہ دینی چھوڑ دی۔ اب نہ تو کوئی اس کے متعلق کوئی بات کرتا نہ ہی دھماکہ خیز افواہیں سننے میں آتیں۔ جمال نے بھی عقل مندی سے کام لیا اور سب سے الگ تھلگ خاموش زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے لوگوں کا اعتراض ختم کرنے کی خاطر اس کھنڈر نما مکان کو چھوڑ کر قریب ہی ایک کمرے پر مشتمل چھوٹا سا مکان رہائش کے لیے کرائے پر حاصل کر لیا تھا۔ اس بہت بڑی تبدیلی کے باوجود وہ خود کو گاؤں والوں میں جذب نہ کر سکا اور الگ تھلگ زندگی گزارنے لگا۔

☆......☆......☆

شام کے اندھیروں میں سیر کے لیے باہر نکلنا اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ کھیتوں کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے گزرتا ہوا جنگل کی طرف آتا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ رات کو کس وقت گھر لوٹتا۔ گردش شام وسحر میں کوئی فرق نہ آیا۔ زندگی اپنے معمولات کے مطابق آگے بڑھتی رہی اور پھر ایک دن گاؤں میں ہنگامہ ہوگیا۔

پُرسکون ماحول میں ایک کم سن زندگی کراہنے لگی۔

گاؤں کی مختصر سی آبادی میں ایک کمسن بچے کی گمشدگی سے خوف و ہراس اور غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ یہ جس زمانے کی بات ہے اس زمانے میں صرف اخبارات اور ریڈیو ہی عوامی دسترس میں تھے۔ جب کہ ٹی وی بھی خال خال تھا۔ لیکن گاؤں میں اس اندوہناک واقعہ کے رونما ہونے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ پولیس نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ گاؤں والے بھی ہر طرف بھاگے دوڑے لیکن ان کی ہر کوشش ناکام رہی۔ بچہ کہیں ہوتا تو ملتا۔ جمال کو بھی اس واقعہ سے شدید صدمہ پہنچا۔ جیسے اس کا اپنا بچہ کھو گیا ہو۔

کئی دنوں تک اس کے کانوں میں گمشدہ بچے کی ولدوز چیخیں گونجتی رہیں اور وہ اس ذاقعہ کا ذمہ دار خود کو ٹھہراتا۔ لیکن کسی اور سے حقیقت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے پہلی مرتبہ اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر وہ شازی کی موت کے جانکاہ صدمے کو زندگی کی تلخ حقیقت سمجھ کر برداشت کر لیتا تو آج یہ ہولناک واقعہ پیش نہ آتا۔

اسے مستقبل کا خیال ستانے لگا۔ خدا جانے اس کے بعد کیا ہوگا......؟ کتنے بے گناہ انسانوں کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ خدا کرے یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے اور اس کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آئے۔ وہ شازی کو سمجھائے گا مگر کیسے؟

شازی کی زندگی کا دارومدار اب اسی پر ہے۔ وہ خون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر شازی مر گئی تو میری یہ زندگی کس کام کی ہے؟ کاش مجھے ''ووڈو'' کا جادو معلوم نہ ہوتا۔

☆......☆......☆

جمال کی آنکھوں کے سامنے گزرتے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے پھرنے لگے۔ جب تک اس کی ملاقات شازی سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی زندگی سے قطعی طور پر مایوس تھا۔ وہ خود کو اس بھری دنیا میں تنہا محسوس کرتا تھا اور شازی سے ملاقات کے بعد تو اس کی زندگی کے دھاروں کا رُخ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے تمام قنوطی نظریات یکسر تبدیل ہوگئے۔ شازی اس کی زندگی میں بہاروں کا پیغام لے کر داخل ہوئی اور محبت کی گلپاش وادیوں میں زندگی کی ساری تلخیاں اور نامرادیاں بھلا دیں۔ اس نے شازی کو پا کر زندگی اور دنیا کی تمام رعنائیاں حاصل کر لیں۔

ایک دن شازی کی طبیعت خراب تھی۔ وہ کالج نہ آئی تو جمال کو ایسے محسوس ہوا کہ اس کی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ شازی کے بغیر اس کی زندگی بے مقصد تھی۔ وہ سارا دن اداس رہا۔ اگلے روز جب شازی کالج آئی تو اسے کچھ سکون ملا۔ دونوں کی ملاقات بڑے جذباتی انداز میں ہوئی۔ شازی کو دیکھتے ہی اس کا صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا اور وہ رونے لگا۔ ایک دن کی مختصر جدائی نے اس کے محسوسات میں زہر گھول دیا۔ انہوں نے ایک بار پھر ساتھ زندگی گزارنے کی قسمیں کھائیں کہ وہ ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ مریں گے۔

بہت جلد وہ دن بھی آ گیا۔ جب شازی نے اپنے والدین کی مخالفت کے باوجود جمال سے شادی کر لی۔ دونوں خوش تھے۔ لیکن گردش فلک سے ان کی خوشی دیکھی نہیں گئی اور دو سال کے بعد موت نے شازی کو اُس مجھ سے چھین لیا۔ جمال کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ ایک بار پھر اس بھری دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔

شازی کو قبر کی مستقل تاریکیوں کے سپرد کرنے کے بعد جمال نے اپنی زندگی کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے شازی کے ساتھ جینے اور مرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اسے یہ وعدہ پورا کرنا تھا۔ وہ شازی کو زندگی تو نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن اپنی زندگی کو ختم کرنے کے مکمل اختیار تھا۔ اس نے میڈیکل اسٹور سے خواب آور گولیاں خرید لیں تاکہ نیند کی پرسکون وادیوں سے موت کے جہنم زدے میں پہنچ جائے۔

دن گزرا...... رات آئی تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ وہ شازی کے پاس پہنچنے کے بجائے شازی کو اپنے پاس کیوں نہ لے آئے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔

☆......☆......☆

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ جمال نے کدال اور بیلچہ اٹھایا اور شازی کو گھر لانے کے لیے نکلا۔ قبرستان کی پرہول بستی میں شازی کو نہیں

رہنا چاہیے۔ اسے اپنے گھر آنا چاہیے۔ قبر کی نرم مٹی کو اس نے بیلچے سے ہٹایا اور شازی کو قبر سے باہر نکالنے کے بعد قبر دوبارہ درست کر دی تاکہ کسی کو لاش کے غائب ہونے کا شبہ نہ ہو۔ شازی کی تازہ لاش ابھی خراب نہیں ہوئی تھی۔ جمال نے لاش کو گلنے سڑنے سے محفوظ رکھنے کی خاطر گھر میں پڑے ہوئے فریزر سے کام لیا۔ فریزر میں شازی کی لاش اپنی اصلی حالت میں منجمد ہو گئی۔ اب جمال کو صرف ایک خیال ستاتا تھا کہ کس طرح شازی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ وہ آخر کب تک لاش کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھے گا۔ اور لاش کو محفوظ کرنے کا بھی مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ آج بھی دنیا کی غیر مہذب اقوام میں کچھ لوگ ایسے موجود ہیں۔ جو دنیا کے قدیم علم 'ووڈو' جانتے ہیں۔ جس سے کسی مردہ انسان کو دوبارہ زندہ کیا جس سکتا ہے۔ وہ دن رات 'ووڈو' جاننے والے لوگوں کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔ در در کی خاک چھانتا پھرا۔ حتیٰ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے دیوتا کی قربان گاہ پر اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا اور شازی اُسے دوبارہ مل گئی۔ جمال کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہی حال شازی کا تھا۔ لیکن اس بار بھی ان کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ کچھ دنوں بعد شازی کے گرد پھر موت منڈلانے لگی...... اس کا رنگ پیلا پڑ گیا...... اس کو زندہ رہنے کے لیے خون چاہیے تھا گرم اور تازہ خون۔

جمال کو اب ایک نئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کسی بھی صورت شازی کو دوبارہ موت کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھا۔ اور یہی اس کی غلطی تھی۔ اس نے تلخ حقیقت کو قبول کرنے کے بجائے فرار کی راہ اختیار کی۔ جس کے ہر قدم پر موت کا خونی دیوتا کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔

وہ موت کے دیوتا سے آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ اب وہ کسی بھی صورت دوبارہ شازی کو موت کے حوالے کرنے کو تیار نہ تھا۔ چاہے اُسے اپنی زندگی سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑتے۔ اس نے موت کی حقیقت سے آنکھیں بند کر کے زندگی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

وہ شازی کو خون فراہم کرنے کے لیے تیار ہو گیا، گرم اور تازہ خون جس سے شازی کی زندگی وابستہ تھی۔ جمال ہر روز کوئی نہ کوئی جانور شازی کے لیے لاتا۔ وہ دن بدن صحت یاب ہوتی گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک بڑی خوفناک تھی۔ جیسے کسی خونخوار درندے کی ہوا کرتی ہے۔ بعض اوقات تو جمال بھی ڈر جایا کرتا۔ اور خوف کی سرد لہر اُس کے بدن میں دوڑ جاتی۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھا۔ اس نے موت کے دیوتا کو شکست دے دی تھی۔

دن گزرتے گئے اور شازی کی زندگی گھر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی۔ وہ گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی اور نہ ہی جمال اس راز کو فاش کرنا چاہتا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اس نے شازی کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ مگر شازی کی ضد کے آگے اُسے جھکنا پڑا۔

☆......☆......☆

ایک رات گھمبیر تاریکی میں وہ دونوں مجرموں کی طرح چھپ کر گھر سے نکلے۔ ان کا رُخ گاؤں سے باہر جنگل کی طرف تھا۔ جمال شازی کو انسانوں کی بستی سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ کھیتوں کی پتلی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے گئے۔ راستے میں ایک جگہ کسی زمیندار کے مویشی بندھے ہوئے تھے۔ جن کی رکھوالی دو کتے کر رہے تھے۔

جوں ہی وہ دونوں مویشیوں کے پاس پہنچے کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ تو وہ دونوں خوف سے بھاگ نکلے۔ مویشیوں کا بھی یہی عالم تھا۔ گویا کوئی خونخوار درندہ ان میں آن گھسا ہو۔ وہ رسیوں کو توڑ کر بھاگنے کے لیے زور لگانے لگے۔ ان میں سے ایک بچھڑا جو بہت ہی زیادہ خوفزدہ تھا۔ وہ رسی کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ زمین میں گاڑھی ہوئی لوہے کی موٹی کیل اکھاڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

شازی خوش ہو گئی مگر جمال پریشان ہو گیا۔ اسے خطرے کے احساس نے مجبور کر دیا۔ کہ وہ شازی کو گھر واپس لے جائے۔

☆......☆......☆

اس رات وہ بہت دیر تک اس تازہ افتاد کے بارے میں سوچتا رہا اور وہ اس صورت حال کے گھناؤنے نتائج کے تصور سے ہی کانپ گیا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ شازی کو کبھی گھر سے باہر نہیں جانے دے گا۔

اس واقعہ کے بعد جمال جب بھی گھر سے باہر جاتا تو شازی کو کمرے میں اور بند کر کے باہر سے تالا لگا دیتا۔ وہ اب کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ شازی کو بھی جمال کی ان پابندیوں سے صورتحال کا پوری طرح سے احساس ہو چکا تھا، لیکن وہ بھی مجبور تھی۔ اسے بھی تو زندہ رہنا تھا۔

اس کے باجود اس نے جمال سے کبھی اس سلسلہ میں شکایت نہیں کی بلکہ موقع کی تاک میں لگی رہی۔ آخر ایک رات اسے گھر سے باہر نکلنے کا موقع مل ہی گیا۔

رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ جمال گہری نیند سو رہا تھا۔ شازی چپکے سے اٹھی اور جمال کی جیب سے چابی نکال کر تالا کھول لیا۔ اب وہ ہر طرح سے آزاد تھی۔ اپنی آزادی کی پہلی رات شازی نے اپنی پیاس بجھانے کے لیے سب سے پہلا شکار گاؤں کے چوکیدار کو بنایا حالانکہ چوکیدار اپنی حفاظت کی خاطر اپنے ساتھ چار کتے رکھا کرتا تھا۔

لیکن شازی کے آگے کتوں کی کیا مجال تھی۔ جو دم مارتے۔ وہ شازی کو دیکھ کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رونے لگے۔ چوکیدار نے کتوں کی یہ حالت دیکھ کر بھی سنگینی کا اندازہ نہ لگایا۔ اور تاریک رات میں تنہا عورت کے متعلق یہی خیال تھا کہ شاید وہ کوئی مصیبت زدہ ہے۔ چوکیدار کے اسی ہمدردی کے جذبے نے اُسے موت کی نیند سلا دیا۔

اگلی صبح لوگوں کو چوکیدار کی لاش ایک کھیت میں پڑی ہوئی ملی۔ اس کے قریب ہی اس کے کتے بیٹھے دھیمی آواز میں رو رہے تھے۔ چوکیدار کا سارا بدن خون سے داغ دار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کے بدن سے گوشت نوچ نوچ کر ٹکڑے علیحدہ کیے ہوں۔ گاؤں والوں کو چوکیدار کی موت کا گہرا صدمہ پہنچا۔ لیکن وہ حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کچھ نہ کر سکتے تھے۔

☆......☆......☆

جمال کو بھی اس واردات سے صدمہ ہوا۔ مگر وہ حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی کسی کو کچھ بتا نہ سکا تھا۔ عبادا لوگ اُسے پاگل مجرم گردانتے ہوئے پولیس کے حوالے کر دیتے اور اُسے جیل کی ہوا کھانی پڑتی۔

مگر ایسی صورت میں شازی کو بھی کھلی چھوٹ مل جاتی اور وہ ان وارداتوں کی عادی ہو جائے گی۔ جمال کو یہ یقین تھا کہ دنیا میں صرف ایک وہی آدمی ہے۔ جس کی بات شازی مان سکتی ہے اور وہی شازی کو مزید خونخواری سے روک سکتا ہے۔ کیوں کہ ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی شازی نے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ اگر وہ چاہتی تو بڑی آسانی سے اُسے ہلاک کر سکتی تھی۔

☆......☆......☆

کچھ عرصہ بعد لوگ اس واردات کو بھول گئے۔ اور نیا چوکیدار بھی آ گیا۔ نیا چوکیدار سابقہ کے برعکس انتہائی نڈر اور بے رحم تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جرائم کرتے ہوئے گزرا تھا۔ اس کے نزدیک جیل اور گھر کی زندگی میں کچھ فرق تھا تو بس یہ کہ جیل میں وہ روٹی کی فکر سے آزاد ہوتا۔

یہ بات الگ تھی کہ گزشتہ چند برسوں سے وہ مجرمانہ زندگی کو خیر آباد کہنے کے بعد محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال رہا تھا۔ اس کے باوجود اُس کی ظالمانہ فطرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے لوگوں کو اس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ خطرناک سے خطرناک صورت حال سے نبرد آزما ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

لیکن ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اور کچھ ہی دنوں میں ایک واردات اور ہو گئی۔ اس مرتبہ شازی ایک گھر میں داخل ہو کر ایک بچے کو اٹھا کر لے آئی تھی

اس بچے کی لاش باوجود ہر ممکن کوشش کے بھی نہ مل سکی۔
لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ مائیں بچوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتیں۔ سرِ شام ہی گھروں کے دروازے بند ہو جاتے۔ گلی کوچے سنسان دکھائی دینے لگتے۔ البتہ چوکیدار اور پولیس کے سپاہی بھی آ جاتے۔
چوکیدار نے کتوں کے علاوہ ایک ریوالور بھی اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اب شازی کے لیے یہ صورت حال انتہائی پریشان کن تھی۔ وہ غصے میں بپھر گئی۔ اس نے مجبور ہو کر امیندار کے مویشیوں کی طرف توجہ دی۔ اس کے بعد ہر رات کوئی نہ کوئی جانور ہلاک ہونے لگا۔ ایک بار پھر خوف کی فضا پیدا ہو گئی۔
متعدد وارداتوں کے بعد زمینداروں نے مجبور ہو کر مویشیوں کی رکھوالی کے لیے مسلح افراد متعین کر دیے۔ جس سے شازی کے لیے خوراک حاصل کرنے کے تمام ذرائع بند ہو گئے۔
اسے ایک رات بھوکا سونا پڑا۔ دوسری رات بڑی تگ و دو کے بعد وہ دو مرغیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ گاؤں کے کتوں کا یہ حال تھا۔ وہ جونہی شازی کو دیکھتے تو آسمان کی طرف منہ کر کے روتے اور پھر دم دبا کر بھاگ جاتے۔ شازی کو ایک تدبیر سجھائی دی۔ وہ پولیس والوں سے خائف تھی کیوں کہ وہ دو دو کی ٹولیوں میں گشت کرتے تھے۔ کوئی بھی اکیلا نہیں تھا۔ البتہ چوکیدار کی بات دوسری تھی اسے قابو میں کرنا آسان تھا۔
ایک رات شازی جان بوجھ کر چوکیدار کے سامنے سے گزری۔ شازی کو دیکھتے ہی کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔
چوکیدار نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا اور روک کر اس سے سوالات کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شازی کے ساتھی بھی ہوں گے انہوں نے کہیں ڈاکہ ڈالنا ہو گا وہ کہیں قریب ہی ہوں گے۔ انہوں نے جوان اور خوبصورت عورت کو محض اس مقصد کے لیے بھیجا ہے کہ وہ مجھے باتوں میں لگائے رکھے اور وہ اپنا کام اطمینان سے کر کے چلتے بنیں۔ چوکیدار نے شازی سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کہاں جا رہی ہے؟
شازی نے پہلے سے سوچی ہوئی مصیبت زدہ ہونے کی من گھڑت کہانی سنائی اور خود کو بے سہارا بتاتے ہوئے رونے لگی۔ چوکیدار نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی مدد کرنے کا جھوٹا وعدہ بھی کیا تو وہ سمجھ گئی کام بن گیا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ چوکیدار بھی موقع کی تاک میں تھا کہ پولیس والے ادھر آئیں تو وہ شازی کو ان کے حوالے کر دے۔ اس نے اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھ کر اس کی گرفت مضبوط کر لی۔
شازی چوکیدار سے پیار بھری باتیں کرنے لگی اور وہ دونوں ایک منڈیر پر بیٹھ گئے۔ شازی کے لمس نے چوکیدار کے تن بدن نے انگارے بھر دیے۔ اس نے سنبھلنا چاہا لیکن شازی کے زیرشکن حسن نے اسے مدہوش کر دیا۔ اس کے باوجود چوکیدار کو کوئی انجانا سا خوف گھیرے ہوئے تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔
کوئی انہونی سی بات...... کوئی خوفناک واردات......!
پر وہ ایک دم سے اچھل کھڑا ہوا۔ جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ شازی کا تو بدن تو برف کی سل کی طرح سرد تھا۔ کیوں......؟ اسی خوف سے چوکیدار کے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔
چوکیدار کو محتاط دیکھ کر شازی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چوکیدار کو کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے دبوچنے کا سوچنے لگی۔
پھر اس نے اپنی دونوں بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر کے بوسہ لینے کے بہانے اپنے تیز نوکیلے دانت اس کی شہ رگ کے قریب ہی گردن میں پیوست کر دیے۔ چوکیدار خوف اور درد سے کانپ اٹھا۔ اس نے شازی کو اپنے سے جدا کرنا چاہا۔
لیکن شازی اس سے اس طرح لپٹ گئی تھی کہ اُسے جدا کرنا آسان نہ تھا۔ وہ عورت ہونے کے باوجود بڑی طاقتور ثابت ہو رہی تھی۔ چوکیدار کے اعضاء شل ہونے لگے اس کا سر چکرانے لگا۔ اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے اپنے بے حس اور کانپتے ہاتھوں سے کوٹ ہی کی جیب میں سے ریوالور کا رُخ شازی کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ اور خود خاموش ہو کر گر پڑا۔
فائر کی آواز سن کر پولیس والے اُدھر بھاگے تو چوکیدار بے ہوش پڑا تھا کچھ لوگ بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔ سب حیران تھے آخر ماجرا کیا ہے۔
چوکیدار کی گولی سے زخمی ہونے والا کہاں غائب ہو گیا؟ اسے زمین نگل گئی یا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے؟ تھوڑے فاصلے پر تازہ خون کے دھبے موجود تھے۔ اور اس سے آگے کوئی نشان نہیں تھا......
چوکیدار بھی مر چکا تھا مگر کسی کو بھی حقیقت معلوم نہ تھی کہ کیا ہوا ہے؟''

☆......☆......☆

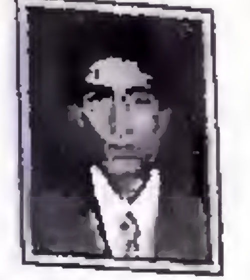
جمال اور شازی خستہ حال مکان میں بیٹھے تھے۔ شازی کے بائیں بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جمال نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گولی شازی کے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔ وہ گولی کو تو نکال نہیں سکتا تھا اور کسی ڈاکٹر کو بلانا بھی خطرناک تھا۔ جمال نے گولی کا زخم بند کرنے کے لیے کپڑے کے چیتھڑے کو جلایا اور اس کی گرم گرم راکھ کو زخم پر رکھ کر رومال سے پٹی باندھ دی۔
اس نے شازی کو سمجھایا کہ وہ آئندہ گھر سے باہر قدم نہ رکھے اور نہ ہی ایسی کوئی واردات کرے گی۔
شازی بڑی پریشان تھی...... اس کی زندگی کا سوال تھا۔ وہ دیر سے خاموش تھی۔ جمال کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ اور آخر اس نے جمال سے وعدہ کر لیا۔ جمال کی کسی بھی بات سے انکار کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ جمال سے اُسے محبت تھی۔
دن گزرتے گئے۔ شازی کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ وہ ایسے دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ طویل مدت سے بیمار ہو۔ جمال حسب معمول ہر رات لوگوں کی نظروں سے چھپ کر شازی سے ملنے خستہ حال مکان میں جایا کرتا تھا۔ شازی کی ابتر حالت دیکھ کر وہ متفکر ہو گیا۔ شازی اگر مر گئی تو......؟ وہ سخت پریشان ہو گیا۔
شازی کی موت کے تصور ہی سے وہ کانپ گیا۔ اب شازی کو زندہ رکھنے کا صرف یہی طریقہ تھا کہ وہ اپنا خون دے کر شازی کو موت کی گرفت سے بچا لے۔ شازی نے انکار کر دیا۔
اسے جمال کا خون پی کر زندہ رہنے کے بجائے مرنا پسند تھا۔ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور پھر شازی نے جمال کی بات مان لی۔
شازی رو رہی تھی...... دونوں بہت دیر تک روتے رہے۔ اور پھر شازی نے اپنے محبوب...... اپنے جمال کی شہ رگ پر بوسہ دیا۔
جمال نیم مردہ حالت میں آدھی رات کے وقت اپنے گھر پہنچا اور وہیں فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کی قربانی دے کر شازی کو بچا لیا تھا۔
دوسری رات شازی انتظار کرتی رہی مگر جمال نہ آیا۔ اب اُس نے کبھی نہیں آنا تھا۔
شازی کو یقین ہو گیا...... وہ انتظار کرتی ہوئی سو گئی۔ اور پھر اٹھ نہ سکی۔

☆......☆......☆

یہ تھی وہ داستان جس کا بحیثیت آفیسر تفتیش کے دوران مجھے علم ہوا۔ میں نے جمال کی خودنوشت ڈائری کو پڑھنے کے بعد فوراً ہی جلا کر تلف کر دیا۔ میرے نزدیک یہی بہتر تھا کہ اس سربستہ راز سے کوئی واقف نہ ہو۔ اس داستان کا آخری صفحہ بڑا ہی اندوہناک تھا۔ جمال مر چکا تھا۔ لیکن شازی کے بارے میں علم نہ تھا۔
میں ایک اندھیری رات اس خستہ حال مکان میں گیا۔ وہاں شازی کا پنجر پڑا ہوا تھا۔ اور کمرے میں لیس دار پانی سے فرش بھیگا ہوا تھا۔ جس سے تعفن اور بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں مزید وہاں نہ ٹھہر سکا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آ گیا۔

☆☆......☆☆

بھوگ ناتھ کی پیاس



معاویہ عنبر وٹو

بھوگ ناتھ نے دونوں کا لہو پی کر پھر سے اپنی پیاس بجھالی تھی اور......

کچھ پتا نہیں چلا کہ اچانک کیا ہوا اور جیپ ہچکیاں لیتے لیتے ٹیلے کی اوٹ میں ٹھہر گئی۔

''دیکھیں شاید پھر گرم ہوگئی۔'' خرم کے ماتھے پر پسینہ آیا اور ہاتھ پاؤں برف ہوگئے۔

''یار یہ ایسی کھٹارا تھی تو پھر اس پر سوار ہو کر اس بیابان میں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟'' منیر کا غصہ عروج پر دکھائی دیا۔

''یہ انسانیت نہیں۔ سیاہ رات، چاند کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا ہاتھ کو ہاتھ بجھائی نہیں دیتا...... اس خوفناک سفر پر آنے کا شوق تھا تو سواری کوئی ڈھونڈ لی جاتی مجھے تو اس جگہ جن بھوتوں کا بسیرا معلوم ہوتا ہے۔ کسے خبر، کل کا سورج دیکھنا ہماری قسمت میں بھی ہے یا نہیں۔''

''منیر......! کیا تم ایسی باتوں سے باز نہیں آ سکتے۔'' خرم نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔

''دیکھو ہم دونوں گہرے دوست ہیں اور اس کے علاوہ ہم پر کچھ فرائض کی ادائیگی بھی لازم ہے۔ اگر وہ مسافر بے چارہ پیاس و بھوک سے چل بسا تو کیا ہمارا ضمیر ہمیں ملامت نہیں کرے گا۔ کیا یہ ہمارے فرائض میں شامل نہیں ہے کہ ایسی اطلاع ملنے پر اس بدقسمت کی جان بچانے کی کوشش کریں۔ ہمیں تنخواہ یہی ڈیوٹی ایمان داری سے سرانجام دینے کی ملتی ہے میرے دوست۔''

''ہونہہ تنخواہ......'' اندھیرے کے باوجود منیر کا لہجہ تصویر بن گیا۔

''جی میرے پیارے دوست ہمیں تنخواہ دی جاتی ہے...... اتنی ہے کہ جسم و جان کا رشتہ بڑی مشکل سے جوڑے ہوئے ہیں اور جسے تم فرض کہتے ہو، کیا تمہاری یہ فرض سے محبت تمہاری جان بچا سکے گی۔''

''یہ جگہ بھوگ ناتھ کا مندر تھا۔ وہ آج سے صدیوں پہلے اسی جگہ بھوکا پیاسا پر گیا تھا اور اب اس کی بے چین روح اپنی پیاسی موت کا انتقام یہاں سے گزرنے والے لوگوں سے لیتی ہے۔ کوئی مسافر اندھیری شب کو یہاں سے زندہ واپس جاتا ہوا کسی نے کبھی نہ دیکھا۔ پیدل ہو تو اس کی ٹانگیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ سواری کے لیے جانور ہو تو اس کی ٹانگیں مردہ...... اگر جیپ یا ٹریکٹر ہو تو ان کا انجن، دوسری سانس ہی نہیں لیتا۔ یوں بھوگ ناتھ کی پیاسی روح اپنے شکار کا لہو پی کر اپنی پیاس بجھاتی ہے۔''

''منیر کیا تم بھی یقین رکھتے ہو، ایسی داستانوں پر جن کا کوئی سر پیر نہ ہو۔''

''سر پیر! اب سلامت رہے تو ہی یقین کریں گے لیکن اس سچ کو جاننے والا کبھی زندہ بچا ہے کوئی۔ کک...... کک...... کوئی تو آخر ہوگا بتاؤ۔'' منیر کے حلق میں الفاظ اٹکنے لگے۔

''کچھ بھی نہیں یار۔'' خرم نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گویا ہوا۔

''دیکھو یار...... ہمارے سامنے ایک مقصد ہے۔ ہم نے اپنے جیسے ایک انسان کی جان بچانی ہے۔ جیسے ان بڑے اونچے اونچے ٹیلوں میں مٹی کی پیاس نگل لینا چاہتی ہے۔ یار تھوڑی دیر کے لیے سوچو۔ ہو سکتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کے انتظار میں ہوں یا پھر اس کے بوڑھے والدین......''

''خرم خدا کے لیے چپ ہو جاؤ، کچھ اور سننے کی ہمت باقی نہیں۔ خرم...... خرم...... تم بے وقوف ہو۔ احمق ہو...... وہ وہ، سامنے دیکھو بھوگ ناتھ، اس کی روح آ رہی ہے۔ صدیوں کی پیاس بجھانے، خرم وہ ہمیں نگل جائے گی۔ وہ ہمارے لہو سے اپنی پیاس بجھائے گی...... بھاگ چلو خرم، پلیز تم بھی بھاگ چلو۔''

منیر کی چیخیں اونچے ٹیلے سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ پوری طرح سے ہر طرف سوائے منیر کی چیخوں کے اور کوئی آواز باقی نہیں رہی۔ گمان ہوتا کہ بھوگ ناتھ کی روح اس کے تعاقب میں ہے۔

خرم نے منیر کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ اور پھر اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی چیخیں تو بند ہو گئیں، مگر خرخراہٹ روکے نہ رُک سکی۔



''میرے مولا کیا کروں؟'' پھر ایک دم کچھ سوچ کر اس نے منیر کو زور زور سے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

''منیر، منیر...... تمہیں یاد ہے نا ہمیں یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ پیاسا مسافر، زندہ یا مردہ...... تمہیں وہ جگہ معلوم ہے، جہاں پر ایک سوکھے پیڑ کے نیچے پڑا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ہے وہ جگہ۔ آیئے پیدل ہی چلتے ہیں۔ ٹارچ ہے ہمارے پاس ڈھونڈ لیں گے بے نایاں یاد آیا تمہارے پاس تو پستول بھی ہے ناں۔'' لیکن منیر کے منہ سے خاموشی کے علاوہ کوئی آواز نہ آئی۔

''اچھا یار رُکو ایک منٹ، میں جیپ کا بونٹ کھول کر دیکھ لوں آخر ایسی کیا خرابی آن پڑی ہے۔'' منیر کو گم صم دیکھ کر خرم نیچے اترنے لگا۔

''نہیں، تمہیں نیچے مت اترنا پلیز۔'' منیر پھر سے چیخ پڑا تھا۔

''اس کی روح یہاں پر کسی اجنبی کے پاؤں نہیں لگنے دیتی۔'' خرم نے سر جھٹکا ٹارچ لے کر نیچے اترا جب کہ منیر بدستور چیختا رہا۔

نیچے اتر کر خرم نے جیپ کا بونٹ کھولا کھٹاک...... کی آواز ایک دھماکے کی طرح چاروں اطراف پھیل گئی۔ خرم نے سر جھکا کر بیٹری کی تاروں کو ابھی ہاتھ ہی لگایا تھا کہ رات کا سناٹا ایک بار پھر پستول کے فائر کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

منیر چیختا ہوا فائر بھی کرتا جا رہا تھا۔ فائر تو چھ ہوئے مگر لگا یوں کہ چھتیس ہوئے۔ اس سے پہلے خرم کچھ سمجھ پاتا منیر پوری رفتار سے سامنے کی سمت دوڑ پڑا تھا۔

خرم نے اس کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ ''منیر پلیز رُک جاؤ، تم راستہ بھول کر کہیں گم ہو جاؤ گے۔ رُک جاؤ۔''

نہیں معلوم منیر میں کہاں سے اتنا تیز دوڑنے کی طاقت آ گئی کہ چند لمحوں بعد اس کی چیخیں بھی معدوم ہو گئیں۔ خرم کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ وہ بالکل اکیلا اس مقام پر کھڑا تھا کہ جہاں لوگ ڈر کے مارے دن کے وقت بھی قدم رکھنے سے گھبراتے تھے مگر اب تو وہاں چاروں طرف اندھیرا تھا۔

خرم منیر کو ڈھونڈتے ہوئے میلوں تک نکل آیا تھا مگر منیر کا کہیں نشان بھی نہیں تھا۔

خرم کو اس بات کا اندزہ ہو رہا تھا کہ اگر تھوڑی دیر اور چلتا رہا تو شاید اس کا بدن ہی بے جان ہو جائے گا۔ اول تو شدید پیاس، پھر شدید تھکن۔ اس کی نگاہیں کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ جہاں کچھ دیر کے لیے آرام اور پیاس بجھانے کے لیے پانی میسر آ سکے۔

وہ زیادہ دور نہیں چلا ہوگا کہ کچھ فاصلے پر اُسے درختوں کے جھنڈ نظر آئے۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہ اونچے نیچے ناہموار راستوں کو طے کرتا ہوا درختوں کے اس جھنڈ کی جانب چل پڑا۔ دل میں بہت سے خدشات بھی تھے۔

ایسی جھاڑیوں میں اڑن سانپ بکثرت پائے جاتے ہیں اور جسم کے کسی بھی کھلے حصے پر کوئی اڑن سانپ حملہ آور ہو سکتا ہے۔

وہ ان خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آخر کار درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچ گیا۔ اور پھر یہ دیکھ کر اُس نے دل میں مسرت کی لہریں بیدار ہونے لگیں کہ درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کھڑی دکھائی دے رہی ہے۔ دور سے یہ عمارت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر پتا چلا عمارت ہندوؤں کی دھرم شالا جیسی تھی۔ اونچے اونچے درختوں کے اس زبردست جھنڈ نے اس عمارت کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ آس پاس عجیب سی خاموشی تھی۔

خرم یہ اندازہ لگانے لگا کہ اس عمارت میں کوئی موجود ہے یا نہیں۔ پھر وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ وہ عمارت کے بیرونی حصے سے گزر کر اصل عمارت تک پہنچا۔ جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ چند لمحات انتظار کرنے کے بعد اس نے زور زور سے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا لیکن اندر سے کوئی آواز نہ سنائی دی۔ ویسے اتنے ویران علاقے میں اس عمارت میں کسی کی موجودگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پتا نہیں دروازہ اندر سے کس نے بند کیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ پرانی بات ہو۔ دروازہ پہلے سے بند ہو۔ اس میں داخلے کا راستہ اس کے دوسرے ٹوٹے ہوئے حصوں میں سے ہو۔

ایک لمحے تک وہ سوچتا رہا اور پھر دروازے کے پاس سے واپس پلٹا، یہ سوچ کر کہ کسی جگہ تھوڑا سا آرام کر لے لیکن ابھی وہ دروازے کے پاس سے ہٹا بھی نہیں تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں ایک ایسی آواز سنائی دی۔ جیسے اندر کوئی چل رہا ہو۔ پھر دائیں جانب سے اونچی کھڑکی کے پٹ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلے، غالباً کسی نے کھڑکی کھول کر یہ دیکھا کہ دروازہ کون بجا رہا ہے، جیسے ہی خرم نے کھڑکی کی آہٹ پر گردن اٹھائی، کھڑکی بند ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا خیال غلط تھا۔ اندر کوئی رہتا ہے اور اُسے دیکھنے کے بعد ممکن ہے اب دروازہ کھولنے آ رہا ہو۔ وہ ایک بار پھر دروازے کے سامنے رُک گیا۔

اس کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ اندر سے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی یہ آواز پیروں میں پہنے ہوئے سلیپروں کے فرش پر گھسٹنے کی تھی پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ اور پھر خرم دو قدم پیچھے ہٹ کر دروازہ کھلنے والے کو دیکھنے لگا۔ آخر کار دروازہ کھلا اور اسے اپنے سامنے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا لیکن اسے دیکھ کر خرم کے بدن میں خوف کی ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایسے یوں لگا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی نے سرد انگلی رکھ دی ہو۔

وہ ایک مردے جیسی شکل کا مالک تھا، شانوں سے لے کر پیروں تک چہرے پر اس طرح جھریاں لٹک رہی تھیں۔ جیسے گوشت اوپر سے چپکا دیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور شخصیت اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ خرم نے اسے بھی دیکھ لیا یہ ایک انتہائی دراز قد قامت عورت تھی، مرد جتنا بد وضع اور بد صورت تھا۔ عورت اتنی ہی حسین اور دلکش تھی۔ سڈول بدن کی مالک یہ عورت سلک کا ایک لبادہ پہنے ہوئے تھی لیکن اس کا چہرہ اس قدر سفید تھا کہ اتنے سفید چہرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک لمحے میں خرم نے محسوس کیا اس خوبصورت بدن پر جیسے سنگ مرمر کا سفید چہرہ چپکا دیا گیا ہو۔ عورت کے ہونٹ اتنے سرخ تھے کہ لگتا تھا کہ ابھی ان سے خون ٹپک پڑے گا۔

اچانک ہی عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے روشنی خارج ہو رہی ہو۔ خرم کی آنکھیں جھک گئیں پھر اس نے کہا۔

''کیا آج کی شب آپ مجھے پناہ دے سکتے ہیں؟''

عورت نے اپنا سفید ہاتھ سامنے کھڑے ہوئے مرد کے شانے پر رکھا اور شاید کوئی اشارہ کیا پھر مرد کی آواز ابھری۔

''آ جاؤ اندر۔'' یہ آواز بھی ایسی تھی کہ دو ہڈیاں آپس میں ٹکرائی ہوں اور ان سے ایک کھنک سی پیدا ہوئی ہو۔

خرم ان کے اشارے پر دروازے کی دہلیز پار کر کے اندر آ گیا لیکن وہ بے پناہ محتاط تھا۔ اندر داخل ہو کر مرد ایک طرف مڑ گیا اور عورت نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ......''

خرم اس کے پیچھے چل پڑا دوسرے ہی لمحے اس نے ایک انوکھی بات محسوس کی، عورت آگے بڑھ کر ایک زینے کے قریب پہنچی تھی اور سیڑھیاں طے کر رہی تھیں لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں اٹھ ہی نہ رہے ہوں۔ ذرا برابر بھی کوئی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی جبکہ خرم کے اپنے قدموں کی آہٹ اچھی خاصی تھی۔ بہر حال زینہ طے کر کے وہ پہلی منزل پر پہنچ گیا اور اس کے بعد اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اُسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

خرم نے ایک نگاہ میں دیکھ لیا کہ کمرے میں ایک مسہری بچھی ہوئی ہے لیکن غیر معمولی قسم کی...... وہ فرش سے بہت اونچی تھی اور اتنی بڑی تھی کہ اس پر چار پانچ آدمی بیک وقت سو سکتے تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو عورت اس کے پیچھے رُک گئی۔ اس کے لبوں پر ایک پر اسرار مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے گردن خم کی اور ایک دم واپسی کے لیے مڑ گئی۔

خرم کے منہ سے ایک ہلکی سی آواز نکلی تھی لیکن عورت نے پھرتی کے ساتھ دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

خرم دوڑ کر دروازے کی جانب پلٹا اور اس نے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ دیے۔ وہ بڑی خوفناک کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ شدید تھکن سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ کپڑے دھول سے اٹ گئے تھے۔ کچھ

لمحے تک وہ دروازے کے قریب کھڑا رہا پھر مسہری کی جانب بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے جوتے اتارے اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

تھکن زیادہ غالب ہوئی تو وہ بستر پر لیٹ گیا پھر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہاں غسل کرنے کا کوئی بندوبست ہوتا۔ اس نے کمرے میں چاروں اطراف نظریں دوڑائیں، ایک طرف ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا۔ جس میں کواڑ نہیں تھے۔ اینٹیں بے رنگ و روغن تھیں اور ان پر سے جگہ جگہ سے پلستر اکھڑ گیا تھا۔ کافی بلندی پر ایک چھوٹا سا روشندان بنا ہوا تھا۔ جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔

''ذرا دیکھوں تو سہی یہ دروازہ کیسا ہے۔'' وہ اٹھ کر دروازے کی جانب چل پڑا۔ دروازے پر اندھیرا تھا۔ پتا نہیں اندر کیا ہے اسی اندھیرے میں آگے بڑھ کر وہ چند قدم آگے بڑھا تو دفعتاً اس کے ہاتھ کسی اور دروازے سے ٹکرائے اس نے اس پر دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا اور پھر وہ ایک دم خوش ہو گیا کیوں کہ دوسری جانب غسل خانہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن انتہائی غلیظ، نا معلوم کتنے عرصے سے اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا اور پھر اس نے ایک طرف لگی ہوئی ٹنکی کی ٹونٹی کھولی، نہایت مدھم سی روشنی میں اس نے دیکھا کہ پانی کی پتلی دھار نکل کر غسل خانے کے فرش پر گرنے لگی ہے مگر یہ پانی گندا اور سیاہ رنگ کا تھا۔ جس سے زنگ کی بدبو آ رہی تھی۔ پانی کی ٹنکی اور لوہے کے پائپ میں خرخر کی آوازیں نکلنے لگیں اور اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ لوہے کی یہ ٹنکی طویل عرصے سے استعمال نہیں کی گئی۔ غلیظ پانی سے تو نہانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن پھر اس نے سوچا کہ کم از کم ہاتھ تو صاف کیے جا سکتے ہیں۔ جن پر گرد کی تہیں جمی ہوئی ہیں۔

وہ آگے بڑھا اور اس نے اپنے دونوں پاؤں سامنے کر دیے۔ پانی کی پتلی دھار اس کے پیروں پر گرنے لگی مگر دفعتاً اس کا سانس رُک گیا۔ خدا کی پناہ! یہ کیا چیز ہے جو اس کے پیروں پر گر رہی ہے۔ اس نے غور سے اپنے پیروں کو دیکھا اور پھر اس کے منہ سے نکلی سی چیخ نکلی اور وہ اچھل کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پاؤں ایک دم پھسلا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو بیلنس نہیں کر سکا تھا۔ کمر کے بل نیچے گرا لیکن پھر فوراً تڑپ کر اٹھ گیا اور اس کے بعد وہاں سے دوڑتا ہوا باہر آ گیا۔

اس کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک دم یہ احساس ہوا کہ وہ خون پرانا نہیں ہے کیوں کہ پیروں پر گرنے کے بعد اس کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا اور اس کے تجربے نے اسے ایک لمحے میں بتا دیا کہ یہ انسانی خون ہے۔ ایک ویران سنسان مکان میں اس قسم کے خوفناک اور اتنے بھیانک اور دہشت ناک مناظر...... اس کی ذہنی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں اور سوچ رہا تھا کہ اعصاب کو قابو میں رکھنا اس وقت کتنا مشکل ہو رہا ہے۔ بہر حال اپنی انتہائی قوت ارادی سے کام لے کر وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کس طرح اپنے پیروں سے خون صاف کرے۔ کچھ دھبے لباس پر بھی نظر آئے تھے۔ وہ مسہری پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے مسہری کے اوپر بچھے ہوئے بستر سے چادر کھینچ لی اور زمین پر بیٹھ کر اپنے پیروں سے خون رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔

عجیب خون تھا۔ ذرا سی دیر میں پیروں پر جم کر سخت ہو گیا تھا اور پیروں سے اس کی پپڑیاں اکھڑنے لگی تھیں، کوششیں کر کے اس نے کافی حد تک پاؤں صاف کر لیے تھے۔ لیکن پھر بھی بہت سے دھبے باقی تھے۔ دل بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ اس طرح تو وہ قیدی بن کر رہ گیا تھا جبکہ اُسے ابھی مسافر اور اپنے دوست کی تلاش کرنی تھی۔

ابھی وہ دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اُسے باہر سے آہٹیں سنائی دیں، کوئی دروازے کے پاس آیا تھا۔ پھر اس طرح کئی آوازیں ابھریں جیسے دروازے کو باہر سے کھولا جا رہا ہو۔ اس کا سارا خون سمٹ کر کنپٹیوں میں آ گیا تھا۔ اسے اپنے آئندہ لائحہ عمل کا فیصلہ کرنا تھا۔

خرم کو پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ وہ کسی بڑی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ یہ عمارت اس کے لیے موت کا جال بھی بن سکتی ہے۔

دروازہ تھوڑا سا کھلا اور خرم تیار ہو گیا کہ جو کوئی بھی اندر داخل ہو، اس پر حملہ کر دیا جائے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے آنے والا اس کی نیت سے واقف ہو گیا ہو۔ دروازہ کتنا کھلا تھا۔ فوراً ہی بند ہو گیا اور بعد میں شاید اُسے باہر سے دوبارہ لاک کر دیا گیا۔

خرم کی نگاہیں پھر اِدھر سے اُدھر کا جائزہ لینے لگیں، فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دفعتاً اسے وہ روشن دان نظر آیا۔ جو چھت کے قریب تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

روشن دان میں سلاخیں نہیں تھیں۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچا جائے تو اس بات کے امکانات ہیں کہ اس سے باہر نکلا جا سکتا ہے۔ پھر اس کی نگاہ بستر کی چادر کی جانب اٹھی۔ صرف یہی ایک ترکیب تھی۔

اس نے چادر اٹھائی اور اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے کے بعد اس کے آٹھ آٹھ انچ کے چوڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ پھر ان ٹکڑوں کو اس میں جوڑ کر اس نے گرہیں لگائیں، وہ انہیں رسی کی شکل دے رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس سے روشن دان تک پہنچا جا سکے کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی تو ایک بار پھر وہ غسل خانے کے پاس پہنچا غسل خانے میں قدیم طرز کی ٹونٹی لگی ہوئی تھی۔ جس میں ایک لمبا سا پائپ پھنسا ہوا تھا، اگر کسی طرح یہ پائپ مل جائے تو یہ ٹونٹی آنکڑے کا کام دے سکتی ہے۔ ویسے اُس نے بہت سی مہمات سر کی تھیں۔ نل کو چھوتے ہوئے ایک دم سے اسے احساس ہوا کہ اس پائپ میں خون بھرا ہوا ہے۔ اور یہ خون اس ٹونٹی کے ذریعے نیچے آیا ہوا تھا لیکن اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسی کو استعمال کیا جائے، چنانچہ اس نے پائپ پر زور آزمائی کی، اسے اوپر کی جانب موڑا اور اس کے بعد نیچے کی جانب چار چھ بار موڑا، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سی آنکھیں اس کا جائزہ لے رہی ہوں اور سرگوشیاں کر رہی ہوں۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں سی محسوس ہو رہی تھیں وہ ہر آواز سے بے نیاز ہو کر اپنی منزل طے کر رہا تھا اور آخر کار اس کے ہاتھ روشن دان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

روشن دان کے قریب پہنچ کر اس نے جائزہ لیا کہ اس کا بدن اس سے باہر نکل سکتا ہے یا نہیں اور یہ دیکھ کر

ایک بار پھر خوشی کا احساس ہوا کہ روشندان کی چوڑائی اتنی تھی کہ وہ اس سے باہر نکل سکتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز جو اسے نظر آئی، وہ ذرا سمت بندھانے والی تھی۔ روشن دان کے عین سامنے کوئی دو تین فٹ فاصلے پر ایک درخت کی شاخ گزرتی نظر آ رہی تھی۔ اگر روشن دان سے باہر نکل کر وہ اس شاخ کو پکڑ لے تو درخت کے ذریعے نیچے اترا جا سکتا ہے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھا کہ دروازے پر پھر آہٹ ہوئی اور اس بار دروازہ کھل گیا تھا۔

خرم نے پیچھے دیکھا اور دوسرے لمحے اسے ایک خوفناک چیخ سنائی دی۔ خرم بری طرح لرز کر رہ گیا۔ ابھی تک اس کے پاؤں چادر کی ایک گرہ پر پھنسے ہوئے تھے اور وہ اسی پر وزن ڈالے اپنے جسم کو سنبھالے ہوئے تھا لیکن اس نے ان دونوں شیطانوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا اور اس کے بعد وہ روشن دان کے نیچے پہنچ کر چادر کو زور زور سے پکڑ کر ہلانے لگے۔ خونخوار مرد اور عورت چادر کی رسی کو زور زور سے جھٹکے دے رہے تھے، تاکہ رسی اس کے پیروں سے نکل جائے اور وہ نیچے گرے لیکن خرم بھی اس وقت زندگی اور موت کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ جونہی اس کے ہاتھ روشن دان کے کنارے پر ٹکے اس نے پوری قوت سے روشن دان میں لٹکنے کی کوشش کی اور اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے روشن دان کے اوپری حصے پر جم گئے۔

پھر وہ اپنے بدن کو اوپر اٹھائے بڑی مشکل سے نجانے کتنی دقتوں کے بعد اپنے بدن کو آدھا روشن دان سے نکالا اور اس شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی جس کے صحیح فاصلے کا اُسے اندازہ نہیں تھا لیکن خوش نصیبی ساتھ دے رہی تھی کہ شاخ اس کے ہاتھ میں آ گئی اور دوسرے لمحے وہ اس شاخ کو پکڑے روشن دان کے حصے سے باہر آ گیا۔ درخت کی یہ شاخ دور چلی گئی تھی۔ خرم بندر کی طرح اچھل کر آگے بڑھنے لگا، شاخ زیادہ مضبوط نہیں تھی، کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتی تھی لیکن خرم اس وقت اپنی تمام تر مہارت کو استعمال کر رہا تھا اور وہ بھی ان شاخوں کے ذریعے اس احاطے کی دیوار کو پار کر گیا تھا۔ وہ بندروں کی سی پھرتی کے ساتھ دوسری شاخ پر پہنچا اور اس کے بعد اسی رفتار سے آگے بڑھتا ہوا عمارت کی دیوار کو عبور کر کے نیچے کود گیا۔

اسے اپنے پیچھے ہولناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ بلکہ اسے لگ رہا تھا جیسے چاروں اطراف سے نادیدہ روحیں اسے پکڑنے کے لیے دوڑ رہی ہوں۔

اگر وہ فولادی اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو نجانے کیا ہوتا۔ نیچے قدم پہنچتے ہی اس نے تیزی سے دوڑ لگا دی اور یہ جانے بغیر کہ اس کا رُخ کس جانب ہے۔ اب بھی کہیں اندھیرا تھا کہیں اجالا......

اتنے میں خرم کو ایک انسانی جسم اندھیرے میں پڑا دکھائی دیا۔ مٹی مٹی وجود آدھا مٹی میں دھنس چکا تھا۔ شاید کچھ دیر یہاں کوئی مٹی کا ٹیلہ بن چکا ہوتا۔

خرم نے مٹی جھاڑ کر اُسے مٹی سے باہر کھینچا، سیدھا کیا......

مگر وہ منیر نہیں کوئی اور مسافر تھا۔ پیاس نے اس کے سارے جسم کا خون خشک اور ہونٹ لکڑی کر دیے تھے مگر اس کے باوجود اس کی نبض چل رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بولا۔

''دوست...... میں اپنی منزل تک تو پہنچ گیا ہوں مگر اپنا آپ گم کر بیٹھا ہوں۔'' اسے اٹھاتے ہوئے چند قدم طے کیے تھے۔ ایک اور جسم پڑا نظر آیا۔

اس کا دل اتنے زور سے دھڑک اٹھا کہ جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ پھر تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔

یہ لاش تھی...... منیر کی یوں لگتا تھا جیسے کسی دیو نے اس کا خون پی لیا ہو۔

خرم کی آنکھوں سے آنسو بہتے منیر کے ہونٹوں پر آن گرے۔ بولا۔

''دوست! زندگی تو مقصد کا نام ہے۔ جستجو کا نام ہے......اور اگر یہ بھی نہ ہو تو ہم کیا ہیں؟؟

یہی ناں مٹی کے بے جان مجسمے !!!۔ اور پھر وہ دونوں مجسموں کو گاڑی میں ڈال رہا تھا۔ بھوگ ناتھ نے دونوں کو خون پی کر کر وف مٹی کے مجسموں میں تبدیل کر کے پھر سے اپنی پیاس بجھائی تھی۔

☆☆......☆☆



عقابی حویلی

لیلیٰ مروہ اقبال

اُس روح کی کتھا، جسے اپنے انتقام کے لیے ایک نیک جسم کی تلاش تھی

میں یکی سے یکی آبادی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ درمیانی قصبہ میں موجود عقابی حویلی پر میری نظر پڑی۔ اس حویلی کی چھت کے بالائی حصے میں ایک بڑے سے عقاب کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ اب اس حویلی میں کوئی



نہیں رہتا تھا۔ اس میں صرف اور صرف وحشت اور ہیبت کا راج تھا۔ اس ہیبت ناک حویلی کو دیکھ کر مجھے وحشت کا احساس ہونے لگا۔

تقریباً سات سال پہلے کی بات ہے۔ میں عقابی حویلی کے پیچھے والے قصبے میں رہا کرتا تھا۔ میں روزانہ مسجد آتے جاتے اس حویلی کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ حویلی مسجد کی راہ میں تھی۔ ایک بچی اس حویلی کے بڑے سے باغ میں کھیل رہی ہوتی تھی۔ اس باغ کے اردگرد آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ اس لیے سب منظر واضح دکھتا تھا۔ اس خوبصورت باغ کے مرکز میں ایک شفاف پانی کا حوض تھا۔ وہ بچی اس حوض میں پلاسٹک کی بطخ کو کبھی نہلاتی اور کبھی اسے تیراکی سکھاتی۔ لیکن جب میں وہاں سے گزرتا تو وہ بچی اپنے کھلونوں کو بھول کر مجھے گھورنے لگ جاتی۔ اس بچی کے ساتھ کوئی اور بچہ موجود نہ ہوتا تھا۔ وہ تنہا کھیلا کرتی تھی۔ اس بچی کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اور اس کے سنہری خوبصورت بال اس کی کشش کو مزید بڑھاتے تھے۔ یقیناً وہ بچی چھ یا سات سال کی ہوگی۔ جب وہ مجھے گھورتی تو یوں لگتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔

ایک دن میں عصر کی نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا کہ اس بچی نے سلاخوں کے درمیانی وقفہ سے میری آستین کو کھینچا۔ اور کہنے لگی۔

''کیسے ہیں آپ؟ کیا آپ میرے ساتھ کھیلیں گے؟ میں اکیلے بور ہو جاتی ہوں نا تو آپ میرے دوست بنیں گے؟'' میں اس کی معصومیت پر مسکرایا اور جواباً کہا۔

''بیٹا پہلے آپ اپنا نام تو بتاؤ! پھر دوست بھی بن جائیں گے۔''

''میرا نام پری ہے اور آپ کا؟'' اس نے Hand Shake کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر آہنی سلاخوں کے ریک وقفوں کی وجہ سے میں اس سے ہاتھ نہ ملا سکا۔ تو اس نے گیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''آپ اندر آ جائیں نا۔'' چوکیدار جس سے میری ہلکی پھلکی واقفیت تھی۔ وہ سارا منظر دیکھ چکا تھا۔ سو اس نے سلاخوں والا گیٹ کھول دیا۔ اور میں نے اندر آ کر پری سے ہاتھ ملایا۔

''آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔'' پری کا تجسس واضح تھا۔

''میرا نام احد ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''You Are a cute doll'' پھر وہ مجھے حوض کی طرف لے گئی۔ جہاں اس کے ڈھیر سارے کھلونے تھے۔ ''آپ بھی کھیلو۔'' میں مسکرایا اور نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سے پری کے ابا سکندر آ رہے تھے۔ وہ مجھ سے ایک دو بار مل چکے تھے۔

''احد بیٹا کیسے ہو؟'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''الحمدللہ! آپ کیسے ہیں؟'' میں نے اس بارعب شخص سے ذرا ہچکچا کر پوچھا۔

''بیٹا میں ٹھیک ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تم اس وقت میری بچی پری کے ساتھ کھیلنے آ جایا کرو۔ پری کی اسکول کی کوئی خاص دوست نہیں ہے، اور نہ ہی ہمسایوں میں کسی سے اس کی دوستی ہے۔ تم اگر گھڑی دو گھڑی آ جایا کرو تو میری بچی خوش ہو جائے گی۔ ورنہ اُسے جو انسان پسند آ جائے اس کی غیر موجودگی میں رونے لگ جاتی ہے۔ خاص کر اپنی ماں کی غیر موجودگی تو بالکل سہہ نہیں پاتی اور روتی رہتی ہے۔'' اب وہ بارعب نہیں بلکہ مجبور لگ رہا تھا۔ سکندر صاحب نے التجائیہ انداز میں کہا تو بہر کیف میں نے ہامی بھر لی۔ اور تقریباً روزانہ ہی عصر یا مغرب کے بعد پری کا دل بہلانے جانے لگا۔ بچی حد سے زیادہ مجھ سے قریب اور فرینک ہو گئی تھی اور میرے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔ جس دن میں نہیں جاتا تھا۔ اس سے اگلے روز وہ مجھ سے ناراض ہو جاتی سو مجھے منانا پڑتا۔

☆......☆......☆

جب سے پری اور میری دوستی میں اضافہ ہوا تھا۔ تب ہی سے عجیب و غریب خوابوں کا سلسلہ مجھ سے جڑ گیا تھا۔ کچھ ڈراؤنے اور خوفناک خواب میرا تعاقب کر رہے تھے۔ مگر میں نے خاص پروانہ کی۔ اور دوستی جاری رکھی۔ میں اپنی ننھی سی بہن پری سے بہت

وہ بھیڑیوں میں پلا بڑھا

1953ء میں کچھ شکاریوں کو لکھنو (بھارت) کے قریب ایک جنگل میں بھیڑیوں کے بھٹ سے ایک لڑکا ملا جس کی پرورش بھیڑیوں نے کی تھی۔ وہ ہر حرکت بھیڑیوں کی طرح کرتا تھا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن بھیڑیوں کی طرح آوازیں نکالتا تھا۔ اس کا نام ''رامو'' رکھا گیا۔ وہ جانوروں کی طرح کچا گوشت کھاتا اور چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتا تھا۔ شہری زندگی اسے راس نہ آئی اور وہ انسانوں سے زیادہ مانوس نہ ہو سکا۔ بیمار رہنے کی وجہ سے اسے لکھنو میڈیکل کالج میں داخل کر دیا گیا۔ لیکن چودہ پندرہ سال میں بھی اس پر بھیڑیے کا اثر رہا۔ آخر اپریل 1968ء کو وہ انتقال کر گیا۔ اس کی موت کا اعلان آل انڈیا ریڈیو سے کیا گیا۔ انتقال کے وقت اس کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔

حسن انتخاب: سلطانہ شوکت۔ جھارکھنڈ۔ رانچی (بھارت)

قریب ہو چکا تھا۔

تین چار دنوں سے عصر، مغرب، عشاء غرض کہ کسی بھی نماز کے بعد میں عقابی حویلی کے پاس سے گزرتا تو مجھے پری دکھائی نہ دیتی۔ مجھے لگا پری شاید والدین کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔ سو میں نے زیادہ نہ سوچا۔ لیکن ایک ہفتہ ایسے ہی گزر گیا تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ اور عقابی حویلی میں داخل ہوا۔ اور عمارت کے اندرونی دروازے کو عبور کر کے اندر پہنچا۔ عجیب سی بدبو میرے ناک میں داخل ہوئی، ایک ناخوشگوار احساس میرے اندر سرایت کر گیا۔ عجیب سی بات تھی کہ دونوں داخلی دروازوں پر بھی کوئی موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ لاک تھے۔ ورنہ چوکیدار تو ضرور موجود ہوتا مگر ایک ہفتہ سے وہ بھی غائب تھا۔ گھر میں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سو ایک بند دروازے نے میری توجہ کھینچی۔ میں نے اسی دروازے پر دستک دی۔ میں خاصی کشمکش میں تھا۔ دروازہ نہ کھلنے پر میں نے غصے سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔

سکندر صاحب نے دروازہ کھولا۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''پری کہاں ہے؟'' انہوں نے پورا دروازہ کھول دیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ پری بے سدھ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وقفے وقفے سے تڑپتی اور جھٹکے سے کانپ اٹھتی۔ پری کی والدہ اس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ میں ہونق ہو گیا اور حیرت کی مورت بنا کھڑا رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ننھا سا پھول ہے جو ہنستا مسکراتا کھیلا کرتا تھا۔ درد اور کرب کی شدت سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ آخر کار میں نے ہی سکوت توڑا۔

''یہ سب کیا ہوا ہے اِسے؟ اس کی اس حالت کا اصل ذمہ دار کون ہے؟'' مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ ماں تو خود بے حال تھی۔ مجھے کیا بتاتی وہ تو شاید خود بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر اس کے باپ سکندر کی خاموشی میں بہت سے اسرار چھپے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

میں واپسی کے لیے مڑا اور تمام رستے پری کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ننھی سی کومل سی میری پیاری سی بہن، ایسی حالت میں...... میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں کبھی رویا نہیں تھا مگر اس کی اضطرابی حالت نے مجھے رُلا دیا۔ میں سارا دن ساری رات پری کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر مجھے عجیب و غریب سے خوفناک خواب آنے لگے۔ جب میں نے تمام خوابوں کو ملا کر سوچا تو کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی، مجھے کچھ کچھ بات سمجھ میں آنے لگی اور اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد عقابی حویلی جانے کا ارادہ دل میں باندھ لیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد میں عقابی حویلی پہنچا کمرے کے دروازے کے پاس گیا تو وہ Lock نہیں تھا میں نے دروازہ کھولا بہت سی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں نے پورا دروازہ کھولا تو اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کمرے کے اندر بہت سے ڈھونگی بابا اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے اور اگربتی کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی جبکہ پری کے والدین بھی وہیں موجود تھے۔ ان ڈھونگی باباؤں میں سے کچھ نے ہرے اور کچھ نے پیلے چغے پہن رکھے تھے۔ وہ سب کچھ الا بلا قسم کے الٹے سیدھے منتروں کا جاپ کر رہے تھے۔ جو میری سمجھ سے بالا تھا۔ ان کے سامنے کچھ بڑے بڑے سے تھال موجود تھے۔ جن میں مہندی، تیل، سرخ اور پیلے رنگ کے پھول پڑے ہوئے تھے۔

''جاہل لوگو! یہ بکواس بند کرو۔'' میں نے چیخ کر ان کو مخاطب کیا''میری چھوٹی بہن اس قدر تکلیف میں ہے اور تم لوگ یہ سب مذاق سمجھ رہے ہو؟''

میں منہ میں اللہ کا کلام پڑھنے لگا۔ انہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ ان سب نے آنکھیں کھولیں اور اسی وقت پڑھائی چھوڑ کر مجھ سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے آستینیں اوپر کو چڑھالیں۔

''ارے! تُو کون ہے؟ جو ہمیں بتا رہا ہے کہ بکواس کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟؟ بڑا آیا ہمارے خاص اور پاک علم کو بکواس کہنے والا تو کیا بڑا عالم فاضل ہے؟ وہ ہاتھا پائی پر اتر آئے۔

''مگر'' میں اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ......

''ارے پاگل دکھتا نہیں بچی پر سایہ آیا ہوا ہے۔ جسے ہم لوگ نکال رہے ہیں اور تُو نے ہمارے کام میں خلل پیدا کیا ہے۔ جس کی تو سزا نہیں جانتا۔''

میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی سکندر سے مخاطب ہوا۔

''ارے سکندر صاحب! آپ اس لڑکے کو نکال کیوں نہیں رہے؟ یہ ہمارے کام میں رکاوٹ بن رہا ہے اور ہماری یکسوئی میں خلل پیدا کر رہا ہے۔ اسے باہر نکالیں۔''

انہوں نے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا مگر میں نے پروا نہ کی اور ان بے ہودہ لوگوں کے سامنے پڑے تینوں تھال پکڑے اور ہوا میں اچھال دیے۔ تھال میں موجود اشیاء گر پڑیں اور تھال دو آدمیوں کے سر پر گرے جو ان کے چیلوں کے تھے۔ ہڑبڑاہٹ میں سب آدمی اٹھ کر باہر بھاگنے لگے اور میں نے تمام اگربتیاں اکھیڑ کر باہر نکال پھینکیں کہ اچانک میری نظر پری پر پڑی جس پر نور ہی نور تھا جو پہلے کبھی نہیں تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو ایک نور پری کی ذات سے الگ ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ نور پھر پری میں داخل ہو گیا۔

پری کے والدین حیرت سے بت بنے یہ سب دیکھ رہے تھے اور کچھ بولنے سے بھی قاصر رہ گئے تھے مگر ان کو وہ نور نہیں دکھ رہا تھا۔

پری نے پوری آنکھیں کھولیں تو اس کی سیاہی مائل آنکھوں کی رنگت نیلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پری کچھ بولنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

''بولو بیٹا! کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''کیا تم جانتے ہو کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔'' پری کی آواز یکدم بدل گئی تھی۔

''نہیں، مجھے بتاؤ شاید میں کچھ کر سکوں۔ وہ کوئی اور نہیں انجانی روح تھی۔ جس کا نوری وجود پری میں حلول کر گیا تھا۔ جو اپنی کہانی سنانے کو بے تاب تھی۔ اس کی دھیمی آواز خاموش ماحول میں گونجنے لگی۔

''آج سے دس سال پہلے کی بات ہے جب میں سات سال کی تھی۔ تب میری زندگی بہت رنگین اور خوبصورت تھی۔ میں بچپن کی رنگینی اور خوبصورتی میں جی رہی تھی کہ دسمبر کی ایک سرد رات میرے والد کی لاش گھر آئی جو کہ کسی کار ایکسیڈنٹ کا نتیجہ تھی۔ خون میں لت پت لاش دیکھ کر میں اور میری ماں اپنے حواس کھو بیٹھے۔ آنکھیں روتی رہیں اور دل ماتم کرتا رہا۔ مگر کوئی ایسا نہ تھا جو ہمیں تسلی دیتا۔ اسی صدمے کی وجہ سے میری ماں بھی ایسی بیمار ہوئی کہ وہ بھی ملک عدم سدھار گئیں۔ میری اکیلی ذات پر ہر ایک کی نظر

تھی کیوں کہ میں اس تین کنال پر مشتمل عقابی حویلی کی واحد وارث تھی۔ میری ذات سب کے لیے ایک طرف تو خوبصورت پھول تھی تو دوسری طرف ایک ایسا کانٹا جو راہ کی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔

سب اس کانٹے کو جڑ سمیت اکھاڑ دینا چاہتے تھے۔ ہوا بھی یہی۔ میرے سگے چچا سکندر جو یہیں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے اپنانے کی التجاء ایسے خوبصورت انداز سے بیان کی کہ مجھے لگا میرے والد ہی مجھ سے مخاطب ہیں مگر وہ خوش اخلاقی صرف اور صرف بناوٹ کا ایک خول ثابت ہوئی۔ وہ اپنا گھر بیچ کر یہیں اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگے۔ بناوٹی خول اترنے میں چند دن بھی نہ لگے۔

اور انہیں میرا وجود زہر لگنے لگا۔ اس زہر کو ختم کر کے وہ جلد از جلد سکھ کا سانس لینا چاہتے تھے۔ عقابی حویلی کا عقبی باغ جو کھنڈر کا نمونہ پیش کرتا تھا وہاں اکثر چچا سکندر جایا کرتے تھے لیکن مجھ پر وہاں جانے کے لیے پابندی لگا دی گئی تھی۔ چچا سکندر اکثر وہاں کدال اور بڑا بیلچہ لے جایا کرتے تھے۔

پھر ایک یخ بستہ رات میں عقبی باغ میں جانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میرے سر پر کسی نے کوئی وزنی چیز بہت زور سے دے ماری۔ میں وہیں ڈھے گئی۔ میرا سر پھٹ چکا تھا۔

جس میں سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ میں درد سے کراہ رہی تھی۔ اور کوئی مجھے گھسیٹ رہا تھا۔ میرے وجود کو گھسیٹ گھسیٹ۔ عقبی باغ کے کونے میں لے جایا گیا۔ پھر ایک آواز میرے کانوں میں پڑی جیسے کوئی مٹی کھرچ رہا ہو۔

میں نے بمشکل آنکھ کھول کر دیکھا۔ گھپ اندھیرے میں چہرہ واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس مکروہ چہرے کو تو میں کسی بھی اندھیرے میں پہچان سکتی تھی۔ وہ 'چچا' تھے۔ 'چچا سکندر' اور گڑھا جو کہ تیار تھا۔ اس میں سے مٹی کھود رہے تھے۔ وحشت ان کے چہرے پر نمایاں تھی۔ پھر میرے وجود کو اس قبر میں اتار دیا گیا اور میری سانسیں چل رہی تھیں۔ میرے سر پر مزید کچھ مارا گیا۔ اور میری چلتی سانسوں کی پروا نہ کی گئی۔

اور مجھ پر مٹی کا انبار لگا دیا گیا۔ تب میں کئی گھنٹے موت کی منتظر رہی۔ میرے آنسو، میرا درد میری سسکیاں ان لمحوں میں اس مٹی میں دفن ہوتے رہے۔ اور پھر تڑپ تڑپ کر میری جان نکل گئی۔ وہ درد، وہ کرب کیا میں بھول سکتی ہوں۔ جو کہ اس وقت اس آدمی نے مجھے دیا تھا۔ تب سے آج تک میری روح انتقام کے لیے بھٹک رہی ہے۔ اس لیے آج میں اس کی بیٹی پر قابض ہو کر اس آدمی سے اپنا انتقام لے رہی ہوں۔

چند لمحے سکوت طاری رہا۔ بس آنسو بہہ کر اپنی داستان سنا رہے تھے۔ جو سب کی آنکھوں میں نمایاں تھے۔

''مگر اس میں پری کا تو کوئی قصور نہیں، تم اسے آزاد کر دو۔'' اَحد کی آواز میں کرب نمایاں تھا۔

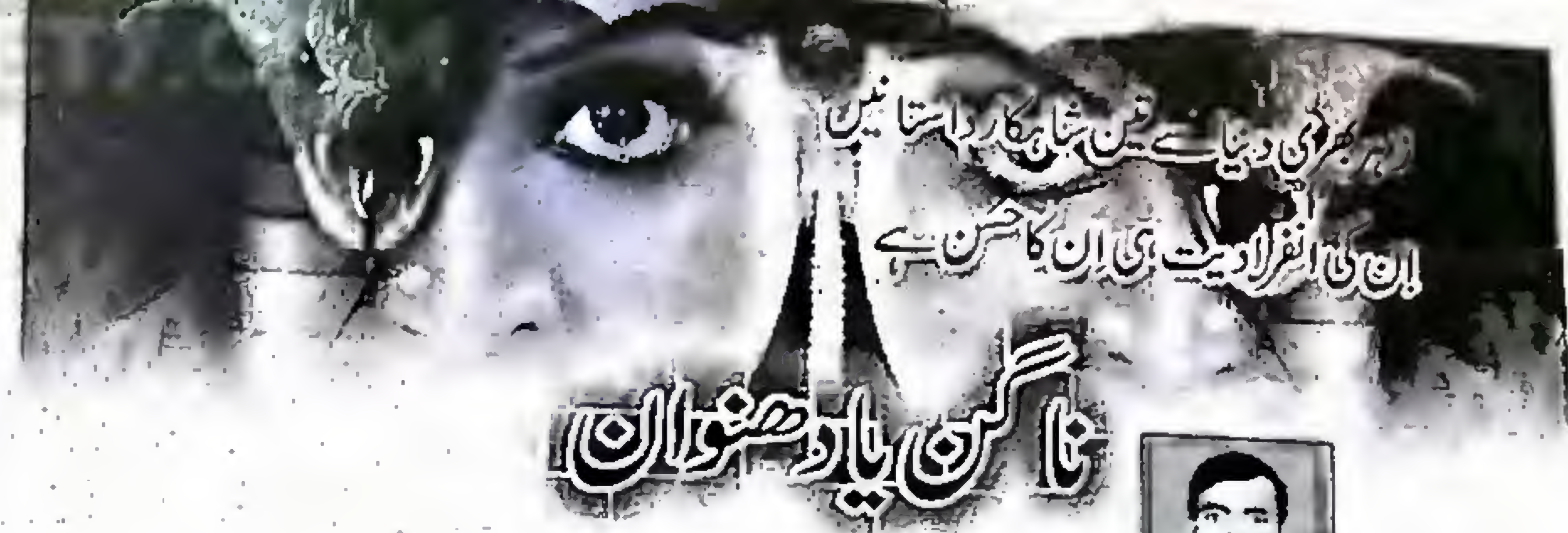
ایک نور سا پری سے جدا ہوتا ہوا محسوس ہوا اور مظلوم نوری روح کا ہیولہ یکدم ہی پری کے وجود سے الگ ہو چکا تھا۔ پری کا وجود جو کہ شدید تکلیف میں تھا، پُرسکون ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ پری اب پُرسکون تھی اور نارمل حالت میں آ چکی تھی اور اس کی آنکھوں کی سیاہ رنگت لوٹ آئی تھی۔

اَحد پلٹا تو پیچھے کھڑے سکندر کی آنکھوں میں پشیمانی واضح تھی، مگر اب اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

محض چند لمحوں بعد مظلوم روح کے ہیولے کی انجانی طاقت کے زیر اثر میں نے ٹرانس کی حالت میں اپنی شہادت کی انگلی ہوا میں لہرائی اور سکندر کی شہ رگ کے قریب کر کے انگلی کو ذرا سی اوپر کی جانب جنبش دی اور سکندر کی گردن اوپر کی طرف اکڑ کر رہ گئی۔

اس کی گردن اور اس کا پورا وجود ہلنے جلنے سے قاصر تھا۔ اچانک دیکھنے سے یوں لگتا جیسے اس کی گردن میں ہوا معلق ہو۔ چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ سب میں نے خود نہیں کیا تھا بلکہ یہ سب میں نے اس نوری روح کی عجیب سی قوت کے زیر اثر کیا تھا۔ جس کا نوری ہیولہ اب مطمئن اور مسکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید کہ اس نیک نوری کو اپنے انتقام کی تکمیل کے لیے کسی نیک انسان کی تلاش تھی۔

☆☆......☆☆



ناگن یا دھنوان



شاہد سلیم

آخر وہ حسینہ تھی کون، جو میرے لیے سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات کا صندوق دے گئی، ایک ناگن کی آدم سے محبت کی یادگار کتھا

انگریز نے پورے ہندوستان میں ریلوے کا جال بچھایا خصوصاً سی پی، یوپی کے علاقوں میں چھوٹی بڑی ریلوے لائنوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ پنجاب سے دہلی کی طرف مین لائن ہے اور پنجاب سے یوپی کو ایک ریلوے لائن (ٹریک) گزارا گیا ہے۔ جو بنگال تک چلا گیا ہے۔ اسی لائن پر نگینہ دھام پور کا اسٹیشن واقع ہے۔ یہ زرخیز اور جنگلاتی علاقہ ہے۔ جابجا ندی نالے اور دریا بہتے ہیں، جن سے جنگل مزید گھنے ہو گئے۔ انہی علاقوں میں شہر سے دور دراز دیہاتوں میں ہندو راجاؤں مہاراجاؤں کی پرانی محل نما حویلیاں کھنڈرات کی شکل میں کھڑی ہیں۔ مسلمان زیادہ تر شہروں میں خاص کر دھام پور' نگینہ' شیرکوٹ میں رہتے ہیں۔ ہم بھی دھام پور میں رہتے تھے۔ والد ریلوے میں ملازم تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے ان کی جگہ پر ملازمت مل گئی۔ بس والدہ تھیں اور میں۔ ہم دونوں کا خدا کے سوا اور کوئی سہارا نہ تھا۔ یوں تو ہم نے بڑی بے بسی اور بے کسی سے زندگی کی گاڑی کھینچی' اب بھی تنگی ترشی کے ساتھ گزربسر ہو رہی تھی۔

دو ماہ ہوئے تھے مجھے اسٹیشن پر کام کرتے ہوئے۔ چھوٹا سا اسٹیشن تھا زیادہ کام نہیں تھا۔ کبھی اتفاق سے مال گاڑی ٹھہرتی تھی ورنہ پیسنجر ٹرین ہی کا اسٹاپ تھا۔ اس عرصے میں مجھے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اسٹیشن ماسٹر کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ لیکن ڈھائی ماہ بعد جب ایک روز اُس نے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر کہا کہ تمہیں پندرہ بیس روز کے لیے جوگی رام پور کے اسٹیشن پر بھیجا جا رہا ہے تو مجھے عجیب سا لگا۔

وہ اسٹیشن یہاں سے تین چار چھوٹے اسٹیشن کے بعد تھا لیکن میں وہاں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اول یہ کہ ایک لمحے کے لیے بھی اماں سے جدائی بالکل گوارہ نہ تھی۔ وہ بھی مجھے اپنی نظروں سے دور کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ کہ وہاں سیٹھ ساہوکار سے لے کر ٹھگ، چور اور ڈاکوؤں تک ہندو موجود تھے اور علاقہ آسیب زدہ بھی تھا۔ چنانچہ اسٹیشن ماسٹر کے حکم پر میں نے سر جھکا کر کہا۔

''سر! میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ آپ مجھے یہیں رہنے دیں تو مہربانی ہوگی۔''

''گھبراؤ نہیں! تم وہاں مستقل نہیں رہو گے صرف پندرہ بیس دن کی بات ہے۔''

''لیکن جناب! میری مجبوری ہے۔'' میں عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''بحث مت کرو۔'' اسٹیشن ماسٹر بولا۔

''میں نے اسٹیشن ماسٹر کو زبان دی ہے۔ تمہارا جانا ضروری ہے بلکہ بہت ضروری ہے۔ بیس روز بعد میں تمہیں بلا لوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

میں منہ لٹکائے خاموشی سے گھر چلا آیا شام کو والدہ سے تذکرہ کیا تو وہ پہلے کچھ پریشان ہوئیں پھر تسلی دی کہ اگر بات صرف پندرہ بیس دن کی ہے تو میرے چلے جانے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ملازمت کے سلسلے میں پہلے ہی خاصے تلخ تجربے حاصل کر چکا تھا۔ ان کے پیش نظر میں بہتر تھا کہ اس اسٹیشن ماسٹر کی بات مان لوں۔ اگر بیس روز بعد واپسی نہ ہوئی تو پھر دیکھا جائے گا۔

غرض یہ کہ میں دوسرے ہی روز جوگی رام پور اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

جوگی رام پور ایک مختصر سا گاؤں تھا۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ہندوؤں کی پرانی محل نما حویلیاں، خوبصورت مکانات موجود تھے۔ گاؤں کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ ان جنگلوں میں بھی کھنڈر نما حویلیاں تھیں۔ جن میں آسیب نے قبضہ جما لیا تھا لیکن مجھے ان میں سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے پہنچتے وقت ہی طے کر لیا تھا کہ جتنے دن وہاں رہوں گا، صرف اپنے کام سے کام رکھوں گا۔ اسٹیشن ماسٹر جس کا نام پرشوتم تھا نے مجھے اسٹیشن پر ہی رہنے کے لیے ایک کوٹھڑی دے دی۔ جس میں پرانا آدمی رہا کرتا تھا اور وہ ان دنوں بیس روز کی چھٹی پر اپنے والدین سے ملنے گیا ہوا تھا۔ اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ چھوٹا سا پلیٹ فارم، قریب ہی دو چار کچے مکانات اور چاروں طرف دیوہیکل درخت، جن سے دن میں بھی اندھیرا نظر آتا۔

تین چار روز تک کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوئی لیکن پانچویں روز جب میں کام سے فارغ ہو کر جانے لگا تو اُس نے مجھے بلایا۔ میں خاموشی سے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور دل میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ وہ اسی وقت مجھے واپسی کا حکم سنا دے۔ پرشوتم کچھ دیر مجھے



سر سے لے کر پاؤں تک گھورتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔

''تم مجھے کام کے آدمی نظر آتے ہو، سوچتا ہوں کہ تمہیں یہاں مستقل کرلوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی صاحب! اگر آپ مجھے واپس بھیج دیں۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کیوں کیا یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے۔''

''تکلیف تو نہیں ہے صاحب لیکن اپنے گھر میں مجھے زیادہ سکون ملتا ہے۔''

''ملا خان نے مجھے بتایا کہ تم پڑھے لکھے ہو۔''

''جی ہاں سر! میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تم اگر چاہو تو میں تمہیں ایسا کام دلوا سکتا ہوں جس میں اچھی خاصی آمدنی ہوسکتی ہے۔'' پرشوتم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ٹھاکر گبر سنگھ کو ایک ایسے آدمی کی ہی ضرورت ہے جو تمہاری طرح مضبوط اور بھولا بھالا ہو۔ جیون بھر سکھ کی بانسری بجاؤ گے۔ چالیس پینتالیس روپے کی نوکری میں آخر کب تک زندگی بسر کرتے رہو گے۔''

ٹھاکر گبر سنگھ کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے کیونکہ اس کا نام دور دراز علاقوں تک مشہور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بہت بڑا ڈاکو ہے۔ راجے، مہاراجے، مہاجن، بنیے اس سے خوف کھاتے، پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالتے گھبراتی تھی۔ میں سمجھ گیا پرشوتم مجھے ٹھاکر کے پاس کس کام کے لیے رکھنا چاہتا ہے۔ دو دن ہوئے میں نے اسٹیشن پر ٹھاکر کو پرشوتم کے ساتھ رازدارانہ گفتگو کرتے دیکھا تھا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو پرشوتم نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''بت کی طرح کھڑے میری شکل کیا تکے جارہے ہو۔ میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔''

''ریلوے کی ملازمت مجھے زیادہ اچھی لگتی ہے صاحب۔'' میں نے بات ٹالنے کی خاطر کہا۔

''اور پینتالیس روپے میرے لیے کافی بہت ہیں۔''

''کوئی جلدی نہیں ہے۔ پھر سوچ کر جواب دے دینا۔'' پرشوتم یہ کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا اور میں جلدی سے باہر آگیا۔ اس عرصے میں میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں پرشوتم کی اس پیش کش کو کبھی قبول نہیں کروں گا۔

اگلے دو تین دن پرشوتم نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر چوتھے روز جب میں رات کے کھانے سے فارغ ہوکر اپنی کوٹھڑی میں لیٹا ہی تھا کہ اچانک پرشوتم کا ملازم مجھے بلانے آگیا۔ میں نے سوچا کہ ملازم کے ساتھ جانے سے انکار کروں لیکن ہمت نہ ہوئی۔ بادل نخواستہ میں نے ملازم سے کہا کہ تم چلو میں آتا ہوں۔'' اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر اُلجھن میں مبتلا رہا۔ پھر اُٹھ کر کپڑے پہنے اور پرشوتم کے گھر کی طرف چل دیا جو اسٹیشن سے دو فرلانگ دور تھا۔ میں تمام راستے سوچتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے پرشوتم نے مجھے اس مقصد سے بلایا ہو جس کا ذکر تین چار روز پہلے وہ کرچکا تھا۔

میں کھیتوں میں پگڈنڈی سے گزرتا ہوا ایک گھنے جھنڈ میں پہنچا جہاں بڑے بڑے درخت کھڑے تھے اور وہاں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اچانک ایک نسوانی آواز نے میرا نام لے کر مجھے پکارا۔ میں چونک کر رک گیا۔ وہ شیریں اور دلنواز آواز تھی۔ میں نے اتنی رسیلی آواز پہلے کبھی نہیں سنی تھی اور نہ اس سے پہلے کبھی میری زندگی میں کسی عورت کا عمل دخل رہا تھا۔ میں نے بڑی سادہ اور پاکباز زندگی بسر کی تھی۔ حالانکہ میں اس وقت صحت و شباب کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس خوفناک گھپ تاریکی میں یہ آواز سن کر اور اپنا نام سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

''سنو ظہیر!'' دوسری بار جب میرا نام لے کر آواز دی گئی تو میں نڈر ہوکر اس طرف چلا گیا۔ کچے راستے سے ہٹ کر برگد کے درخت کے نیچے پہنچا تو میری حیرت دوچند ہوگئی۔ ایک انتہائی حسین دوشیزہ جس کی عمر مشکل سے پچیس سال ہوگی۔ درخت کے نیچے موجود تھی۔ اس نے اپنا بدن ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ لیکن چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی میں حیرت سے اس کا خوبصورت چہرہ ہی دیکھ رہا تھا کہ اس نے بڑی مترنم آواز میں کہا۔

''تم شاید پرشوتم کے بلاوے پر اُس کے گھر جارہے ہو۔''

''جی ہاں! آپ کا خیال درست ہے لیکن آپ نے مجھے کیوں آواز دی ہے۔'' میں نے اُس کے خوبصورت چہرے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر دائیں بائیں دیکھ کر اُس نے سرگوشی میں کہا۔

''تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھ لو۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''ظہیر! میں، میں اس وقت یہاں زیادہ دیر تک نہیں رُک سکتی تم اگر چاہو تو کسی روز بھی رات کے بارہ بجے کے بعد نرنجن لال کی حویلی میں آکر مجھ سے بے دھڑک مل سکتے ہو۔ اس وقت میں تمہیں صرف اتنا بتانے آئی ہوں کہ تمہارا پرشوتم کے گھر جانا خطرے سے خالی نہیں۔''

''کیوں، کیا وہاں میرے لیے کوئی خطرہ ہے۔'' میں نے لاپروائی سے سوال کیا۔

''ہاں اگر تم وہاں گئے تو تم بھی پھنس جاؤ گے۔ پولیس کی ٹکڑی آج وہاں چھاپہ مارنے والی ہے۔'' عورت نے دوبارہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس سے بیشتر کہ میں کچھ اور دریافت کرتا کہ اس نے چادر میں اپنا حسین چہرہ چھپایا اور تیز تیز قدم اٹھاتی میری نظروں سے دور جاکر اندھیرے میں گم ہوگئی۔ عورت کے بارے میں اتنا اندازہ تو ہوگیا مجھے کہ وہ ہندو ہے لیکن میں یہ جان نہ سکا کہ وہ کون تھی، مجھے کیسے جانتی تھی اور یہ کہ اس نے مجھے خطرے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کس وجہ سے کی تھی؟ عورت کے جانے کے بعد میں بھی بہت دیر تک وہیں کھڑا اپنے ذہن میں اُبھرنے والے سوالات کا حل تلاش کرتا رہا۔ میرا دل یہی کہتا تھا کہ میں پرشوتم کے گھر جانے کے بجائے اپنی کوٹھڑی کی طرف لوٹ جاؤں لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میں نہ گیا تو وہ صبح مجھ پر ناراض ہوگا۔ یہ سوچ کر دوبارہ اس کے گھر کی سمت قدم بڑھانے لگا جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا گیا میری اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔ اس وقت رات کے دس بجے کا وقت ہوگا۔ ہر طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پرشوتم کا مکان اب صرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنے خیال میں اُلجھا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دم ٹھٹھک کر رُک گیا۔ پولیس کی سیٹیوں کی آواز نے میرے قدم روک لیے پھر آناً فاناً پولیس کے سپاہیوں نے جو اندھیرے میں چھپے بیٹھے تھے، ایک دم سامنے آکر پرشوتم کا مکان گھیرے میں لے لیا۔ راستے میں ملنے والی دوشیزہ نے جس خطرے سے ہوشیار کیا تھا وہ سچ نکلا۔ میں کسی تامل کے بغیر تیزی سے پلٹا اور اسٹیشن کی طرف ہولیا۔

میرا اُس وقت بچ نکلنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ رات بھر میں ایک پل کے لیے بھی نہ سوسکا۔ کوٹھڑی بند کیے پڑا رہا۔ اس عورت کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ کون تھی۔ مجھے کیسے جانتی تھی اور اس نے رات کے بارہ بجے کے بعد ہی کیوں بلایا۔ اس ویرانے میں وہ حسین عورت کیا کررہی تھی۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی۔ بہرحال میں نے طے کرلیا تھا۔ اس حسین محسنہ سے مل کر کم از کم اس کا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔

☆......☆......☆

دوسرے روز صبح میں پلیٹ فارم پر گیا۔ پرشوتم روزانہ سات بجے آتا تھا لیکن آٹھ بج چکے تھے اور وہ نہیں آیا تھا۔ پھر جب ساڑھے آٹھ بجے تو میں نے اسے دفتر میں پایا اُس کے چہرے پر اُلجھن اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نظر آرہے تھے۔ آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ رات بھر جاگتا رہا ہو۔ میں نے سوچا اسے بتادوں کہ میں رات اس کے بلانے پر گیا تھا۔ لیکن حالات کے پیش نظر واپس چلا آیا۔ کئی بار ہمت کی لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کردیا کہ جب وہ دریافت کرے گا تو بتادوں گا۔ دوپہر کو مجھے ریلوے میں کام کرنے والے ایک دوسرے ملازم سے معلوم ہوا کہ رات پولیس پرشوتم کے ساتھ گبر سنگھ کو پکڑ کر لے گئی تھی لیکن صبح ضمانت پر رہا کردیا تھا۔

میرا خیال تھا پرشوتم مجھے ضرور اپنے کمرے میں بلا کر رات کے نہ آنے کی وجہ دریافت کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں تنہا کام کرتا رہا۔ پھر خاموشی سے اُٹھ کر گھر واپس چلا گیا۔ پرشوتم اور گبر سنگھ کی گرفتاری اور رہائی کی اطلاع پا کر مجھے وہ حسینہ پھر یاد آنے لگی جس نے مجھے ایک بڑے خطرے سے بچایا

تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت جاکر اس کا شکریہ ادا کروں لیکن پھر خیال آیا کہ اس نے کہا تھا کہ رات بارہ بجے کے بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں عادت کے مطابق آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میرے حواس پر صرف ایک چیز طاری تھی اور وہ تھی حسینہ، اُس کی پُراسرار ذات۔ جس قدر میں اُس کے بارے میں سوچتا میرا اضطراب اتنا ہی بڑھ جاتا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں اس سے برسوں سے واقف ہوں اور پھر، پھر مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں اُس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہوں مجھے اپنے اس خیال پر ہنسی آئی۔ میں نے یہ خیال دل سے نکالنا بھی چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک عجیب سا احساس میرا دل گدگدا رہا تھا۔ رات کے بارہ بجے کے بعد بے چینی سے اٹھا اور میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور دبے قدموں کوٹھڑی سے باہر آ گیا اور آبادی کی طرف ہولیا۔ گلیوں سے ہوتا ہوا کھیتوں کی طرف آ نکلا۔ ہر طرف ہولناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں میں سے چمگادڑوں کی آوازیں کبھی کبھار سنائی دیتی تھیں۔ نرنجن لال کی حویلی کے بارے میں، میں نے دوپہر ہی کو اپنے ایک ساتھی سے دریافت کر لیا تھا کہ وہ حویلی کس طرف واقع ہے؟ مجھے یاد ہے کہ میرے استفسار پر میرے ساتھی نے مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ کچھ ایسی نظروں سے جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یہ حویلی گھنے جنگل میں واقع تھی۔ میں راستے کا تعین کرتا ہوا حویلی تک پہنچا۔

حویلی کے قریب پہنچ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ باہر سے دیوہیکل عمارت خاصی پرانی نظر آ رہی تھی۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ رنگ و روغن بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک عجیب سی ویرانی بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پھاٹک کے قریب پہنچا تو ایک بڑی سی چمگادڑ چیختی ہوئی اڑی میں پھاٹک پر کھڑا ہو گیا۔ میں ابھی پھاٹک پر کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں کہ حویلی میں سے اسی حسینہ کی آواز سنائی دی۔

''ظہیر اندر آ جاؤ۔'' میں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر قدم اندر بڑھا دیے۔

حویلی کا صدر دروازہ بھی بڑا نظر آ رہا تھا لیکن صدر دروازے سے گزر کر میں نے جب اندرونی ہال میں قدم رکھا تو دنگ رہ گیا۔ یہاں سلیقے اور سجاوٹ کا جو منظر مجھے نظر آیا وہ آج دن تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ ہر شے قیمتی اور نایاب تھی۔ جس کا تصور بھی کسی عام آدمی کے لیے محال ہوتا ہے۔ اس قیمتی ساز و سامان کو دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ یہ کسی ڈاکو کی حویلی تو نہیں۔ میں حیرت سے کھڑا وہ چیزیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس حسینہ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''بیٹھ جاؤ ظہیر!'' میں نے چونک کر بائیں طرف دیکھا تو وہی حسینہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔ گزشتہ شب تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اس وقت روشنی میں کھڑی وہ کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے جسم سے رعنائیاں جھلک رہی تھیں۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی اتنی حسین عورت کا تصور نہیں کیا تھا۔ وہ تو کوئی حور تھی، قدرت نے غالباً اسے اپنے ہاتھوں سے حسن کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ پھر ان سب پر قیامت یہ کہ وہ باریک گاؤن جیسے لباس میں سے اپنے حسین سڈول جسم کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ تیر کی طرح تنا ہوا سینہ، سپاٹ پیٹ، گداز رانیں، بھرے بھرے کولہے، چکنی پنڈلیاں، میں اس کے سحر میں ڈوب چکا تھا۔ میرے دل کی رفتار تیز ہو گئی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اُس کے یاقوتی ہونٹوں کو دوبارہ جنبش ہوئی۔

''ظہیر! میں تمہاری ہی منتظر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آ ؤ گے۔''

''میں اس وقت تمہارا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے آیا ہوں۔'' میں نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کل رات تم نے مجھے جس خطرے سے آگاہ کیا تھا وہ درست نکلا۔'' میری بات سن کر وہ مسکرائی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کائنات کا سارا حسن اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ بہت دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ بے تکلفی برتتی رہی۔ میری خاطر تواضع کرتی رہی اور مجھے پرشوتم اور رتنا کر کے بارے میں بتاتی رہی لیکن میں صرف اور صرف اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا کہ وہ آخر کون ہے جس نے پہلے میری جان بچائی اور پھر میرے دل و دماغ پر جادو کر دیا۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' وہ خاموش ہوئی تو میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''اس حویلی میں تمہارے سوا اور کون رہتا ہے؟''

''کوئی نہیں۔ میں یہاں بالکل تنہا رہتی ہوں۔ یہ ہمارے پرکھوں کی حویلی ہے۔'' اس کے چہرے پر اُداسی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

''کیا اس دنیا میں تمہارا کوئی نہیں۔''

''نہیں۔'' اُس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ پھر مجھے دیکھ کر خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''اب تم ملے ہو تو مجھے لگ رہا ہے کہ اب میری تنہائی دور ہو جائے گی۔'' میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر خوشی سے جھوم اٹھا مجھے اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا کہ اتنی حسین اور مالدار عورت مجھے محبوب بنانے پر خود آمادگی ظاہر کر رہی ہے۔

وہ اُٹھ کر میرے قریب آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بستر کی طرف لے گئی۔ بہت بڑا مخملی بستر تھا۔ میں بستر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ حسینہ بھی میرے برابر میں بیٹھ گئی اور میری گود میں جھول گئی۔ اپنے دونوں ہاتھ میرے گلے میں ڈال لیے۔ باریک لباس سمٹ کر اوپر تک آ گیا کہ جیسے بجلی گری ہو۔ ہر حصہ عریاں ہو چکا تھا اور بجلیاں گرا رہا تھا۔ حسینہ میری گود میں مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مچل رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ بہت جلد میں اس سے بے تکلف ہوتا گیا۔ پھر میں گھبرا کر علیحدہ ہوا اور میں نے اُسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میں اس کے مقابلے کا نہیں تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ معلوم وہ مجھ سے کیا برتاؤ کرتی ہے۔ مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ میری غربت کا حال جان کر کہیں وہ مجھے نفرت سے دھتکار نہ دے۔ لیکن اس کے برعکس میری روداد سن کر وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ مہربان ہو گئی۔ جب تین چوتھائی رات بیت گئی۔ میں مجبوراً جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ میرے ساتھ صدر دروازے تک آئی۔ رخصت کرتے ہوئے اُس نے مجسم التجا بن کر پوچھا۔

''ظہیر کل آ ؤ گے نا۔''

''اگر تم بلاؤ گی تو ضرور آؤں گا۔''

''ضرور آنا، میں تمہارا انتظار کروں گی...... لیکن بارہ بجے سے پہلے نہ آنا۔'' میں اقرار میں گردن کو جنبش دیتا ہوا حویلی سے رخصت ہو کر واپس اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ بستر پر سونے کے ارادے سے لیٹا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ خواب سے زیادہ حقیقت نہیں لیکن وہ خواب نہیں تھا۔

زندہ حقیقت تھی۔ جس کا یقین مجھے دوسری رات آ گیا۔ دن میں نے تڑپ تڑپ کر گزارا اور حسب وعدہ جب میں آدھی رات گزرنے کے بعد اس کی حویلی پر آ گیا۔ تو وہ سراپا انتظار بنی مجھے بیرونی پھاٹک پر کھڑی ہوئی مل گئی۔

کل رات کے مقابلے میں آج وہ مجھ پر زیادہ مہربان تھی۔ اس نے میرے لیے انواع و اقسام کی چیزیں میز پر چُن دی تھیں اور وہ بڑے اصرار سے مجھے ہر چیز اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو کوئی الف لیلوی شہزادہ سمجھ رہا تھا۔ اس حسین عورت کا قرب پا کر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی غربت بھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پہلی عورت تھی جو میری زندگی میں داخل ہوئی تھی اور بڑے بھرپور انداز میں میرے ذہن پر بادلوں کی طرح چھائی جا رہی تھی۔ میں اُس کے اصرار پر جو وہ کھلاتی رہی، کھاتا رہا پھر بڑی ہمت کر کے میں نے بھی ایک سیب اٹھایا اور اسے کھلانے کی کوشش کی لیکن اُس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ میرا دل بجھ کر رہ گیا۔ میں نے اُداس نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ تو وہ میرے دل کا راز بھانپ

گئی اور مسکرا کر بولی۔

"ظہیر ناراض نہ ہونا تمہاری خاطر میں اپنی زندگی بھی قربان کرسکتی ہوں۔"

"پھر تم نے میرے ہاتھ سے سیب کھانے سے کیوں انکار کردیا۔" میں ناراضی کا اظہار کیا تو وہ سرک کر میرے بالکل قریب آ گئی۔ میں نے اس کے جسم کا گداز محسوس کیا اور پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ میں زندگی میں کیسی مسرتوں سے محروم تھا۔ وہ میرے اور قریب آئی اور اپنی مرمریں بانہیں میری گردن میں ڈال کر جذبات انگیز لہجے میں بولی۔

"میں آج کل صرف دودھ پر گزارہ کررہی ہوں۔ ظہیر اگر تم اپنے ہاتھوں سے دودھ پلا دو تو میں خوشی سے پی لوں گی۔" میں نے جھٹ میز پر سے دودھ کا گلاس اُٹھا کر اُس کے ہونٹوں سے لگادیا۔ پھر اپنی نشیلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ظہیر! تمہیں پا کر میں اپنا سارا دکھ درد بھول گئی ہوں۔ کاش ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہوسکتے؟" اس کے آخری جملے میں چھپا ہوا درد محسوس کرکے میں بے چین ہوگیا۔ حالانکہ میں آج دوسری بار اُس سے ملا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے ہم ایک دوسرے سے برسوں سے واقف ہیں۔ اِس کی گداز بانہیں بدستور میرے گلے میں حائل تھی۔ اور اس کی آنکھیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور میں اس کی سانسوں کی خوشبو سے مدہوش ہوا جارہا تھا۔ وہ میرا جواب سننے کے لیے مضطرب نظر آرہی تھی۔ مجھے ایک دم اپنی بے بسی اور بدحالی کا خیال آیا اور میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"تم میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو گی۔ میں ایک مفلس اور قلاش آدمی ہوں اور تم؟"

"ظہیر ایسا نہ کہو۔" وہ تیزی سے بولی۔

"دولت ہی ہر بات کی کسوٹی نہیں ہوتی۔" میں اس کا جواب سُن کر لاجواب ہوگیا۔

"تم نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا، نہ ہی یہ بتایا کہ تم کون ہو اور کس فرقے سے تعلق رکھتی ہو۔" آخر کار میں نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

"میرا نام، میرا نام رادھا ہے۔" اُس نے رُک رُک کر کہا۔ پھر بڑی شدت سے مجھے لپٹا کر بولی۔ "تم اگر مجھے اپنانے پر آمادہ ہوجاؤ تو میں مسلمان ہونے کو بھی تیار ہوں اور میرا سب کچھ تمہارا ہے۔" رادھا کے قرب نے مجھے مدہوش کررکھا تھا وہ مچلنے لگی۔

"تمہیں پھر کہہ رہی ہوں میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ بے لباس ہوجاتی اور میں اس کی پیش کش قبول کرلیتا مگر مجھ پر کمتری کا احساس غالب آ گیا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ میں نے اسے اپنا لیا تو لوگ کہیں گے کہ میں نے دولت کی خاطر ایسا کیا ہے۔ اپنے ذہن کی اس کشمکش نے مجھے اور پریشان کردیا میرا دم نہ جانے کیوں گھٹنے لگا۔

"ظہیر! مجھے ٹھکرا نہ دینا۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں بہت غریب آدمی ہوں رادھا! لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔" میں نے اُداسی سے جواب دیا۔

"ظہیر میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتا سکتی ہوں کہ جس سے تم بہت جلد مالدار بن سکتے ہو لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں تم اپنی جان نہ گنوا بیٹھو۔"

"ایسا کون سا طریقہ ہے کہ جس سے میں اتنی جلدی مالدار بن سکتا ہوں۔ مجھے فوراً بتادو تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں دہکتی ہوئی آگ میں بھی کود سکتا ہوں۔ جلدی سے مجھے وہ طریقہ بتاؤ کہ جس سے میں دولت حاصل کرسکتا ہوں، تمہیں اپنانے کے لیے میں سب کچھ کر گزروں گا۔" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"اگر تم اصرار کرتے ہوئے تو میں تمہیں بتادوں گی لیکن اس شرط پر کہ جب تک تم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوجاؤ۔ اس بات کا اظہار کسی پر بھی نہ کرنا۔"

"منظور ہے۔" میں نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔

"اچھا کل میں تمہیں وہ طریقہ بھی بتادوں گی۔" رادھا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"آج بتانے میں کیا حرج ہے۔"

آج نہیں، کل۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر بڑے والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی

مزید اصرار نہیں کیا۔ تین پہر رات گزاری تو میں رادھا سے اجازت لے کر واپس اپنی کوٹھڑی کی سمت چل پڑا۔ راستے بھر میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ ہر قیمت پر اسے اپنالوں گا۔ وہ میرے احساس پر کچھ اس طرح حاوی ہوگئی تھی کہ میں اس کے سوا اور کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

رات بھر میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا، صبح اٹھ کر میں اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا لیکن کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ خدا خدا کرکے دن ختم ہوا تو مجھے نصف رات گزرنے کا انتظار کرنا پڑا۔ ایک لمحہ، ایک پل میرے لیے کاٹنا محال ہورہا تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ اب رادھا کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔ میں اُس کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

جب رات کے بارہ بجے تو میں بے تابانہ نرنجن لال کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ راستے میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں چمگادڑوں کے چیخنے کی بھیانک آواز سنائی دیتی۔

میں حویلی پہنچا تو رادھا پورے حشر سامانی کے ساتھ میری منتظر تھی۔ دیکھتے ہی سراپا اشتیاق بن کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر اندر لے گئی۔ کل کی طرح وہ مجھے قسم قسم کی چیزیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی رہی۔ میں نے اصرار کیا تو آج بھی اُس نے دودھ پینے پر اکتفا کیا۔ دودھ پینے کے لیے وہ میری گود میں جھول گئی اور اپنا جسم رگڑنے لگی۔ اس کا مختصر سا لباس بے قابو ہورہا تھا کبھی گداز رانیں عریاں ہوجاتیں، کبھی تیر کی طرح تنا ہوا سینہ بجلیاں گرانے لگتا۔ میں آج کچھ زیادہ ہی مضطرب تھا۔ میں نے اسے بے ساختہ بھینچ لیا اور پوچھا۔

"آج تم نے مجھے کچھ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں، لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں تم کسی خطرے میں نہ پھنس جاؤ۔" وہ کچھ فکرمندی سے بولی۔

"اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ مجھے کیا کرنا ہے، اس کے بعد میرا کام ہے، اگر قسمت میں ہمارا ملاپ لکھا ہے

تو ہر مشکل آسان ہوجائے گی۔ ورنہ ہم کتنے ہی ہاتھ پاؤں ماریں کچھ نہیں ہوگا۔ یوں بھی اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" رادھا نے اپنے سرخ ہونٹ میرے ہونٹوں سے پیوست کردیے پھر بولی۔

"ایسا نہ کہو ہمارا ملن ہوگا۔" میں نے اصرار کیا اور اپنی جان کی قسم کھائی تو اس نے میری نظروں میں نظریں ڈال کر کہنا شروع کیا۔

"ظہیر! یہ راز آج میں تمہیں بتا رہی ہوں ایک عرصے سے مجھے معلوم ہے لیکن میں نے کسی اور کو نہیں بتایا مگر میں چاہتی ہوں کہ تم بڑے آدمی بن کر مجھے اپنالو، کام جان جوکھوں کا ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ضرور کامیاب ہوگے۔ منی حاصل کرلینے کے بعد تم اتنی دولت کے مالک بن جاؤ گے جس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

"منی" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ کیا بلا ہے، کیا چیز ہے۔"

"منی کو تم پارس پتھر بھی کہہ سکتے ہو۔" رادھا نے بدستور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"سانپوں میں ایک قسم اجگر سانپ کی ہوتی ہے۔ جب کوئی اجگر سانپ پانچ سو سال پرانا ہوجاتا ہے تو منی حاصل کرلیتا ہے جسے وہ اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اندھیری راتوں میں جب اجگر مست ہوتا ہے تو کسی ویران اور سنسان مقام پر جا کر وہ منی کو منہ سے نکالتا ہے اور وہ اس سے کھیلتا ہے اور جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو منی کو دوبارہ اپنے منہ میں رکھ لیتا ہے۔ 'منی' اجگر سانپ کے منہ سے نکلتے ہی روشن ہوجاتا ہے تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ اس کی روشنی کس قدر تیز ہوتی ہے۔" رادھا نے منی کے بارے میں تفصیل بتائی تو میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں نے اکثر بزرگوں سے ناگ منی کے بارے میں سُن رکھا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ اسے حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں لیکن اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا۔ رادھا کی نشیلی نظروں نے مجھ پر سحر کررکھا وہ جو کچھ کہتی رہی میں مدہوشی کے عالم میں بیٹھا سنتا رہا۔

"یہاں سے تین فرلانگ کے فاصلے پر جیل کا پل

واقع ہے جہاں کچی سڑک پر دونوں طرف کھیت ہی کھیت موجود ہیں میری بات اچھی طرح ذہن نشین کرتے رہو۔" رادھا نے کہا۔

"چیل کے پل پر پہنچ کر تمہیں اُلٹے ہاتھ ایک کچا ہوٹل ملے گا۔ اس ہوٹل اور کھیت کے درمیان ایک تنگ سا کچا راستہ جاتا ہے۔ تم اسی راستے پر ایک میل اندر چلے جانا اور پھر تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھو اگر منی سے کھیلتے وقت اجگر کی نظر تم پر پڑگئی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لیے تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ یہ بہت احتیاط اور جان جوکھوں میں ڈالنے کا کام ہے۔ سنو! میں تمہیں ایک بڑا توا دوں گی جس پر ایک سمت لمبی لمبی کیلیں ابھری ہوں گی۔ جب تم اجگر کے قریب پہنچ جاؤ تو کسی محفوظ جگہ پر یا درخت پر چھپ جانا ایسی قریبی جگہ پر جہاں تم آسانی سے یہ توا منی پر ڈال سکو۔ اجگر سانپ! منی کی واپسی کے لیے غضب ناک ہوکر توے پر سر مارتا رہے گا اور اس کے حصول کے لیے سر پٹخ پٹخ کر مر جائے گا۔ اس کے بعد منی کو تم میرے پاس لے آنا۔ باقی باتیں میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ بولو ظہیر! کیا تم اس کام کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔ کیا مجھے پانے کے لیے تم منی لانے کا عزم کرو گے۔" وہ سراپا برہنہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"مجھے دیکھو اور فیصلہ کرو۔" ایسا لگا کہ جیسے بجلی گری ہو۔ دنیا کا حسین ترین جسم بے پردا تھا۔ مجھ پر مدہوشی طاری ہوتی جارہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے اسی مدہوشی کے عالم میں جواب دیا۔ "میں یہ کام ضرور کروں گا۔"

"مجھے یقین تھا کہ ضرور آمادہ ہوجاؤ گے۔" رادھا نے خوشی سے جھوم کر کہا۔

"آج کی رات تمہاری کامیابی کی رات ہے۔ تم اسی وقت اپنی کامیابی کی مہم پر روانہ ہوجاؤ تاکہ ہمارے ملاپ کی گھڑیاں زیادہ طویل نہ ہوں۔"

رادھا کے قرب، اس کی باتوں اور اس کی نشیلی آنکھوں میں خدا جانے وہ کون سا جادو تھا۔ جس کے اثر سے میں بغیر سوچے سمجھے اس مہم پر جانے کو تیار ہوگیا۔ رادھا نے جو توا مجھے دیا وہ گھروں میں روٹی پکانے والے توے سے کچھ زیادہ وزنی اور بڑا تھا۔ توے کے ایک جانب بڑی بڑی نوکیلی کیلیں موجود تھیں۔

میں نے وہ توا لیا اور حویلی سے باہر نکل کر چیل کے پل کی طرف چل پڑا۔ چیل کا پل میری دیکھی بھالی جگہ تھی۔ غرض یہ کہ جلدی جلدی چیل کے پل پر پہنچا۔ یہاں سے چار راستے علیحدہ علیحدہ سمتوں کو جاتے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے رُک کر الٹے ہاتھ پر واقع اس کچے ہوٹل پر نظر ڈالی جو اس وقت بالکل ویران تھا۔ پھر میں کھیتوں کے درمیان گزرنے والے کچے راستے پر ہولیا۔

اس وقت میرے دل میں کسی قسم کا خوف طاری تھا نہ ہی مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میری یہ خطرناک مہم میرے لیے کیسی ثابت ہوگی۔ صرف رادھا کی نشیلی آنکھوں کا خمار اور اسے پالینے کی تمنا مجھے کشاں کشاں منزل کی سمت گھسیٹے لیے جارہی تھی۔ چاروں طرف موت کی خاموشی اور گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے اندازے سے ایک میل کا راستہ طے کیا پھر کچے راستے سے ہٹ کر سیدھے ہاتھ کی جانب مڑ گیا اور کچھ دُور جا کر ایک گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ میری نظریں سامنے کھیت پر تھیں۔ پشت کی سمت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھنے درخت رات کے سناٹے میں بڑے پُراسرار نظر آرہے تھے۔ سیدھے ہاتھ پر لق و دق میدان نظر آرہا تھا۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس پُراسرار ماحول، گہری تاریکی اور ویران مقام پر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ کوئی شخص یہ احمقانہ قدم نہ اٹھاتا بشرطیکہ اس نے رادھا کو نہ دیکھا ہوتا۔ رادھا کا شمار ان حسینوں میں ہوتا تھا جن کے لیے لوگ بڑے بڑے پہاڑوں کو تن تنہا شکست دے سکتے ہیں اور ایسے غیر معمولی کام کر گزرتے ہیں جو انسانوں سے ممکن ہی نہیں۔ میں ماحول سے بے نیاز اس وقت رادھا کے حسنِ جہاں سوز کے تصور میں غرق تھا۔ یکایک مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ گنے کے کھیت میں سوکھے ہوئے پتوں کی چرچراہٹ ہورہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں آواز کی سمت جما دیں لیکن میرا ذہن خوف و خطرے

سے یکسر خالی تھا۔ تیز تیز سانس لینے کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفے سے میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی اور پھر، پھر میں نے تاریکی کے باوجود ایک موٹے تازے سانپ کو کھیت کی سامنے والی پگڈنڈی سے میدان کی طرف اُترتے دیکھ لیا۔

میرا اور اس اجگر سانپ کا درمیانی فاصلہ مشکل سے پچیس گز ہوگا جو آہستہ آہستہ گھٹتا جارہا تھا۔ میں سانس روکے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ کھلے میدان میں آکر سانپ نے رینگنا چھوڑ دیا تو میں بڑی آہستگی سے درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ سانپ کا اور میرا فاصلہ اب محض پندرہ سولہ گز رہ گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ غیر متحرک رہا پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنا منہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا رہا ہے۔ زمین سے تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ بلند ہونے کے بعد سانپ نے اپنا پھن کاڑھ لیا اور جھومنے لگا۔ میں درخت کی اوٹ میں چھپا حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر سانپ سرمستی کے عالم میں جھومتا لہراتا رہا۔ پھر اچانک میں نے اُس کے منہ سے روشنی کا گولا نمودار ہوتے دیکھا۔ جو ٹینس کی گیند کے برابر تھا۔ اُس کی روشنی رادھا کے کہنے کے مطابق بہت تیز تھی۔ میں حیرت و استعجاب کے عالم میں کھڑا سانپ کو اس روشن گیند سے کھیلتا دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اجگر سانپ ہی ہے جو اس وقت منی سے کھیل رہا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں لیکن خوف اب بھی مجھ پر غالب نہ آسکا۔ اجگر اپنی منی سے کھیل رہا تھا۔ وہ منی کو اوپر اچھال دیتا پھر جھومنے لگتا اور جب منی نیچے آتی تو وہ دوبارہ اپنا پھن مار کر اسے فضا میں بلند کردیتا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے منی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا۔ وہ اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کسی خاموش تماشائی کی طرح میں اس بھیانک کھیل سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"ظہیر جلدی کرو، اگر تم نے یہ موقع کھو دیا تو پھر تمام زندگی تمہیں پچھتانا ہوگا۔" اس ویرانے میں رادھا کی آواز سُن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے پھرتی سے گھوم کر دیکھا وہاں میرے اور اجگر سانپ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ آواز غالباً میری اپنی تنہائیوں کی ایک بازگشت تھی۔ جس نے مجھے بروقت چونکانے کی سعی کی تھی۔ میں نے دوبارہ اجگر پر نظر ڈالی جو بدستور سرمستی کے عالم میں جھوم جھوم کر منی سے کھیل رہا تھا۔ میں بڑی سرعت سے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اور آہستہ آہستہ میں نے اس کی طرف رینگنا شروع کردیا۔ رادھا نے جو توا مجھے دیا تھا وہ میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ میرا وجود ہر لمحہ موت سے قریب تر ہوتا جارہا تھا مگر مجھے کسی خطرے کا احساس تک نہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر اجگر نے میری موجودگی محسوس کرلی تو میرا وہاں سے بچ نکلنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ میں نے بزرگوں اور سپیروں کی زبانی یہ بھی سُن رکھا تھا کہ سانپ کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ زمین پر رینگتے ہوئے وہ ایک میل کی آہٹ بھی سُن سکتا ہے مگر پھن کاڑھ لینے کے بعد وہ زیادہ دور کی آواز نہیں سُن سکتا۔ بہرحال میں ان تمام باتوں سے بے نیاز حشرات الارض کی طرح رینگ رینگ کر آگے بڑھتا رہا۔ میرا اور اجگر کا درمیان فاصلہ بڑی سست رفتاری سے گھٹتا رہا۔ پھر میں اس سے بارہ چودہ فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر ایک درخت کی آڑ میں رُک گیا۔ یہاں سے میں باآسانی اس توے کو منی پر پھینک سکتا تھا۔ لیکن خطرہ اس بات کا تھا کہ میرا نشانہ ذرا بھی خطا کر گیا یا منی توے کے نیچے نہ دب سکا تو میری ساری محنت اکارت جائے گی۔ میں یہ سنہری موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں ابھی اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ میری نظر اپنے بائیں جانب پڑی ہوئی ایک دوشاخہ لکڑی پر پڑی جو جانے وہاں کب سے پڑی ہوئی تھی۔ مگر اس وقت اسے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب اُبھر آئی۔ میں نے لکڑی کی جانب رینگنا شروع کیا اور قریب پہنچ کر لکڑی پر اپنے اُلٹے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرلی۔ رادھا کا دیا ہوا توا میرے سیدھے ہاتھ میں تھا اور میری نظریں اجگر پر مرکوز تھیں جو مستقل منی سے کھیل رہا تھا۔

اب میری سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کرنے کا وقت آچکا تھا۔ میں نے اپنے گھٹنے پیٹ کی طرف سرکا کر آہستہ آہستہ اوپر کی جانب رینگنا شروع کردیا۔ اجگر نے ایک بار جب پھن مار کر منی کو اوپر پھینکا تو میں برق

رفتاری سے اچھل کر بیٹھ گیا۔ اُلٹے ہاتھ میں دبے ہوئے لکڑی کے دوشاخے کو میں نے زور سے اس کے پھن کا نشانہ لے کر پھینکا میرا وار خالی نہیں گیا۔ دوشاخہ اجگر کے پھن سے ٹکرایا تو اجگر ایک طرف جھول گیا۔ عین اسی وقت منی زمین پر گرا اور میں نے خدا کا نام لے کر تو اس کی جانب اچھال دیا۔ ویران سناٹے میں توا گرنے کی آواز ابھری پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ میرا دوسرا نشانہ بھی خطا نہیں ہوا لیکن میں نے اس کا اندازہ لگانے کے لیے رُکنے کی حماقت نہیں کی بلکہ تیزی سے پلٹ کر اسی درخت کی سمت بھاگنا شروع کر دیا جس کی اوٹ میں چھپا کھڑا تھا۔ درخت کے قریب پہنچ کر میں نے اچھل کر درخت کی شاخ پکڑی اور ٹانگیں سکیڑ کر اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اب میں کس حد تک محفوظ تھا۔ درخت پر چڑھنے کے بعد میں نے نظر گھما کر اجگر سانپ کی طرف دیکھا تو پہلی مرتبہ خوف سے جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اجگر سانپ غضب کی حالت میں اپنا سر اٹھا اٹھا کر توے پر مار رہا تھا۔ اس کی پھنکار کی تیز آواز یقیناً دور دور تک سنی جا رہی ہوگی۔ میں درخت پر دبکا ہوا یہ خوفناک منظر دیکھتا رہا۔ منی کو دوبارہ حاصل کر لینے کی تمنا نے اجگر سانپ کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ یہی دیوانگی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ اس کے توے پر سر مارنے میں سستی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کا جسم اب رفتہ رفتہ اکڑنا شروع ہو گیا تھا۔ سانس کی آواز بھی تھم چکی تھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا یہ تمام تماشا دیکھتا رہا۔ پھر جب بہت دیر تک اجگر نے کوئی حرکت نہ کی تو درخت سے نیچے اترا اور یہ یقین کر لینے کے لیے کہ وہ موذی جانور مر گیا یا نہیں۔ میں نے دو چار پتھر اُٹھا کر اس کی طرف پھینکے جب اجگر نے کوئی معمولی حرکت بھی نہ کی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ اس کی سمت بڑھنا شروع کیا۔ رادھا نے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک ثابت ہوا۔

قریب جا کر جو کچھ میں نے دیکھا اُس سے میں لرز اُٹھا۔ سانپ کا وزنی سر قیمہ ہو چکا تھا۔ اس کا پھن توے کی کیلوں سے اُلجھا ہوا بے حس و حرکت تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً لکڑی کے دوشاخے کی مدد سے اس کا وزنی سر توے سے علیحدہ کیا اور جھک کر اس گولے کو اٹھا لیا جو تپتے لوہے کی طرح گرم ہو رہا تھا۔ اپنی قمیض اُتار کر میں نے منی کو اس میں احتیاط سے لپیٹا پھر نرنجن لال کی حویلی کی سمت دوڑنے لگا۔ راستے میں کئی بار مجھے ٹھوکر لگی، میں جلد سے جلد رادھا کے پاس پہنچ کر منی حاصل کرنے کی خوشخبری سنانا چاہتا تھا۔

رادھا مجھے بیرونی پھاٹک پر ہی مل گئی۔ وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''مجھے یقین تھا ظہیر کہ تم ضرور کامیاب ہو گے۔''

اس نے منی کو میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اسے وہ چومنے لگی۔ اس کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ اس نے اسے منہ میں ڈال لیا اور بولی۔ ''اب تم جاؤ، کل ضرور آنا کل ہمارے ملاپ کا دن ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ حویلی کے اندر چلی گئی۔ مجھے رادھا کا یہ طرزِ عمل گراں گزرا لیکن یہ سوچ کر ممکن ہے رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے اس نے مجھے حویلی کے اندر آنے کی اجازت نہ دی ہو، میں ہانپتا ہوا اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆......☆

اپنی کوٹھڑی میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ آج میں نے جو مہم سر کی وہ کس قدر خوفناک تھی۔ یہ رادھا کے بے مثال حسن کا ہی اعجاز تھا۔ ورنہ میں کبھی اس خطرناک مہم میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے کل کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کل کا، جس میں ایک حسین عورت میری ملکیت بننے والی تھی۔ پھر میں ایسا سویا کہ صبح کی خبر لی۔ دوسرا دن میں نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزارا۔ سات آٹھ بجے غسل کی اور ایک اُجلا جوڑا پہنا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے حویلی کی طرف چل پڑا۔ میرے دل و دماغ پر سحر سا طاری تھا۔ رادھا آج میری ہونے والی تھی۔ اس حسین تصور کی حلاوت نے میرے ذہن میں قرمزی رنگ بکھیر دیے تھے۔ مگر حویلی کے بڑے پھاٹک پر پہنچ کر میں اُداس ہو گیا۔ توقع کے خلاف آج رادھا میرے استقبال کے لیے وہاں موجود نہیں تھی۔ حویلی پر تو آج زیادہ اور ہر طرف ہولناک

ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ در و دیوار سے وحشت برس رہی تھی۔ میں بجھے بجھے دل سے اندر داخل ہوا۔ حویلی کا صدر دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو ٹھٹھک کر رُک گیا۔ وہ ہال جہاں کل تک قیمتی ساز و سامان موجود تھا۔ آج بالکل اُجاڑ اور ویران پڑا تھا۔ میں حیرت سے اس کھنڈر نما ہال کو اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور اس کمرے میں داخل ہوا جہاں رادھا میری ضیافت کرتی تھی۔ پیار لٹاتی تھی لیکن میرے خدا۔ اس کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی سرتاپا لرز اٹھا۔ میری آنکھیں وحشت سے پھٹ گئیں۔ بڑے ہال کے اس کمرے میں بھی کوئی ساز و سامان موجود نہیں تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ اکھڑے ہوئے فرش پر ایک سیاہ رنگ کی ناگن پھن اٹھائے منی سے کھیل رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کل رات میں نے اجگر سانپ کو سرمستی کے عالم میں اس سے کھیلتے پایا تھا۔ وہ منی اتنے ہی سائز کی تھی جو میں نے کل رات اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اجگر سے حاصل کی تھی۔ مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ مجھے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے پلٹا اور بھاگنے کے لیے اپنے بوجھل قدموں کو جنبش دینا چاہتا تھا۔ کمرے میں اچانک گھپ اندھیرا پھیل گیا اور سیاہ ناگن کی پھنکار مجھے اپنے قریب محسوس ہونے لگی۔ وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی اور میرے جسم پر اوپر کی جانب بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اپنی زبان نکال کر میرے جسم کو چاٹنا شروع کر دیا۔ میں نے موت کو اتنے قریب پایا تو بوکھلا گیا۔ پوری قوت سے ناگن کے جسم کو ہاتھوں سے پکڑ کر ایک طرف پھینکا پھر دیوانہ وار باہر کی جانب دوڑنے لگا۔ لیکن تاریکی میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر آ گیا۔ دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنے پرانے والے گھر میں پایا صبح ہو چکی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر بہت قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے کسی قدر ناراضگی سے پوچھا۔

''تم رات کس وقت واپس آئے تھے اور اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔'' میں اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہا۔ میرا ذہن بری طرح اُلجھ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنے پرانے والے گھر میں کس طرح آ گیا۔ حویلی میں گزشتہ رات پیش آنے والا حادثہ کسی ڈراؤنی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو، ظہیر؟'' اسٹیشن ماسٹر نے دوبارہ سوال کیا تو میں جلدی سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اس کو تیزی سے مخاطب کر کے بولا۔

''میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رُک سکتا۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے کہیں بھاگ چلو۔'' اسٹیشن ماسٹر نے مجھے نفرت سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے تم ڈاکوؤں، لٹیروں کے کسی گروہ میں شامل ہو گئے ہو، میں اسی لیے تمہاری اسٹیشن کی ملازمت کے خلاف تھا۔ یہ تم کن لوگوں میں پھنس گئے ہو؟'' اسٹیشن ماسٹر کے لہجے میں تلخی اور ناگواری مجھے بری طرح محسوس ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے میرے متعلق یہ نتیجہ کیوں اخذ کیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ مگر جب اس نے ایک چھوٹا سا صندوق لا کر میرے سامنے رکھا۔ جس میں سونا بھرا ہوا تھا تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر کی ناراضگی کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ میرے سامنے کھڑا سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے سہمے سہمے ہوئے لہجے میں رادھا سے ملاقات کا پورا واقعہ اسے سنا ڈالا۔ اسے میری بات کا بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا مگر وہ مجھے بخوبی جانتا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔

اور اس روز ہی ہم پہلے دہلی پھر بمبئی آ گئے۔ بڑے عرصے سے آج کل میں بمبئی میں مقیم ہوں اس کے بعد کئی بار رادھا کی تلاش میں نرنجن لال کی حویلی کے چکر لگائے مگر وہاں مجھے شکستگی اور ویرانی کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔

رادھا کون تھی؟ ناگن حسینہ یا کوئی اور...... میرے لیے وہ سونے چاندی زمرد جواہرات سے زیادہ قیمتی تھی۔ جو مجھے اس کی ملاقات کے بعد ملے۔ میں نے اُس سے ٹوٹ کر پیار کیا۔ کاش! مجھے رادھا مل جاتی چاہے یہ دولت نہ ملتی، رادھا اور اس کا پیار ضرور ملتا۔ میں شاید کبھی اُسے نہیں بھول پاؤں گا۔

☆☆......☆☆



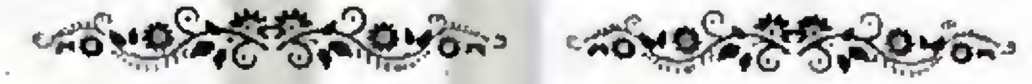
میں...شیش ناگ!



مجید احمد جائی

اُس رات قسمت اُسے ایک نئی دنیا میں لے گئی تھی،

دیکھتے ہی دیکھتے وہ انسان سے شیش ناگ میں تبدیل ہو گیا



اماوس کی رات تھی۔ میں تھکن سے چُور چُور چلا جا رہا تھا۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ بھوک سے مرا جا رہا تھا۔ گھر جانے کے لیے کرایہ نہیں تھا۔ سائیکل پنچر ہو گئی تھی۔ میرا گھر شہر کے مضافاتی علاقے میں تھا۔ اب گھر پہنچنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیا کروں، کدھر جاؤں، کوئی راستہ نہیں سُوجھتا تھا۔ سائیکل کو ہوٹل کے چوکیدار کے پاس بطور امانت چھوڑا اور خود سڑک پر مٹرگشت کرنے لگا۔ چلتے چلتے خیال آیا کیوں ناں شارٹ کٹ راستہ اپنایا جائے۔ صبح واپس آکر چوکیدار سے سائیکل لے لوں گا۔ چاند کی چاندنی جوبن پر تھی۔ میں نے دل کی بات مان لی اور گھر کی طرف شارٹ کٹ راستے سے چل پڑا۔

چلتے چلتے شہر سے کافی دور آ گیا تھا۔ شہر کے باہر پرانا قبرستان تھا۔ مجھے وہاں سے گزرنا تھا۔ رات بھی گہری ہو چلی تھی۔ کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ ڈر سے میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اب کیا کروں؟ میرے پاؤں بھی جواب دے چکے تھے۔ خدارا ہم پہ رحم کرو۔ اب ہم آپ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس دوران میں قبرستان میں داخل ہو چکا تھا۔ اچانک میرے پاؤں کسی چیز سے ٹکرائے اور میں منہ کے بل گر پڑا۔ پرانی قبر تھی۔ جس میں گڑھا سا پڑ گیا تھا۔ گرتے ہی نیم بے ہوش ہو گیا۔

مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اٹھ کر چل سکوں۔ میں قبر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے ستا لوں پھر چلتا ہوں۔ مگر یہ میرا وہم تھا۔ تھکن سے چُور چُور تھا۔ دن بھر کی مشقت سے جسم ٹوٹ رہا تھا اور اوپر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ٹیک لگاتے ہی مجھے اونگھ آ گئی اور میں نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

آنکھ کیا لگی، میری تو دُنیا ہی بدل گئی۔ مگر کیسے...... یہ راز آج میں آپ کو بتا رہا ہوں۔

تھکن کی وجہ سے نیند نے آڑے ہاتھوں لیا۔ مگر میں تو کسی اور دُنیا میں چلا گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، پورے کا پورا شہر تاریکی کی بُکل اوڑھے ہوئے خاموش کھڑا ہے۔ دُور دو دیے روشن ہیں، ہوا ان سے مستی کر رہی ہے۔ میں ان دیوں کی طرف چل پڑا۔ عجیب کشش تھی، جو مجھے اس طرف کھینچے چلی جا رہی تھی۔ میرے قدم بے اختیار اسی طرف اٹھ رہے تھے۔ دُور جلتے دیے مجھے بھلے لگ رہے تھے۔ مجھے ان



پہ پیار آ رہا تھا۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنا حالِ دل سنانا چاہتا تھا۔ ان کی سننا چاہتا تھا۔ کوئی طاقت مجھ اس طرف لے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا میرے قدم زمین پر نہیں لگ رہے اور میں ہواؤں میں اڑتا ہوا منزل کی طرف گامزن ہوں۔ مگر یہ کیا سفر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ میں جلدی جلدی ان دیوں کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں، جتنا سفر کرتا ہوں، دیے اتنے ہی دور نظر آتے ہیں۔ آخر یہ سفر کب ختم ہو گا۔ مسافت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ خدارا یہ مسافت کب ختم ہو گی۔ ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ مجھے سیڑھیاں نظر آئیں۔

سیڑھیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ سیڑھیوں کے آخر میں دیے، ٹمٹما رہے ہیں۔ میں ان کو بجھنے نہیں دوں گا۔ ہاں دیے مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کو ہمیشہ جلتے ہی رہنا چاہیے۔ میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔ سیڑھیوں کی لمبی قطار تھی۔ اُف اتنی طویل سیڑھیاں، میں کس دیس آ گیا ہوں۔ سفر ختم ہی نہیں ہوتا۔ کہیں میں اپنی دُنیا چھوڑ کر کسی اور دُنیا میں تو نہیں آ گیا۔ ن...... نہیں ...... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تو اپنی دُنیا میں ہوں۔

آخر یہ سیڑھیوں کا سفر کب ختم ہو گا۔ میں ان دیوں کے پاس کب پہنچوں گا۔ لو آخر سیڑھیاں ختم ہو رہی ہیں، بس دو چار...... وہ رہے دیے۔ میری منزل۔

جیسے ہی میں نے دیکھا کہ دیے زیادہ دور نہیں رہے۔ میں ہاتھ پھیلانے پر ان کو باآسانی حاصل کر لوں گا۔ میرے پاؤں پھسل گئے۔ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ میرے گرتے ہی یکایک زوردار دھماکہ ہوا۔ میں ڈر گیا۔ ڈر اور خوف سے میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اب کیا ہو گا۔ زوردار دھماکے کے ساتھ ہی ہر طرف دھواں ہی دھواں چھا گیا۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ دیے کہیں کھو سے گئے تھے۔ اور نجانے میں کہاں کھڑا تھا۔ میں سنبھل تو گیا مگر میری ٹانگیں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ زندگی جیسے ختم ہوئی کہ اب

ہوئی۔ میں خود کو موت کے حوالے کرنے ہی والا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا کہ روشنی کی کرن نمودار ہوئی اور پھر ..... دروازے کھلتے چلے گئے۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی۔

ارے یہ کیا ...... میں خوبصورت ہال، پھر میں نے خود کو ایک خوبصورت، شاندار محل میں کھڑا پایا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی، اپنی زندگی میں ایسا خوبصورت عالی شان محل کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میری نظریں محل کی خوبصورتی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسی لمحے نسوانی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''خوش آمدید۔ میری جان، میرا پیار آیا......''

میری نظریں نسوانی آواز کی طرف اٹھ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے میں گرتے گرتے بچا۔ اتنی خوبصورت لڑکی، کیا حسن و جمال تھا۔ ہیرے کی طرح چمکتا جسم، حسن انگ انگ سے چھلک رہا تھا۔ کیا قیامت خیز آنکھیں تھیں۔ گھنی زلفیں، لال گلابی ہونٹ، کس کس انگ کو احاطہ تحریر میں لاؤں۔

پہلی نظر میں ہی، میں اس پہ قربان ہونے لگا۔ میں خاموش کھڑا اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہا تھا۔ لڑکی چلتی ہوئی آئی اور سامنے بنے تخت پر بیٹھ گئی۔ اتنی میں دو اور لڑکیاں پنکھ لیے آ گئیں۔ ایک اس مہ جبیں کے دائیں اور دوسری بائیں کھڑی ہو کر پنکھ ہلانے لگیں۔

ان کے سروں پر زیورات سے جڑے تاج تھے۔ ہر لڑکی کا تاج دوسری سے مختلف تھا۔ جس حسینہ نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ وہ تخت پہ بیٹھی مجھے گھورے جا رہی تھی۔ ان کی نظریں مجھ پہ مرکوز تھیں۔

میرے انگ انگ کا جائزہ لے رہی تھی اور میں پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی عجیب سی تھی۔ اس روشنی میں ڈوبتا جاتا تھا۔ اتنے میں مہ جبیں نے لڑکیوں کو حکم صادر کیا کہ میری جان کو تخت پر بٹھاؤ۔''

پلک جھپکتے ہی دوسرا تخت آ گیا اور مجھے انہوں نے اس تخت پر بٹھا دیا۔ کہیں سے دو لڑکیاں اور آئیں اور انہوں نے حسین خوبصورت موتیوں سے سجا، تاج میرے سر پر سجا دیا۔ میں تماشائی بنا سب دیکھ رہا تھا۔

میری جان کو مشروب پیش کرو۔ پیاس لگی ہو گی۔'' اس نے میرے خشک لب جیسے دیکھ لیے ہوں۔ میں دل ہی دل میں بڑا خوش ہو رہا تھا۔

قسمت مجھ پر یوں مہربان ہو گی، کبھی سوچا نہیں تھا۔ خوبصورت لڑکیاں تو میری کمزوری رہی تھیں۔ آج کی رات خوب گزرے گی۔ میں آگے کے پلان بنا رہا تھا۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ دوسرے ہی لمحے گلاس میں مشروب پیش کیا گیا۔ میری قسمت چمک اٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں نشہ سا چھا گیا۔

میٹھی شریں آواز میں اگر وہ زہر بھی پینے کو کہتی تو میں ہنس کر پی لیتا۔ میں نے لمحہ بھر بھی دیر نہیں کی اور گلاس لبوں کے ساتھ لگا لیا۔ دوسرے گھونٹ پر میری نظریں مشروب پر پڑی۔ یہ کیا!!! اس کا رنگ سبز سا کیوں ہے؟ میں نے پوچھنا چاہا۔

مہ جبیں نے جیسے میرے الفاظ چھین لیے ہوں۔

''میری جان میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔ میری جان ہو تم! آخر میں نے تمہیں حاصل کر ہی لیا۔ تم ہی میری زندگی ہو۔ تم ہی میرے حاصل ہو۔ عمر کا ایک حصہ تمہارے انتظار میں گزار دیا۔ آخر میں نے تمہیں پا ہی لیا۔ یہ مشروب جو تم نے پیا ہے۔

اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ہمارے ہو گئے ہو۔ یہ مشروب نہیں تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ محلول ہے جسے پیتے ہی تم انسان سے سانپ بن جاؤ گے۔'' اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے الفاظ حلق میں دب کر رہ گئے۔ میں کہاں آ گیا تھا۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا، آدھا گلاس تو میں پی چکا تھا۔ محلول میرے اندر چلا گیا تھا اور پھر میں انسان سے شیش ناگ بن گیا۔ ایک دھاکہ سا ہوا، جیسے زمین و آسمان میں کھلبلی سی مچ گئی ہو۔ یہ کیا وہ محل کہاں چلا گیا۔ اب میں کہاں ہوں۔ نہ محل ہے نہ وہ حسن کا پیکر حسینہ۔ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔ اب میں تو ایک درخت کی موٹی شاخ کو چمٹا ہوا تھا۔ میں انسان نہیں۔ شیش ناگ بن گیا۔ مجھے یاد آیا۔

اماوس کی رات۔ میں شاخ سے چمٹا پڑا تھا۔ میرا ذہن کام کر رہا تھا مگر میرا جسم انسانی نہیں رہا تھا۔ خوف ناک شیش ناگ کا روپ آ گیا تھا۔ اب کیا ہو گا۔ میں تو مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ خوف نے میرے چاروں طرف پہرے لگا دیے تھے۔ میرا روں روں کانپ رہا تھا۔

میں کس طاقت کے ہاتھوں قید ہو گیا ہوں۔ یہاں سے چھٹکارہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

سوچوں کی جنگ چھڑ چکی تھی اور میں شاخ کو مضبوطی سے پکڑے چمٹا پڑا تھا۔ اتنے میں گھنگھرو کی جھنکار میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میری نظریں اس آواز کی طرف اٹھ گئیں۔

کوئی حسینہ خراماں خراماں چلی آ رہی تھی۔ سرخ لال لہنگے میں خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ میری طرف ہی چلی آ رہی تھی۔ مگر اس کے پاؤں کہاں ہیں؟ اچانک میری نظر نیچے کی طرف گئی۔ اس کے پاؤں نظر نہیں آ رہے تھے۔ لہنگا نیچے تک تھا، شاید لہنگے نے پردے کا کام کیا تھا۔ مہ جبیں چلتی چلتی میرے پاس آ گئی۔

یہ تو وہی لڑکی ہے جو مجھے محل میں ملی تھی اور اس نے مجھے انسان سے شیش ناگ بنا دیا تھا۔ اب میں اس کی گرفت میں تھا۔

''مہیش کیسے ہو؟'' اس نے آتے ہی پوچھا؟ میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔

''مہیش......'' میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ میرا نام یہ تو نہیں تھا۔ یہ مہیش کیوں پکار رہی ہے۔

''میں مہیش نہیں ہوں؟'' میں نے اس حسینہ کو بتایا۔

''مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تم میرے مہیش ہی ہو جس کا میں نے برسوں انتظار کیا ہے۔ جسے چاہا ہے، جسے پوجا ہے۔ تم ہی میری چاہت ہو، تم ہی میری زندگی ہو۔ اب کوئی تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔'' اس نے لہنگا اوپر کیا۔ یہ کیا۔ میں حیران و ششدر رہ گیا۔ خوبصورت حسینہ کا دھڑ تو سانپ کا تھا۔ اس کا چہرا انسانی اور گردن سے نیچے کا دھڑ سانپ کا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ مجھ پہ کیا کیا راز آشکار ہو رہے تھے۔ میں کہاں آ گیا تھا؟ کہیں میں خلائی، غیر مرئی مخلوق میں تو نہیں آ گیا۔ میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں سوچوں کی مستی میں گم تھا کہ وہ انسانی شکل والی شیش ناگن میرے ساتھ شاخ پر آ گئی۔ میں سہم سا گیا۔ جیسے مجھے شرم سی آ رہی ہو۔ وہ میرا قرب چاہتی تھی۔ اور میں اس سے نجات۔

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ مجھ پہ دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے اس سے التجا کی کہ میں انسان ہوں مجھے انسانی روپ میں واپس بھیج دو۔'' وہ ناراض ہونے لگی۔

ابھی تم میری قید میں رہو گے۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔''

میں انسانی آواز میں بول سکتا تھا۔ لیکن میرا دھڑ شیش ناگ کا تھا۔ میں مصیبت میں پھنس گیا۔ میں نجات چاہتا تھا۔

''میں شیطانی پیداوار ہوں اور تم کون سے دودھ کے دُھلے ہو۔ انسانوں میں رہ کر انسانوں کو ہی نوچتے پھرتے تھے۔ تمہارا کردار غلیظ تھا۔ تم میں ہر بُرائی تھی۔ پھر تم میں اور مجھ میں کیا فرق رہ گیا۔ میں بھی انسانوں کو نقصان پہنچاتی ہوں اور تم بھی۔ تمہارے ہاتھوں سے کتنے انسان زخم کھا چکے ہیں۔ تم کتنے لوگوں کو، معصوم کلیوں کو نوچ چکے ہو۔

مجھ سے بڑے شیطان تم ہی ہو۔ تمہیں شیطانوں میں ہی رہنا چاہیے۔ آؤ ہم ایک ہو جاتے ہیں اور مل کر اشرف المخلوقات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے نجات چاہیے۔'' پھر ایک دم مجھے خیال آیا۔

'ارے ہاں میرے پاس تو تعویذ تھا۔ اس سے تمام بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ مگر اب وہ تعویذ کہاں ہو گا۔ اُس وقت تو میری جیب میں تھا۔ مگر اب میری جیب ہی نہیں تھی۔ میرے اوپر کپڑوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اب کیا کروں۔

میں نے اپنے رب سے لو لگا لی۔ وہی تو ہے جو

مصیبتوں میں یاد بھی آتا ہے۔مشکلوں سے نجات دلاتا ہے۔

''اے میرے رب! مجھے یہاں سے آزادی دلا دے۔جس طرح حضرت یونسؑ علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دلائی تھی۔جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو کیڑوں سے نجات ملی تھی۔طویل بیماری سے شفایابی دی تھی۔میرے رب تُو تو ہر چیز پر قادر ہے۔اپنی رحمتوں سے نواز دے۔مجھے یہاں سے نجات دلا دے۔''میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔

دعا کیسے قبول ہوتی۔میں تو انتہائی کمینہ شخص تھا۔مجھ میں ہر بُرائی تھی۔جھوٹ میں بولتا،رشوت میں لیتا تھا۔کتنے ظلم کیے تھے۔غریبوں کا حق کھایا تھا۔اور تو اور کتنی معصوم لڑکیوں کی عزت تار تار کر چکا تھا۔میں تو انسان کہلانے کا حق دار ہی نہیں تھا۔پھر میری دعا کیسے قبول کی جاتی۔اُس رات بھی میں ایک یتیم لڑکی کو لوٹ کر آرہا تھا۔یہاں تک ہی نہیں میں نے اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔اپنی ہوس پوری کر لی تھی۔اُسے آزاد نہیں کیا تھا۔نیم بے ہوشی میں، میں اسے قحبہ خانہ فروخت کر آیا تھا۔دلال بھی بہت خوش ہوا تھا۔

''کیا مال لائے ہو۔ہیرا ہے ہیرا۔''میں اور خوش ہو گیا۔قحبہ خانے کے دروازے میرے لیے کھل گئے۔رقم بھی ہاتھ آ گئی تھی۔دلال کی آنکھیں بھی چمک اُٹھی تھیں۔

میں کتنا کمینہ انسان ہوں۔چند سکوں کی خاطر ایک معصوم کو فروخت کر دیا۔مجھے انسان نہیں، حیوان سے بدتر کہنا چاہیے۔میں گناہ گار تھا۔شیطانی راستے پر چل رہا تھا۔شاید اسی لیے شیطانوں نے مجھے اغوا کر لیا تھا۔یہ شیطانی طاقتیں ہی تو تھیں۔جنہوں نے مجھے انسان سے حیوان بنا دیا تھا۔میں شیش ناگ بن گیا تھا۔میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔اب مجھے یہاں سے آزادی چاہیے تھی۔

ایک راستہ تھا،وہ راستہ تھا بھلائی کا ،امن کا ،صداقت کا،مگر میں تو کب کا بھول چکا تھا۔اب مجھے خدا یاد آنے لگا،خدا کے نیک بندے یاد آنے لگے۔میں نے توبہ کا صدق دل سے ارادہ کر لیا۔مگر شیش ناگ سے انسان کیسے بنوں۔میرے اندر جذبات ٹھاٹھیں مار رہے تھے۔میرے دل میں اپنے ملتان شہر کے مشہور ولی اللہ کے مزار کی زیارت کا جذبہ جاگا۔میں نے پکا ارادہ کر لیا،وہاں جا کر اس ولی اللہ کے وسیلہ سے رب رحمٰن سے فریاد کروں گا۔دعا میں کروں گا۔اس ولی اللہ کے صدقے رب رحمٰن مجھے معاف کر دے اور میری توبہ قبول کر لے گا۔کوئی طاقت مجھے وہاں جانے کے لیے آمادہ کر رہی تھی۔میرا دل تڑپ رہا تھا۔

جیسے ہی رات کے سائے گہرے ہوئے۔میں نے اس ہستی کی زیارت کے لیے تیاری شروع کر دی۔رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔میں رینگتے ہوئے درخت سے نیچے اُترا اور اس ولی اللہ کے مزار کی طرف رینگنے لگا۔چھپتا،ہوا،منزل کی طرف رواں دواں تھا۔لوگوں سے بھی بچنا تھا،کیونکہ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی بار ڈالنا تھا۔ان کو کیا خبر کہ میں انسان ہوں اور شیطانی طاقتوں نے مجھے شیش ناگ بنا دیا ہے۔میں رینگتے رینگتے آگے کو بڑھ رہا تھا۔

ملتان کی اس مشہور ہستی کے مزار پر دن رات لنگر تقسیم ہوتا رہتا ہے۔دن تو دن ،رات کو بھی دن کا گمان ہوتا ہے۔آج دل کی مانی بڑی اور بے اختیار میں مزار کی طرف رینگنے لگا۔شہر تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔بجلی انکھیلیاں کر رہی تھی۔میں دھیرے دھیرے مزار کی طرف رواں دواں تھا۔گھنٹہ گھر سے مزار کی چڑھائی چڑھتے ہوئے،ملنگ بیٹھے دست سوال کر رہے تھے۔کہیں طوطے سے قسمت کا حال معلوم کروایا جا رہا تھا۔گیٹ کے ساتھ جنگلی کبوتروں کو دانہ ڈالا جاتا ہے اور وہاں ہزاروں کی تعداد میں کبوتر غٹر غوں غٹر غوں کر رہے تھے۔

چاند کی روشنی روئے زمین پر اپنا جادو دکھا رہی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ دن چڑھا ہو۔جگ مگ کرتے ستارے ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔مزار روشنی سے چمک دمک رہا تھا۔

ملتان شریف کا سب سے اونچا مزار یہی ہے بلکہ ملتان کی سب سے اونچی عمارت کا درجہ اسے حاصل ہے۔

میں مین گیٹ کے قریب سے ہوتا ہوا آگے کو بڑھ رہا تھا۔سڑک کے کنارے ننھے ننھے سرسبز پودے لگے ہوئے تھے۔چلتے چلتے میں مزار کے اندر داخل ہو گیا۔رات کو رش قدرے کم ہو گیا تھا۔چند لوگ تھے جو چلہ کاٹ رہے تھے یا منتیں مانے بیٹھے تھے۔چند ایک عبادت میں مشغول تھے۔میں ان کو پیچھے چھوڑتا آگے کو بڑھ گیا۔

میں ایسا راستہ اپنا رہا تھا جہاں سے کسی انسان کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔بڑی احتیاط کرنی پڑ رہی تھی۔آخر میں کامیاب ہو گیا اور مزار کے دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔میں نے مزار پر حاضری دی،قبر نما تعویذ کے اردگرد کتنے چکر کاٹے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا رہا۔میں مزار کے ایک کونے میں اینٹوں میں چھپا دعائیں مانگتا رہا۔یہاں تک کہ صبح صادق کا وقت ہو گیا تو میں واپس اپنی ٹھکانے آ جاتا،جہاں انسانی شکل والی ناگن نے مجھے شیش ناگ بنا دیا تھا۔وہ درخت مزار سے زیادہ دور نہیں تھا۔دُور سے مزار نظر آتا تھا۔اسی طرح مزار پر حاضری میرا معمول بن گیا۔میں دعائیں مانگتا رہا ،معافی مانگتا رہا اور پھر ایک رات میری توبہ قبول ہو گئی۔

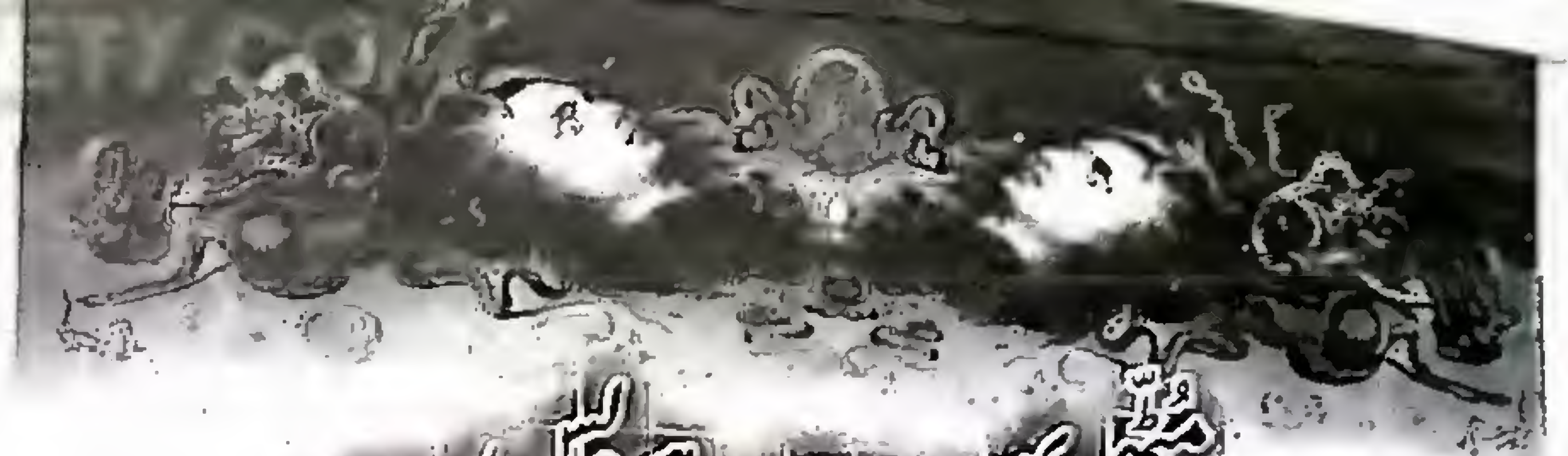
میں دعا کرتے ہوئے رو رہا تھا۔آنسو میری آنکھوں سے چھم چھم برس رہے تھے۔پھر شاید میرے رب کو میرے آنسو پسند آ گئے اور مجھے معاف کر دیا۔میری توبہ قبولیت کا شرف حاصل کر گئی تھی۔میں سسک رہا تھا کہ،زوردار دھماکہ سا ہوا۔ہر طرف دھواں دھواں سا ہو گیا۔پھر تھوڑی دیر کے بعد دھواں ختم ہو گیا اور روشنی پھیلنے لگی تھی۔مجھ میں تبدیلی ہونے لگی۔اور دیکھتے ہی دیکھتے میں شیش ناگ سے پھر سے انسان بن گیا۔ہاں میں انسانی شکل میں آ گیا۔میں نے غیر یقینی طور پر اپنے آپ کو ٹٹولا۔ہاں میں انسانی روپ میں آ گیا تھا۔میری جیب میں تعویذ بھی موجود تھا جو مجھے اس اللہ والے کے خلیفہ نے دیا تھا۔یہ تعویذ ہر بیماری، ہر مصیبت، بلاؤں سے محفوظ رکھنے کا ہتھیار تھا۔پھر......

پھر میری آنکھ کھل گئی۔میں اسی پرانی کچی قبر پر موجود تھا، جہاں سے مجھے ٹھوکر لگی تھی اور ٹوٹی ہوئی ہانڈی قریب پڑی تھی میرے ساتھ شیش ناگ کی اُتری ہوئی چمڑی پڑی تھی۔جو میرے لیے گفٹ تھا۔اس حسینہ کی چمڑی تھی۔،جو مجھ سے لپٹ گئی تھی۔اس کے آخری لفظ میری سماعتوں میں گردش کر رہے تھے۔

آج تم ان دو ولی اللہ کی وجہ سے بچ گئے ہو۔اگر تم اللہ کے ان نیک بندوں کے نہ پاس جاتے،تو ساری زندگی میرے غلام رہتے اور میں تمھیں آخر مار ہی ڈالتی۔میں تمھاری بُرائی تھی جو تم نے انسانوں میں رہ کر کی تھی۔تمہارے یہی گناہ تمہیں عذاب میں مبتلا کر رہے تھے۔میں تیرا عذاب ہی تھی۔شکر کرو تیرے رب نے تجھے بھلائی کا راستہ دکھا دیا اور بُرے انسان سے اچھے نیک بن گئے۔

میں ٹوٹی پرانی قبر پر حیران کھڑا تھا۔خوف سے میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔واقعی میں بہت بُرا انسان تھا، جانے انجانے میں بہت گناہ کر لیے تھے۔اب رب رحمٰن نے مجھے توبہ کا راستہ دکھا دیا تھا۔صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تسکین دے رہی تھی۔میں قبرستان سے واپس ہو لیا اور سیدھا ان مزارت کی طرف چل پڑا، جو رات کو میں نے دیکھے تھے۔میں وہاں سے حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی اور شاہ رکن عالم کے مزارات پر آیا اور حاضری دی ، پھول چڑھائے اور فاتحہ خوانی کرنے کے بعد اپنے اور تمام عالم اسلام کی بھلائی کی دعائیں مانگیں۔آج میں بُرے انسان سے نیکی کی طرف راغب ہو گیا ہوں اور زندگی خوش گوار گزر رہی ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔یہ پیار ہی تو ہے جو مجھے غلط راستے سے راہ راست پر لے آیا۔

☆☆......☆☆



مٹھی بھر ریت ہے بس...



محمد یوسف لغاری

زہر بھری دنیا سے ایک بالکل منفرد کتھا، ایسی تحریریں کبھی کبھی ہی منظر عام پر آتی ہیں

موسم اتنا خراب ہو جائے گا مجھے بالکل علم نہیں تھا ، یکدم تیز آندھی پھر تیز چمک بجلی کے ساتھ بارش ، اگر کل منسٹر کا دورہ نہ ہوتا میں موسم کے تیور دیکھ کر کب کا نکل آتا، اس دوران گھر سے محترمہ کا دوبار فون آچکا تھا۔ وہ موسم سے اور گھر پر بچوں کے ساتھ اکیلی پریشان ہو رہی تھی۔ مگر ابھی میرا رکنا مجبوری تھی کل کے دورے کے حوالے کی سیکورٹی انتظامات کی رپورٹس وصول کر کے پھر ان کو ہیڈ آفس روانہ کرنا تھا اور اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرنا تھی اور نہ کسی اپنے اسسٹنٹ کے حوالے یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے آخری رپورٹ فائنل کی، اس کو کنفرم کیا اور گھر کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے جیسے ہی نکل کر کار سٹارٹ کی اس نے صدائے احتجاج بلند کیا اور بیٹری ختم کا عذر پیش کیا اور سٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ مجھے بھی علم تھا کہ اس کی بیٹری ختم ہے اس لیے میں نے مزید پنگا بازی سے گریز کیا اور کار نائٹ شفٹ والوں کے ذمے لگائی اور اس خطرناک موسم میں باہر آ کر دیکھا تو تھوڑا دور ایک رکشے والا نظر آیا، جلدی سے اس کی جانب بڑھا، اپنی تلاش منزل بتائی جو کہ کافی دور تھی مگر فوراً جانے پر راضی ہو گیا۔ رکشے میں بیٹھنے کے بعد ابھی ہم تھوڑا ہی دور گئے تھے کہ موسم نے اپنے جوہر دکھانا شروع کر دیے، یکدم تیز بارش اور ساتھ ہی بہت تیز ہوا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے ابھی یہ تیز ہوا ہمارے رکشے کو اٹھا کر دور پھینک دے گی مگر لگتا تھا وہ رکشہ ڈرائیور بھی بہت ایکسپرٹ تھا اور ہم اللہ کے کرم سے اپنی منزل پر خیر و عافیت سے پہنچ گئے۔ اس وقت رات کافی ہو چکی تھی، میں نے اس کو ایک بڑا نوٹ دیا مگر رکشہ والا کے پاس کھلے نہیں تھے تو وہ بولا صاحب میرے پاس چھٹے نہیں ہیں۔''

''اچھا ایک منٹ رکو میں گھر سے لا کر دیتا ہوں۔''

میں جیسے ہی کھلے پیسے لے کر باہر نکلا تو وہ رکشے والا باہر موجود نہیں تھا۔

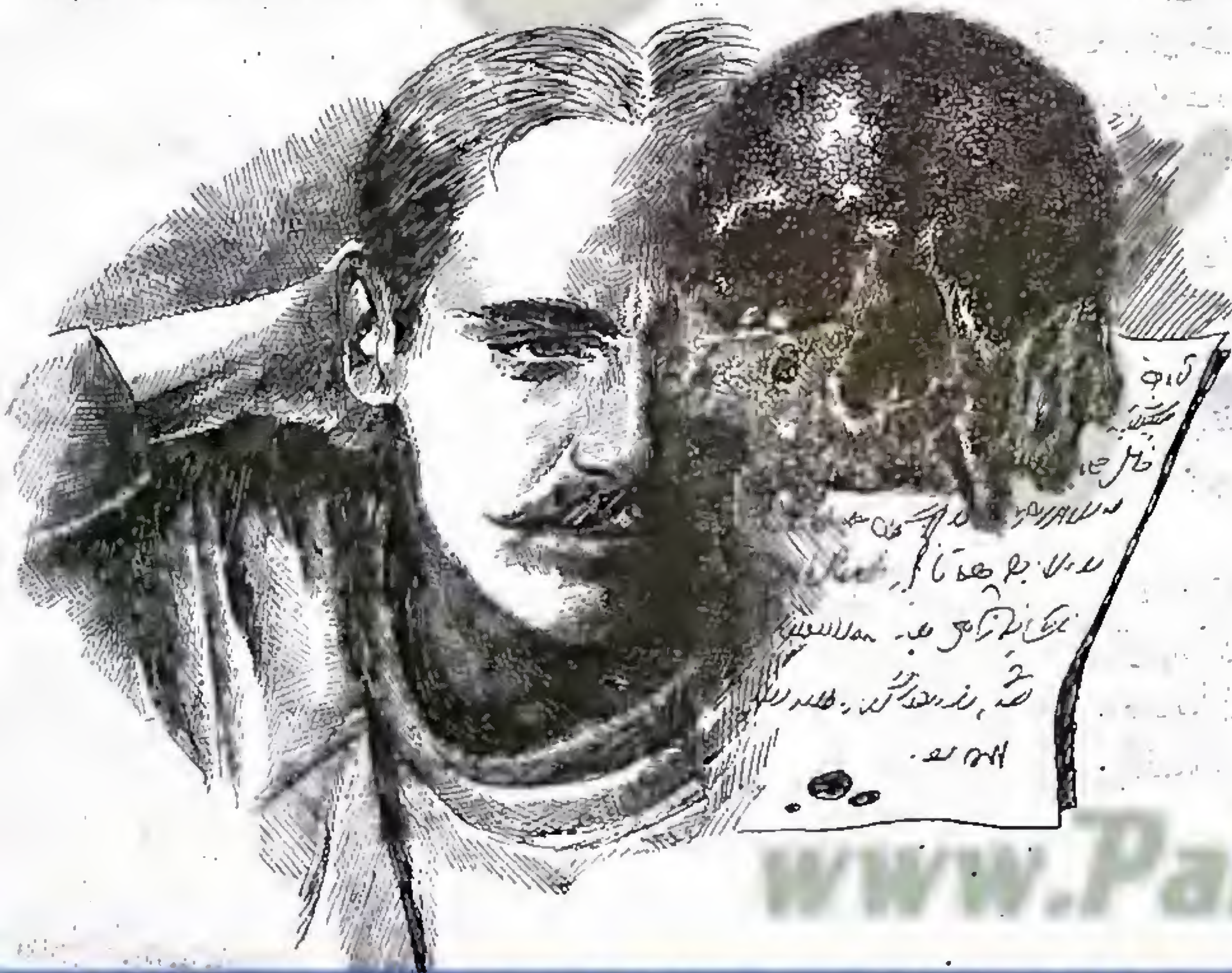
''کمال ہے یہ کہاں گیا۔'' میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا مگر اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا اچانک میری نظر زمین پر گری ایک مورتی پر پڑی۔

''چاچا رسول! بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور ہلکی سی خوف کی سنسناہٹ میرے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ آج شاید وہ مجھ سے روپ بدل کر تقریباً چھ ماہ بعد ملا تھا۔ اور آج سے گزری ہوئی کئی سال قبل بالکل اس طرح کی خوفناک رات کی یاد ایک مرتبہ پھر مجھے آتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی وہ رات مجھے یاد آتی ہے تو بے اختیار مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ وہ دوست بھی یاد آجاتے ہیں، جن کے ساتھ بچپن کی معصوم یادیں گزری تھیں۔ ہم سب اکٹھے سکول جاتے تھے اور پھر سب کا واپس آ کر اکٹھے کھیلنا اور شرارتیں کرنا مگر اب وہ وقت نہیں تھا اور ایک آدھ ساتھی میرے ساتھ موجود تھے مگر اُن کو اس قصے کی بابت کچھ علم نہ تھا بس کچھ معلوم تھا تو مجھے اور ایک مرکزی کردار تھا جو میرا ایک گہرا دوست بھی تھا مگر اس کے بارے کسی کو کچھ معلوم نہ تھا وہ کہاں ہے حتیٰ کہ مجھے معلوم بھی نہ تھا۔ وہ روپ بدل بدل کر مجھے اس طرح ملتا کہ میں کبھی بھی اس کو پہچان نہ پاتا تھا۔

ہم سب دوستوں نے ایک ہی محلے میں آنکھ کھولی، میں سلیم، میرے دوست اکبر، سلیمان، غفار، ہم سب ایک جان دو دو قالب کی مثال ہوا کرتے تھے آس پاس گھر تھے۔ سب اکٹھے سکول جاتے پھر سب اکٹھے ہی واپس آتے۔ ہم سب کے گھرانے اتنے امیر نہیں تھے تو اتنے غریب بھی نہیں تھے مگر ہم سب کے والدین کی خواہش تھی کہ ہم سب پڑھ لکھ جائیں مگر وہ زمانہ بے فکری کا تھا۔ ہم ایک کان سے سنتے اور دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ مگر ایک بات تھی کہ میں اپنے باقی دوستوں کی نسبت کم شرارتی تھا۔ میرے باقی دوست کبھی کبھار شرارتوں میں اس حد تک بڑھ جاتے کہ بدتمیزی کا گمان ہونے لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی ہمارے محلے میں ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا۔ ہم جب پیدا ہوئے تو جہاں تک یاد ہے اس کو ایک ہی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ بس بزرگ ہی چلا آ رہا تھا نہ اس کا کوئی رشتہ دار تھا نہ وہ کسی سے کہیں ملنے جاتا تھا۔ اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ محلے والے سب مل کر اسکو روٹی دیتے تھے۔ اس کا نام تو چاچا رسول تھا مگر سب اس کو چاچا تمباکو کے نام سے بلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ نام میرے دوستوں کی زبان پر بھی چڑھ گیا۔ بس پھر کیا تھا میرے یہ دوست اس کے گھر سے جیسے بھی گزرتے ایک دوست زور سے نعرہ لگاتا 'چاچا تمباکو' تو باقی دوست زندہ باد کا نعرہ لگاتے، جس سے چاچا رسول بہت چڑتا اور غصہ کرتا تھا مگر میرے دوستوں کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ تو اس پر ایک دفعہ اُس نے میرے والد کو میری شکایت لگا دی جس پر ابو







نے میری خوب پٹائی لگائی۔ میں نے بہت کہا میں اس حرکت میں شامل نہیں ہوتا مگر ابو نہ مانے کہ اگر تو اُن کا دوست ہے تو لازمی ہے کہ اس حرکت میں شامل بھی ہوگا۔ وہ اس محلے کا بزرگ ہے، اس کی عزت کیا کرو اور ساتھ ہی بڑوں کی عزت کے بارے میں اچھا خاصا سبق بھی دیا۔

مجھے اس بات پر بہت غصہ تو تھا کہ میری بلاوجہ کی پٹائی ہوئی کیونکہ اس وقت میں آٹھویں کلاس میں تھا تو یہ پٹائی مجھے بہت بُری لگی تھی۔ اسی وجہ سے میں دوسرے دن خود ہی چاچا رسول کے گھر پہنچ گیا۔ اس کو جا کر ساری حقیقت بتائی تو چاچا فوراً کہنے لگے۔

''بیٹا مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ آپ وہ نعرہ نہیں لگاتے۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔'' اتنا کہنے کی دیر تھی چاچا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میں یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا گیا اور فوراً گھر آگیا مگر آتے ہوئے یہ دیکھا تھا کہ وہاں تمبا کو کے کافی سارے پودے اُگے ہوئے تھے تو مجھے پتا چلا کہ چاچا کا نام، چاچا تمبا کیوں ہے اور محلے کے سب بچے اس کو اُلٹے نام سے کیوں پکارتے ہیں۔

میں دوسرے دن پھر چاچا کے پاس پہنچ گیا۔

''چاچا کل آپ رونے کیوں لگ گئے تھے۔'' میں سوال کیا۔

''بیٹا جب غلطی کا احساس ہوجائے تو اینا ہی ہوتا ہے۔''

''اچھا چاچا آپ اکیلے رہتے ہیں۔''

''نہیں بیٹا میں اکیلا کہاں رہتا ہوں میں ......'' وہ اس کے آگے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر خاموش ہوگئے۔

اس طرح ہر روز چند باتیں ہوتیں اور میں واپس آجاتا۔

آہستہ آہستہ چاچا رسول کے ساتھ میری دوستی کافی مضبوط ہوگئی۔ میرے گھر میں جو بھی اچھی چیز پکتی میں چوری چوری لے آتا اور چاچا رسول کو دے جاتا اس سے وہ بہت خوش ہوتے اور مجھے بہت ساری دعائیں دیتے ہوئے بولتے کہ بیٹا تم بہت ترقی کروگے۔''

میں میٹرک کے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گیا اس لیے چاچا رسول سے ملنے میں وقفہ آگیا۔ میں چند دن بعد ان کے پاس گیا تو چاچا رسول میرے دوستوں سے بہت خفا تھے اور گلہ کرنے لگے کہ یہ پہلے تو معصوم تھے اب تو بڑے ہوگے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شرارتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ ان کو چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں ہے۔ ان کو بولو کہ اپنی حرکتیں بند کردیں۔ معصوم اور فقیر لوگوں کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں۔ ورنہ یہ زندگی میں ناکام اور برباد ہوں گے۔''

''جی چاچا میں اُن کو سمجھاؤں گا اور میرے پرچوں کے لیے دعا کیجیے گا۔''

پھر پتا ہی نہ چلا کہ میرے پیپر ختم ہوگئے۔ اُن دنوں فراغت تھی تو میں اکثر چاچا رسول کے پاس چلا جاتا۔ میں نے اک دن پوچھا کہ چاچا آپ کے کوئی رشتہ دار وغیرہ نہیں ہیں یا آپ اُن سے ملنے نہیں جاتے یا آپ سے کوئی ملنے نہیں آتا۔''

تو چاچا نے کہا بیٹا ہم عراق کے رہنے والے تھے اور وہیں کے قدیم آشوری قبائل کے ہم نسل تھے۔ وہ سانپوں کی پوجا کرتے تھے۔ ہم بھی دن رات سانپوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور کسی طرح گھومتے پھرتے اِدھر آگئے۔''

''اچھا آپ سانپوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ کیسے؟؟'' میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

''بیٹا میں نے تو سانپوں کے ساتھ چلے بھی کاٹے ہیں مگر بعد بتاؤں گا لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم کسی کو بتاؤں گے نہیں۔''

''جی چاچا میں وعدہ کرتا ہوں میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹا مگر ابھی نہیں، جب میرا ارادہ ہوگا تو میں خود ہی بتادوں گا۔ تم خود مت پوچھنا ورنہ میں نہیں بتاؤں گا۔'' چاچا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

ہمارا میٹرک کا رزلٹ آگیا تھا میں نے حیران کن طور پر پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی اور میرے دوست واجبی نمبروں سے پاس ہوئے تھے۔ اب مجھے اسکالرشپ پر شہر پڑھنے کے لیے جانا تھا اور وہاں سے ایف ایس سی کرنا تھی۔

میرے دوست میری اس کامیابی سے ناخوش

تھے۔ جب میں ان کو یہ خوش خبری دینے کے لیے گیا تو بھڑک اٹھے اور فوراً کہنے لگے کہ یہ سب تمہارے اس چاچا کی وجہ سے ہوا ہے۔'' مگر میں نے ان کی بات ان سنی کردی اور ان کو سمجھانے لگا کہ یوں چاچا کو تنگ نہ کیا کرو۔ وہ بزرگ آدمی ہے۔ پورا محلہ اُن کی عزت کرتا ہے۔ وہ آپ سے سخت ناراض ہے۔'' مگر میری اس بات کا ان پر کوئی اثر نہ پڑا۔

ہم سب نے الگ الگ کالج جوائن کرلیے کیونکہ یہیں سے سب نے زندگی کی راہیں متعین کرنی تھی۔ اب میری دوستوں سے ملاقاتیں کم ہی ہوتی تھیں۔

البتہ وہ سب ایک دوسرے کو ہر روز ٹائم لازمی دیا کرتے تھے۔ کیونکہ میں شہر میں ہی مقیم ہوگیا تھا اور مہینے میں ایک یا دو بار گھر آتا اور چاچا سے تھوڑی دیر ملاقات ہوتی اور دوستوں سے بہت کم ملاقات ہوتی۔

میں جب بھی آتا تو چاچا کا ایک ہی گلہ ہوتا کہ تمہارے دوست مجھے اب کچھ زیادہ ہی تنگ کرنے لگ گئے ہیں۔ میں صرف خاموشی میں ہی سر ہلا کر رہ جاتا۔

اس بار میں ہوسٹل واپس آیا ہی تھا کہ ابو مجھے تیسرے دن لینے آگئے۔ پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں نے پوچھا کہ سب خیریت تو ہے انہوں نے کہا کہ تمہارے دوستوں کو آج تیسرا دن ہے وہ سب کے سب غائب ہیں۔''

''کیا غائب ہیں؟ کیا اغوا ہوگے ہیں، کیا کہہ رہے ابو آپ!''

''بیٹا کچھ پتا نہیں تم گھر تو چلو۔'' ابو نے پریشانی سے کہا۔

''اچھا اور چاچا رسول۔'' میں نے کچھ سوچے سمجھے بنا پریشانی سے کہا۔

''کیا کہا تم نے، اس کا تم نے کیوں پوچھا۔'' ابو نے فوراً پوچھا۔

''نہیں میں نے تو بس ویسے پوچھا ہے۔'' میں گڑبڑا سا گیا تھا۔

''محلے میں وہی تین اس کو تنگ کرتے تھے۔ اب تم نے بھی اس کا پوچھا ہے۔ ویسے بھی محلے والوں کو پہلے بھی اس پر شک ہے۔''

خیر ہم گھر پہنچ گئے۔ سب محلے والوں نے مشاورت کرکے پولیس کو خبر دی اور چاچا پر شک کا اظہار کیا۔

معاملہ تین نوجوانوں کا تھا، پولیس آئی اور فوراً چاچا رسول کو پکڑ کر لے گئی۔ اس سے تفتیش ہوتی رہی۔ چاچا کے ساتھ میرا تعلق ایک انسیت کا تھا۔ اس کے جیل جانے پر مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہ بھی سنا کہ اس کی تھوڑی مارکٹائی بھی ہوئی مگر کچھ ثابت نہ ہوا کیوں کہ کسی نے چاچا کو کہیں نہ آتے جاتے دیکھا تھا نہ اس سے کوئی ملنے آیا تھا۔

ثبوت ناکافی ہونے کی وجہ سے چاچا ایک ہفتہ بعد چھوٹ کر گھر واپس آگیا۔

میں چاچا سے ملنے تو نہ جاسکا مگر میں نے دور سے اُن کو دیکھا تو وہ رنجیدہ ضرور تھے۔

مگر ابھی تک اکبر، سلیمان، غفار کی گمشدگی کا معاملہ وہی تھا۔ ان سب کے والدین کا برا حال تھا، پولیس ہر جگہ تلاش کرچکی تھی مگر ان کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

اس طرح چند دن اور گزر گئے پھر ایک دن پتا چلا کہ چاچا رسول بھی غائب ہیں۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جس نے پورے محلے کے ہوش اُڑا دیے اس لیے پولیس کو پھر خبر دی گئی پولیس نے آکر اس کے مکان کی اچھی طرح تلاشی لی مگر وہاں سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا سوائے چند مردہ سانپوں اور سانپوں کی سورتیوں کے۔ ان میں چند مورتیاں ٹوٹ چکی تھیں اور کچھ درست حالت میں تھیں پولیس نے ٹوٹ پھوٹ والا سامان وہیں رہنے دیا اور درست مورتیاں اپنے قبضے میں ساتھ لے گئے اور تفتیش کا دائرہ کار وسیع کردیا مگر دن ہفتوں پر، ہفتے مہینوں پر محیط ہوگئے، اُن تینوں کا کچھ پتا نہ چلا۔

چاچا رسول کے مکان سے چند مردہ سانپوں اور سانپوں کی مورتیاں نکلیں تو اس سے محلے والوں کے کان کھڑے ہوگئے کہ معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔ تو انہوں نے ایک مشہور عامل کو بلایا جو سانپوں کے ساتھ جنات کے علم پر عبور رکھتا تھا۔ اس نے چاچا کے کمرے کے اندر بیٹھ کر مورتیوں پر اپنا کام شروع کردیا۔ کافی دیر وہ کچھ پڑھتا رہا۔ ہم سب محلے والے باہر انتظار کرتے رہے۔ پھر کمرے میں دھواں بھر گیا پھر دھواں ختم ہوگیا تو اچانک وہ عامل چیختا ہوا باہر نکلا آیا۔ عامل بابا کا ایک

گال سرخ ہو رہا تھا۔ محلے والے اس سے پوچھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی سانس بحال ہوئی تو اس نے کہا کہ یہ چاچا ایک سانپ نما جن ہے جو بہت طاقتور ہے۔ اس کا تعلق کسی سانپوں کے قبیلے سے ہے۔ میں نے بہت کوشش کر کے آپ کے نوجوانوں تک رسائی کرنے کی کوشش کی ہے مگر مجھے واضح پتا نہیں چلا۔ اس نے مجھے زور دار تھپڑ مار کر ہٹا دیا ہے۔ میرا علم اس سے کم ہے۔''

اس کے بعد کئی اور مشہور عاملوں کو لایا گیا مگر ان کا حشر بھی یہی ہوا تو دیگر نے آنا چھوڑ دیا۔ پولیس اپنی طرف سے کوئی سراغ نہ لگا سکی۔

مگر جب عامل یہ بات بتاتے تو مجھے چاچا رسول کی یہ بات یاد آجاتی کہ ہم دن رات سانپوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلتے تھے پھر حالات نے پلٹا کھایا اور کسی طرح گھومتے پھرتے ہم اِدھر آگئے میں نے تو سانپوں کے ساتھ چلے بھی کاٹے ہیں مگر بعد میں بتاؤں گا مگر تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔''

مگر قسمت نے ہم دونوں کو مہلت ہی نہیں دی تھی کہ یہ احوال بانٹ سکتے۔

تاہم محلے کے کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال تھا یہ تینوں دوست روزگار کے لیے کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔ اور چاچا کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ چونکہ ہم نے اس کو پولیس کے حوالے کر کے تنگ کیا ہے تو وہ یہ محلّہ چھوڑ کر چلا گیا ہے، اور یہ عامل محض اپنی روٹی بنانے کے لیے ہیں پاگل بنا رہے ہیں، غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔

☆......☆......☆

اس بات کو آٹھ سال گزر گئے۔ میرے دوست زندہ سے مسنگ پرسن ہو گئے تھے۔ ان کا بالکل کچھ پتا نہ چلا۔ ان کے والدین اور گھر والے بے چارے روتے دھوتے خاموش ہو گئے تھے۔ چاچا کے مکان بارشوں نے تقریباً ڈھا دیے تھے۔ اب وہ رات کو خوف پیدا کرتے تھے مگر پھر بھی ابھی اس کے کمرے کے آثار باقی تھے۔ لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے تھے مگر نہ جانے کیوں مجھے اس جگہ سے کبھی خوف نہیں آیا تھا مجھے اس سے ایک خاص قسم کی انسیت تھی۔ ایک پیار، ایک لگاؤ تھا۔ میرا دل کرتا تھا میں جا کر اس مکان میں بیٹھ کر چاچا کی یادوں سے باتیں کر دوں مگر یہ سب محلے والوں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔

میں نے ماسٹر کر لیا تھا اور اب ایک سرکاری دفتر میں آفیسر تھا۔ ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ ہم ابھی تک محلے میں ہی رہائش پذیر تھے۔ ایک رات کا واقعہ ہے کہ آفس میں کام بہت زیادہ تھا۔ مجھے نکلتے ہوئے بہت زیادہ دیر ہو گئی۔ میں جب آفس سے نکلا تو موسم بے حد خراب تھا میں نے جلدی سے رکشہ لیا اور اس کو اپنے محلے کا ایڈریس بتایا۔ میں جب اپنے محلے کی سڑک پر اتر کر گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ہمارا گھر چونکہ کچھ فاصلے پر تھا کہ اچانک شدید ژالہ باری شروع ہو گئی اور یہ اتنی شدید تھی کہ مجھے اپنے جان اور سر کے لالے پڑ گئے کیوں کہ ساتھ کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ میری نظر اچانک چاچا کے مکان پر پڑی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دوڑتا ہوا فوراً اس کے اندر گھستا چلا گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے تاریکی کو دور کرنے کے لیے سگریٹ پینے والا لائٹر نکالا اور اس کے ایک طرف لگی ٹارچ کو جلا لیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اندر دیواروں پر جالے لٹکے ہوئے تھے۔ فرش پر کاغذ بکھرے تھے۔ میں نے کاغذوں کو اِدھر اُدھر کرنا شروع کر دیا۔ اچانک ان کاغذات میں سے ایک کارڈ نکل آیا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ وہ اسٹوڈنٹ کارڈ تھا۔ اس پر اکبر کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں نے خوف کے مارے جلدی سے اس پڑے ہوئے گند میں ہاتھ مارنا شروع کر دیا کہ اچانک دو اور کارڈ نکل آئے میں نے جلدی سے ان پر لائٹ ماری ایک پر سلیمان اور دوسرے پر غفار کی فوٹو چسپاں تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا کہ مطلب اس کے پیچھے چاچا رسول کا ہاتھ تھا۔ مجھے اس وقت بہت غصہ آیا کہ یہ حرکت اس نے کیوں کی، میں نے لائٹ کو کمرے کے پچھلے حصہ کی طرف کی تو مجھے ایسا لگا جسے یہ کمرا کوئی چھوٹا نہ ہو بلکہ بہت بڑا ہو۔ میں ڈرتے ڈرتے اندر بڑھا۔ جب میں اندر گیا تو ایک عجیب اور ڈراؤنا منظر میرے سامنا تھا۔ اندر تین پنجرے پڑے ہوئے تھے، جس میں میرے دوست قید تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ساتھ ہی ایک طرف

چاچا رسول بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

''چاچا تم !!!!!'' خوف سے میرے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔

''ہاں بیٹا، میں۔'' وہ بولے، وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے کئی سالوں پہلے تھے بالکل صحت مند۔

''مگر چاچا تم نے ان کو اغوا کیوں کیا تھا۔ ان کا کیا جرم تھا۔ میں نے آہستہ سے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔''

''بیٹا تمہیں یاد ہوگا ایک دفعہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہم دن رات سانپوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلتے تھے پھر حالات نے پلٹا کھایا اور گھومتے پھرتے ہم ادھر آگئے اور میں نے تو سانپوں کے ساتھ چلے بھی کاٹے، یاد ہے نا بتایا تھا نا۔''

''جی جی یاد ہے۔''

تو یہ آج سے کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ ہم دو قبائل ہوا کرتے تھے۔ ہمارے پاس ہمارے آباؤ اجداد کا دیا ہوا پانی جس کو ہم ''رازحیات'' کہتے ہیں وہ ہمارے پاس موجود تھا۔ وہ ہم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرتے جو کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوتا جس کا علاج ناممکن ہوتا تو ہم جا کر اس کے زخم میں لگا دیتے جس سے وہ ٹھیک ہو جاتا، اور یہ پانی ہمارے ایک جن کو حکم ہوتا کہ صرف وہی پی سکتا تھا اور وہ پانی میں نے بھی پیا ہوا تھا۔ پھر اچانک ہمارے دشمن قبائل کو اس بات کی خبر پڑ گئی کہ یہ پانی ہمارے پاس ہے۔ وہ اس پانی کو غلط مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے تو ایک دن انہوں نے اپنے طاقت ور جنوں کے ساتھ ہم پر حملہ کر دیا۔ اس دن بدقسمتی سے ہمارے کچھ ساتھی کہیں گے ہوئے تھے اس حملے میں میرے والد بھی مارے گئے مگر انہوں یہ پانی بطور امانت مجھے دیا کہ مرتے دم تک اس کی حفاظت کرنا۔ میرے والد نے ایک منتر کے ذریعے میرے گرد حصار باندھ دیا۔ میں کسی طرح یہاں آگیا اور اس حلیے میں رہنے لگا۔ میں نے اپنے علم کے ذریعے پتا کیا تو مجھے پتا چلا کہ میرے خاندان کا ایک بھی فرد زندہ نہیں بچا تھا اور میرے اردگرد حصار ہونے کی وجہ سے میرے مخالف مجھے تلاش بھی نہیں کر پا رہے تھے اور پھر میں رفتہ رفتہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ چاچا نے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

''لیکن چاچا اس سے ان تینوں کا کیا تعلق۔'' میں حیرانگی سے پوچھا۔

''بیٹا تعلق ہے اصل میں یہ مجھے تنگ کرنے کے لیے رات کو آتے تھے۔ ایک دفعہ راز حیات کم ہو گیا تو میں اپنے مؤکلوں کے ساتھ ہم کلام تھا۔ انہوں نے میری ساری گفتگو سن لی اور ان کو سارا پتا چل گیا کہ میں اور میری حقیقت کیا ہے۔ پھر ایک دفعہ میں چلے میں مصروف تھا۔ اب چلہ بالکل خاموشی کے ساتھ کرنا تھا اس کو توڑنا نہیں تھا۔ انہوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور سارا 'راز حیات' اٹھا کر پی گئے۔ اس لیے میں نے مجبوری سے ان کو پکڑا اور جب میں نے پوچھا کہ تم نے راز حیات کیوں پیا تو انہوں نے کہا کہ وہ بھی انسانیت اور دنیا کی فلاح کے لیے کام کرنا چاہتے تھے۔'' چاچا نے کہا۔

''اچھا تو آپ نے ان کو اس جرم میں اغوا کر لیا کہ یہ آپ کا رازِ حیات پی گئے تھے لیکن کیا پتا یہ واقعی انسانیت اور دنیا کی فلاح کے لیے کام کرنا چاہتے ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بیٹا تم بھی نا بھولے ہو۔ بھلا آج تک ایسا ہوا ہے کہ کسی انسان کے پاس کوئی جناتی طاقت آئی ہو اور اس نے اس کا درست استعمال کیا ہو۔ آپ اپنی دنیا کے لوگوں کو ہی دیکھ لو، جس کے پاس ذرا سی طاقت ہے یا ذرا سا امیر ہے، وہ غریب پر چڑھائی کرنے کو بیٹھا ہے۔ تمہاری دنیا کے لوگوں نے فانی طاقت کے نشے میں آج تک کتنے بے گناہ معصوموں کو بارود کی بھینٹ چڑھایا ہے۔ شاید ہی کسی دوسری مخلوق نے یہ کام کیا ہو۔'' چاچا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''لیکن چاچا اب میرے دوستوں کی حالت کیسی ہے۔ وہ زندہ ہیں یا نہیں اگر زندہ تو ان کو جانے دو۔ ان کے لیے اتنی سزا کافی ہے۔''

''ہاں بیٹا مجھے معلوم ہے کہ یہ سزا اُن کے لیے کافی ہے مگر یہ سب میں نے تمہاری دنیا کے فائدے کے لیے کیا ہے کیونکہ جب تک راز حیات میرے پاس تھا کسی کو خبر نہیں تھی۔ جیسے ہی اِنہوں نے پیا میرے دشمنوں کو فوراً پتا چل گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کرتے۔ میں

نے تمہارے دوستوں کو اپنے حصار لے کر ان کو اپنی قید کر لیا اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ یہاں آ کر بہت تباہی مچاتے یا پھر یہ تینوں ہی تباہی مچاتے کیونکہ میں نے ان کے دماغ کا حال بھی پڑھ لیا تھا۔ اب اس راز حیات کا اثر آٹھ سال ہے اور یہ چند دن تک پورے ہونے والے ہیں پھر یہ آزاد ہو جائیں گے اور پھر کچھ خاص عمل کر کے میں اپنے دشمنوں سے لڑوں گا۔ پھر اُن کو فنا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں خود بھی فنا ہو جاؤں۔ اس طرح یہ خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گا۔ چاچا نے کہا۔

''مگر چاچا آپ تو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں اس کا کیا ہوگا۔'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔

بیٹا کچھ نہیں ہوگا تمہارے آج کے انسان نے آج کل بہت ترقی کر لی ہے۔ اس کو ہماری مدد کی ضرورت بالکل نہیں ہے اور اب تم جاؤ تمہارے دوست گھر پہنچ جائیں گے اور میں تم سے ملتا رہوں گا۔ یہاں سے ہمیشہ سے جانے سے پہلے میں تم کو مل کر جاؤں گا یہ میرا وعدہ رہا۔ اور میری طرف سے یہ تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔ اس کو سنبھال کر رکھنا۔ چاچا نے مجھے تھیلی میں ایک چھوٹی سی مورتی دیتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بول پاتا انہوں نے میری طرف اپنے ہاتھ سے ایک اشارہ کیا اور مجھے ایسا لگا میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔

☆......☆......☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر میں بستر پر تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ مورتی کا خیال آنے پر ہاتھ جیب کی طرف گیا۔ واقعی وہاں ایک واقعی مورتی موجود تھی۔ میں نے جلدی سے اس کو گھر میں ایک جگہ چھپا دیا اور باہر نکل آیا۔ گھر والوں میں مجھ سے کسی نے نہ پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور رات کہاں تھا کہ گویا ان کے علم میں کوئی بات نہ تھی۔

میں نے کھانا وغیرہ کھانے کے بعد کسی طرح باہر نکل آیا۔ میں دوبارہ چاچا کے مکان پر جانا چاہتا تھا۔ میں کسی طرح محلے والوں سے آنکھ بچا کر وہاں پہنچ گیا جب میں وہاں گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چاچا کے کمرے کا دروازہ اس قدر تنگ تھا اس میں ایک چھوٹا بچہ بھی نہیں گھس سکتا تھا تو مجھے اس بات پر شدید حیرانی ہوئی میں رات کو کس طرح اندر چلا گیا یا پھر میں خواب دیکھتا رہا تھا۔ نہیں خواب تو نہیں تھا کیونکہ وہ مورتی میرے پاس ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے میں کسی اور جگہ نہ چلا گیا ہوں ۔میں نے خود ہی اندازے لگانے شروع کر دیے۔ اچانک ہی میری نظر زمین پر پڑی تو میں حیرت سے دنگ رہ گیا کہ وہاں میرا سگریٹ جلانے والا لائٹر پڑا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں نے رات ادھر ہی گزاری ہے۔ اس پر میں خوف زدہ ہو کر واپس آ گیا۔

☆......☆......☆

ابھی تھوڑے دن ہی گزرے تھے کہ میں جیسے ہی گھر واپس آیا تو مجھے ابو نے خوش خبری سنائی کہ تیرے دوست واپس آ گئے ہیں۔ وہ سب اک ہی گھر میں موجود تھے کیونکہ ملنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میں بھاگتا ہوا وہیں پہنچ گیا۔ وہ سب مجھے گلے مل کر رونے لگے۔ ہم کچھ حال احوال بانٹنے لگے۔ اُن کو کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ تینوں اتنا عرصہ کہاں رہے ہیں اور کیسے غائب ہوئے، محلے والوں کی زبانی صرف یہ پتا چلا کہ وہ تینوں ایک ساتھ رستے پر بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

حالات بدلتے چلے گئے۔ میری شادی ہو گئی۔ آفس کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں تو مجھے شہر میں ہی شفٹ ہونا پڑا۔ میں والدین کو ملنے لازمی آتا تھا مگر چاچا کے مکان کو دیکھے بنا ہی گزر جاتا۔ اب مجھے اس سے خوف آتا تھا۔ جس نے میرے دوستوں کے اتنے سال چاٹ لیے تھے۔ وہ مورتی اب بھی میرے پاس تھی۔ اب میری زندگی میں کبھی کبھی عجیب وغریب واقعات رونما ہو جاتے۔ ایک دفعہ گھر سے بیگم نے فون کیا کہ گھر میں اس کے امی ابو آ گئے ہیں۔ پکانے کے لیے کچھ سامان دے جاؤ، میں نے اس وقت ہاں کہہ دی مگر پھر فوری میٹنگ کے لیے جانا پڑا تو یہ سب بھول گیا۔ مگر شام کو گھر لوٹا تو بیگم خوشی سے نہال تھی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی کہ آپ نے اتنا سامان بھجوا دیا۔ ابو تو آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔''

''کیا، کون سامان! میں کب بھجوایا۔'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''اوہ آپ بھی نا، وہ جو آج آپ نے آفس کے چاچا رسول کے ہاتھوں بھجوایا تھا۔''

''اوہ اچھا!'' میں ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا۔

اور آج وہ پھر مجھ سے تقریباً چھ ماہ بعد ملا تھا جب موسم خراب تھا اور وہ مجھے رکشے پر گھر چھوڑ گیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ اس رات کی بات ہے جب ہم باہر سو رہے تھے کہ اچانک ہلکے سے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو آسمان پر بہت زیادہ روشنی تھی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور مجھے ایسا لگا یہ شور اوپر سے آ رہا ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں اپنی بیوی کو بیدار کیا اور وہ کسمساتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس کو یہ سب کچھ بتایا تو میری ذہنی حالت پر شک کر کے کہنے لگی کہ آسمان تو بالکل ٹھیک ہے۔ اور روشنی تو کہیں بھی نہیں ہے اور نہ کہیں شور ہے، ہلکے ہلکے بادل ہیں اور ستارے بھی چمک رہے ہیں۔'' اور وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ سو گئی۔

میں بدستور آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا کہ اچانک یکدم بہت زیادہ روشنی ہوئی اور پھر دوبارہ سے آسمان اپنی روز کی حالت میں آ گیا۔

یہ سب کیا تھا!!! میں خود ہی سوچنے لگا، اوہ یہ چاچا تو نہیں تھا۔ میں چارپائی سے اتر کر اندر کمرے کی طرف بھاگا، اور الماری میں اپنی خفیہ جگہ سے وہ تھیلی نکالی تو اس کے اندر وہ مورتی نہیں بلکہ صرف ریت پڑی ہوئی تھی اس سے یہ غالب امکان تھا کہ چاچا ہمیشہ کے لیے چلا گیا ہے تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو اور میں تنہا رہ گیا ہوں۔ چاچا نے ٹھیک کہا تھا کہ میں جب ہمیشہ کے لیے جاؤں گا تو تم کو ملنے ضرور آؤں گا یہ میرا وعدہ ہے۔'' اور آج اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے آخری دفعہ مل کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا۔ میں وہیں فرش پر ڈھے گیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور باہر کی دنیا اور بیوی بچے میری حالت سے بے خبر تھے۔

☆......☆......☆

اگلے دن اتوار تھا گھر میں کسی طرح میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ چاچا کی جدائی سے اداسی غالب تھی۔ اس اداسی کو کم کرنے کے لیے میں ابو کی طرف چلا آیا۔ جب میں محلے میں پہنچا تو وہاں بارش کے پانی کے آثار کھڑے تھے۔ لگتا تھا رات اَبر ٹوٹ کر برسا تھا اچانک میری نظر چاچا کے مکانوں کی طرف پڑی۔

تو وہاں سارا پانی کھڑا تھا اور سارا مکان بالکل منہدم ہو چکا تھا صرف ریت اور لکڑیاں پڑی تھیں۔ میں بے اختیار رک گیا۔ مجھے اپنا سارا بچپن یاد آنے لگا جب میں گھر سے چاچا کے لیے چیزیں اٹھا کر لے آتا تھا اب وہاں اس جگہ پر کچھ بھی نہیں تھا صرف یادیں بکھری ہوئی تھیں اور کسی کو پتا بھی نہیں تھا میں کتنی بڑی یادیں دل میں دل چھپا کر کھڑا تھا۔ یہ سب دیکھ کر آنسو میری آنکھوں سے رواں ہو گئے اور میں ابو کے گھر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

آج اس واقعے کو پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ محلے کا نقشہ بدل گیا ہے اور وہاں کے لوگ شاید چاچا اور'' چاچا تمباکو'' کو بھول چکے ہیں۔ اس کے مکان پر ایک شاندار کوٹھی بن چکی ہے۔ چاچا مجھے دوبارہ کبھی نہیں ملا مگر میں کیا کروں مجھے چاچا نہیں بھولا۔ مجھے جب بھی اس کی یاد آتی ہے میں اس تھیلی میں پڑی ریت کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مسلنے لگتا ہوں تو نہ جانے کیوں ایک سکون سا مل جاتا ہے۔

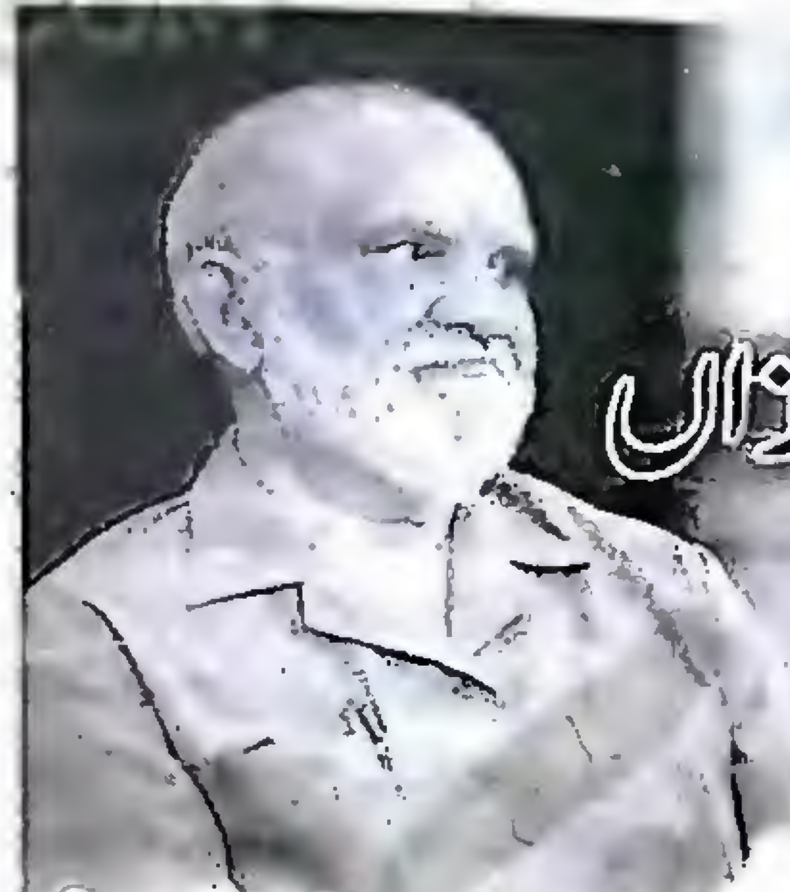
ایک دفعہ بیگم کے ہاتھ وہ تھیلی لگ گئی۔ اس نے حیرانگی سے دیکھا اور باہر پھینکنا چاہی۔ تو زندگی میں پہلی بار میں اس پر غصے ہوا کہ اگر تم نے اس کو باہر پھینکا تو اس گھر میں دوبارہ قدم مت رکھنا۔''

اِس پگلی نے اس بات پر شاید یہ سمجھ لیا کہ یہ میری کسی بچپن کی محبت کا دیا ہوا تحفہ ہے یا میرا کیا ہوا کوئی عشق ہے۔ جو میں نے اتنی پرانی تھیلی کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

قارئین بات تو اس کی بھی ٹھیک ہے یہ واقعی میرا عشق ہے اور بچپن میں کسی کا دیا ہوا تحفہ ہے مگر کسی انسان کا نہیں!!!!

☆☆......☆☆

سفرنامہ



برطانیہ میں خزاں

محمود شام

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو امر ہو گئے
ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصہ محسوس کرتا ہے

ساتواں حصہ

مشروبات کے لیے الگ گوشہ ہے۔ جسے آپ کے آرڈر کا کھانا تیار ہونے اور میز لگنے تک انتظار گاہ بھی سمجھ لیجیے۔ ریستوراں میں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ جو ہیں: طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم حسبِ معمول مچھلی کا شوق فرما رہے ہیں کہ اس میں حلال ذبح کا مسئلہ نہیں ہے۔

خوبصورت چوراہوں اور بل کھاتی سڑکوں سے ہوتے ہم نارتھ فوک اسپتال میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس چھوٹے سے قصبے کا یہ اسپتال ہمارے اعلیٰ اسپتالوں سے بھی فراخ ہے۔ صاف ستھرا ہے۔ یہ کیمونٹی کا اسپتال ہے۔ اخراجات حکومت خود برداشت کرتی ہے۔ بیگم بشیر ریاض یہیں ملازمت بھی کرتی رہی ہیں۔ اور اب وہ یہاں ایک مریض کی حیثیت سے زیرِ علاج ہیں۔

ڈاکٹر، نرسیں بشیر صاحب کو ہیلو کر رہی ہیں۔

اسپتال میں ہی پھول بک رہے ہیں۔ رنگ رنگ کے پھول، گلدستے، کھلے پھول، پھول زندگی کی علامت ہیں۔ زندگی کا پیغام ہیں۔ مایوسیوں میں ڈوبے مریضوں کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ زندگی کی جنگ لڑتے مریضوں کو نوید دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔

چھوٹے چھوٹے کیبن، زیادہ خطرناک مرض میں مبتلا مریضوں کے لیے بڑے کمرے میں آٹھ سے دس بارہ مریضوں کے بستر۔

''یہ پھول محمود شام صاحب لائے ہیں۔''

بسترِ علالت پر دراز بیگم بشیر ریاض کے چہرے پر اتنی بشاشت ہے کہ وہ کینسر کی مریض معلوم ہی نہیں ہوتی ہیں۔ ان کی بازو پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔

''آپ کیسے ہیں بشیر ریاض اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔''

''آپ کیسی ہیں، پاکستان میں سب دوستوں نے آپ کی خیریت پوچھی ہے۔''

''بس مقابلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ جو بہتر سمجھیں۔''

پھر وہ اپنے خاوند سے گفتگو میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ جیسے انہیں احساس ہو کہ وقت بہت کم ہے۔ پہلے

جب وقت بہت زیادہ تھا تو وہ دونوں اپنے اپنے کام کے باعث دور دور رہتے تھے۔ وہ اسی اسپتال میں کام کرتی تھیں اور بشیر ریاض اپنی جمہوری جدوجہد میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں آپس میں اطمینان سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے روز مل رہے ہیں تو انہیں احساس ہے کہ وقت ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

''ڈاکٹر بازو پر پٹی باندھ گئی ہے کیوں کہ کندھے کے قریب کینسر پھیل رہا ہے۔ اسے آگے جانے سے روکنے کے لیے پٹی باندھی ہے۔''

''دو روز پہلے تو کچھ ٹھہر گیا تھا۔ اب پھر پھیل رہا ہے۔ دیکھیں کب ٹھہرتا ہے۔''

یہ ایک ایسی خاتون گفتگو کر رہی ہے۔ جو ایک ڈیڑھ سال سے کینسر سے جنگ لڑ رہی ہے۔ اور جسے احساس ہے کہ یہ مرض مہلک ہے۔ بچنے کی صورت بہت کم ہے۔ میں حیرت زدہ ہوں کہ موت کو اپنے سامنے دیکھتے ہوئے بھی ایک انسان وہ بھی خاتون اتنے تحمل، ٹھہراؤ اور پُرسکون لہجے میں اتنے میٹھے لفظوں میں بات کر سکتی ہے۔

کیا خبر کوئی معجزہ ہو جائے۔ کینسر ایک مریض کو چھوڑ ہی دے۔

بیگم بشیر کی والدہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ بیگم بشیر ریاض سے اپنی والدہ کو مصروف رکھنے کے لیے مشورہ کر رہی ہیں۔

پھر وہ بڑی حسرت سے کہہ رہی ہیں۔ ساری عمر کام اور کام ہی کرتے رہے۔ اب سوچا تھا کہ ریٹائر ہوں گے۔ تو کچھ آرام کریں گے۔ پاکستان کا چکر لگائیں گے۔ لیکن اب قدرت کی کچھ اور ہی مرضی ہے۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ اللہ ضرور اپنا کرم کرے گا۔ اللہ محبت کرنے والا ہے۔ آپ جیسی حوصلہ مند خاتون کو ضرور زندگی دے گا، میں بھی جانتا ہوں کہ یہ لفظ کس دل سے کہہ رہا ہوں۔ مریضہ بھی جانتی ہے۔ مریضہ کے شوہر بھی لیکن ہم سب بے بس ہیں۔ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ انسان کی خلاؤں کی تسخیر، چاند کی فتح، سمندروں کی گہرائیوں میں سفر، نادیدہ منزلوں کے سفر، یہ سب ایک طرف لیکن کینسر کے سامنے بے بس۔

اسی بے بسی کے ماحول میں ہم بیگم بشیر ریاض سے اجازت لے کر چلے آ رہے ہیں۔ بشیر ریاض وہیں رہیں گے۔ نہ جانے وہ کس کرب سے گزرتے ہوں گے۔ ان کا مقدر شاید کرب ہی ہے۔ کبھی ملت کا کرب، کبھی ذات کا کرب۔

شفا اور بیماری تو قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس اسپتال میں روشنی، صفائی، تازگی اور کشادگی کا احساس قابلِ علاج مریضوں کا آدھا مرض تو آمد کے وقت ہی ختم کر دیتا ہوگا۔

جنگ لندن کے دفتر میں

ایک خاتون کے پاس مسکراہٹوں کا توشہ خالی ہو چکا ہے۔ لہجے میں تندی ہے۔ لیکن دوسری خاتون ابھی تروتازہ ہیں۔

طبیعت بہت اداس ہو چکی ہے۔ ہم ایک ایسے انسان کو دیکھ کر آ رہے ہیں۔ جو زندگی بھر صبر اور استقامت کا پیکر رہی ہے۔ اب جس کی عمر کی نقدی ختم ہو چکی ہے۔ وہ ایسا چراغ ہے جو بجھنے والا ہے۔ ایسا مریض جس کے عزیز و اقارب اب کسی وقت بھی اس کے بچھڑنے کی خبر سننے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوتے ہیں۔ موت زندگی سے زیادہ بڑی حقیقت ہے۔

'جنگ' کا دفتر ڈھونڈ رہے ہیں۔ اپنے وطن اور دیارِ غیر میں یہی ہوتا ہے۔ کراچی، لاہور، پنڈی میں کسی سے پوچھیے 'جنگ' کا دفتر کہاں ہے۔ وہ آپ کو فوراً بتا دے گا۔ ہم علاقے کے پوسٹ آفس سے پوچھ رہے ہیں۔ وہ بھی بتانے سے قاصر ہیں۔ پھر وہ بازو ٹیلی فون بوتھ سے ٹیلی فون کرتے ہیں۔ زیڈیو خان سے بات ہوتی ہے۔ وہ دوبارہ سمجھاتے ہیں۔

پھر یہی پتا ہم ٹیکسی والے کو بتاتے ہیں۔تو وہ ہمیں لے چلنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ہم اسے قریبی ریلوے اسٹیشن (بورو) کا نام بھی بتاتے ہیں۔

لندن بھی بہت بدل گیا ہے۔'جنگ' بھی بدل گیا ہے۔ہم جب تک 'جنگ' سے باقاعدہ وابستہ رہے۔ ہمیں 'جنگ' لندن کے دفتر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پرانا دفتر تو ہم نے دیکھا تھا۔لیکن اب 'جنگ' جدید ترین مشینری پر شائع ہوتا ہے۔اس کا تقسیم کا نظام بھی بہت تبدیل ہو چکا ہے۔کاتبوں کی جگہ کمپیوٹر اور لیزر پرنٹر ہیں۔ پاکستان سے 'جنگ' فیکس اور ٹیلیکس سے منسلک ہے۔ تازہ ترین خبریں ساتھ کے ساتھ پہنچ جاتی ہیں۔

'جنگ' میں میر شکیل الرحمٰن سے ملاقات رہتی ہے۔اپنے عظیم والد میر خلیل الرحمٰن کے وقت انتقال کے بعد سے میر شکیل الرحمٰن 'جنگ' گروپ آف نیوز پیپرز کے ایڈیٹر انچیف ہیں۔ میر خلیل الرحمٰن نے تو اپنی کائنات خود بنائی تھی۔یہ سلطنت دھیرے دھیرے قائم ہوئی۔ایشیا میں اردو کا یہ سب سے بڑا اخبار میر صاحب کی مسلسل نصف صدی کے رت جگوں اور ریاضتوں سے اس مقام تک پہنچا۔ قسمت ان کے ساتھ تھی، ورکنگ صحافی اچھے ملتے رہے۔اپنے دور کا جو بھی نامور ادیب' شاعر اور صحافی تھا۔ وہ 'جنگ' سے کسی نہ کسی طور وابستہ رہا۔ کالموں میں ہمیشہ ندرت، تنوع، مختلف الخیال کالم نویس 'جنگ' میں آزادی سے اپنے نظریات کا اظہار کرتے تھے۔اس طرح ہر مکتب فکر کے قاری کو 'جنگ' میں اپنی پسند کا کالم بھی ملتا رہا۔ خبریں بھی ملتی رہیں۔ 'جنگ' اس طرح ہر طبقے میں مقبول ہوتا چلا گیا۔آج اسے یہ انفرادیت حاصل ہے کہ اخبار ہے تو 'جنگ' ہے۔آپ کسی بھی اخبار فروش سے بغیر نام لیے کہیں کہ اخبار دے دو۔ وہ آپ کو 'جنگ' دے دے گا۔ یہ مرتبہ بلند جس کو مل گیا۔ایسے مقام یونہی نہیں مل جاتے۔ اس میں ڈھیروں تن، شاعر کا لہو ہوتا ہے۔اور تشکیل و تزئین فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے۔نصف صدی کا حصہ ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔

میر شکیل الرحمٰن اب اپنے والد کی جلائی ہوئی مشعل لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ وزیراعظم میاں نواز شریف پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے زمانے میں ان کے بہت قریب رہے ہیں۔ میاں نواز شریف کی سیاسی ابتداء میں 'جنگ' نے ہی ان کو آگے بڑھایا۔ ان کی ساکھ بلند کی۔ان کا امیج بنایا۔اب وہ وزیراعظم ہیں۔تو انہیں سب اخبارات کی حمایت حاصل ہے۔ اس لیے شاید 'جنگ' کی اہمیت ان کے نزدیک وہ نہیں رہی ہے۔یا ان کے رفقا نے انہیں 'جنگ' سے بدظن کیا ہے۔ پہلی بار میاں نواز شریف اور کسی اخبار کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی ہے۔ 'نیوز' پر بغاوت تک کا مقدمہ بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ میر شکیل الرحمٰن بھی اس میں مدعا علیہ ہیں۔ آج تک جنگ اور حکومت کے تعلقات کی نوعیت اس حد تک نہیں پہنچی تھی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی 'جنگ' زیر عتاب آیا تھا۔ میر صاحب کے اٹھ جانے کے بعد یہ سب سے پہلی ابتلاء میر جاوید الرحمٰن کو برداشت کرنی پڑی ہے۔

میر شکیل الرحمٰن انتہائی پراعتماد معلوم ہو رہے ہیں۔وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ہماری پالیسی تو بہت متوازن چل رہی تھی۔ وزیراعظم کو نہ جانے کون سی غلط فہمی ہو گئی ہے اور انہوں نے انتہائی اقدامات کیے ہیں۔

جنگ لندن کے معاملات کے بارے میں وہ پُرامید ہیں کہ مسائل حل ہو جائیں گے۔اب اس کا کنٹرول پاکستان سے رہے گا۔ تاکہ پھر ایسی گڑبڑ نہ ہو۔

میر شکیل الرحمٰن پاکستان سے مسلسل رابطے میں ہیں۔ گاہے فون آ رہا ہے۔ گاہے فیکس..... وہ پاکستان میں بھی سارے ایڈیشنوں کی ایڈیٹوریل پالیسی یہاں سے چلا رہے ہیں۔اور لندن کی پالیسی بھی انہی کی ہے۔اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی سلطنت کو سنبھالنا۔ اتنے اخبارات کی پالیسی مرتب کرنا۔ اسے برقرار رکھنا۔قابل تحسین ہے۔اس وقت 'جنگ' کے ایڈیشن کراچی، لاہور، راولپنڈی، کوئٹہ اور لندن سے شائع ہو رہے ہیں۔ 'نیوز' انٹرنیشنل کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے نکل رہا ہے۔اس کے علاوہ 'اخبار جہاں' اردو کا سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ 'میگ' انگریزی کا ہفت روزہ، شام کا اخبار ڈیلی نیوز ان سب کی ادارتی پالیسی میر شکیل الرحمٰن دیکھ رہے ہیں۔جبکہ انتظامی اور مالی امور ان کے بڑے بھائی میر جاوید الرحمٰن سنبھالتے ہیں۔وہ ادارے کے چیف ایگزیکٹو ہیں۔آج کل تو چیف ایگزیکٹو ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ 'جنگ' میں کسی کو آٹھویں ترمیم کے تحت اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں کے صدر اور وزیراعظم کے درمیان نہ تو اختلافات ہیں نہ ہی اختیارات میں عدم توازن ہے۔

'جنگ' میں اعتزاز احسن نظر آ رہے ہیں۔ظہور نیازی ہیں۔زیڈ یو خان ہیں خاور نعیم ہاشمی ہیں۔سب سے فرداً فرداً ملاقات رہتی ہے۔ پاکستان کی باتیں 'اخبارات کی باتیں، مقدمہ بغاوت اور پھر مقدمے کی واپسی۔

اب ہمارا رُخ بی بی سی کی طرف ہے۔لندن پہلے کئی بار آئے لیکن بی بی سی نہیں جانا ہوا۔اب کے یہ اصول بھی توڑ رہے ہیں۔ بی بی سی دیکھ تو لیں۔آصف جیلانی سے وقت طے ہوا ہے۔

عالمی خدمت کے 60 سال، کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

عمارت کا پیش منظر بہت متاثر کن ہے۔

استقبالیہ۔

ایک خاتون کے پاس مسکراہٹوں کا توشہ خالی ہو چکا ہے۔ لہجے میں تندی ہے۔لیکن دوسری خاتون ابھی تر و تازہ ہیں۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتی ہیں۔''کس سے ملنا ہے۔''

''آصف جیلانی اردو سروس سے ہمارا وقت طے ہے۔''

''آپ سامنے صوفے پر بیٹھیے۔ میں انہیں اطلاع کرتی ہوں۔''

استقبالیہ میں آمد و رفت جاری ہے۔ملاقاتیوں کے لباس پر اسٹیکر چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ یہ سکیورٹی ہے۔ ملازمین کے تو شناختی کارڈ پہلے سے ان کے لباس پر آویزاں ہیں۔

جناب آصف جیلانی، سینئر صحافی ہیں۔ 'جنگ' کے ساتھیوں میں سے، اب ایک عرصے سے بی بی سی سے وابستہ ہیں۔ وہ 'جنگ' کے دہلی میں نمائندہ خصوصی ہوتے تھے کہ 1965ء کی 'جنگ' چھڑ گئی اور انہیں حکومت ہند نے اپنی حراست میں لے لیا۔انہیں بڑی مشکلیں برداشت کرنا پڑیں۔ وہ جب وہاں سے بچ بچا کر اپنے وطن واپس آ گئے۔تو انہیں کچھ عرصے بعد لندن میں 'جنگ' کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ 'جنگ' کے قارئین کو ان کے لندن سے ڈسپیچ ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔لندن کے اخبارات پاکستان کے بارے میں کیا لکھ رہے ہیں۔ یہ ان کے کالم سے ہی پتا چلتا تھا۔ لندن کی خبریں، سیاسی اتار چڑھاؤ، لندن پلان، لندن میں پاکستان کے سیاستدان کیا کرتے ہیں۔

پھر 'جنگ' لندن سے نکالا تو وہ بھی اس سے وابستہ رہے۔اب وہ براڈ کاسٹر ہیں۔اعلیٰ پائے کے، ان کا خبروں کا انتخاب، دھیما لہجہ، بی بی سی اردو سروس کے سامعین اچھی طرح پہچانتے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں۔

''السلام علیکم، اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے، ملاقات ہو گئی۔''

انہوں نے ہم دونوں کے لیے اسٹیکر لیے ہیں۔ ہمارے کوٹوں کے کالروں پر چسپاں کر دیے گئے ہیں۔اب ہم بی بی سی کے لیے سکیورٹی رسک نہیں رہے ہیں۔

بی بی سی کا کیفے ٹیریا، ایک اپنی دنیا رکھتا ہے۔ دیس دیس کے منتخب دانشور' صحافی، براڈ کاسٹر یہاں جمع ہیں۔ کسی کی شفٹ شروع ہونے والی ہے۔تو کوئی چائے کا کپ یا وسکی بیر کا پیگ پی کر جا رہا ہے۔ کسی کی شفٹ ختم ہو گئی ہے۔اسے اب ٹیوب کا ایک طویل سفر کرنا ہے۔ اس لیے وہ شام کا کھانا یہیں کھا رہا ہے۔یہاں کھانے پینے کی چیزیں بہت سستی مل جاتی ہیں۔اس لیے تنہا لوگ یہیں ماحضر تناول کر لیتے ہیں یہ شہر کے دانشوروں کے ملنے کے لیے بھی ایک مرکزی مقام ہے۔ادبی بحثیں' انقلابی باتیں، عالمی سیاست،

سب موضوع یہاں چھڑتے ہیں۔

''پاکستان میں اب کیا حالات ہیں۔''

''پریس اور حکومت کے تعلقات کیسے ہیں۔ نیوز پر مقدمے کے بعد سے۔''

مجید عباسی سندھی کے سب سے بڑے اخبار کے نمائندے ہیں۔ اس لیے آصف جیلانی سندھ کے بارے میں ان سے تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں فوجی آپریشن کے کیا نتائج برآمد ہورہے ہیں۔ ڈاکوؤں کیخلاف کارروائی کتنی کامیاب رہی ہے۔ سید مظفر حسین شاہ کیسے وزیر اعلیٰ ہیں۔''

مجید عباسی انہیں تفصیل سے بتا رہے ہیں کہ وزیر اعلیٰ سید مظفر حسین شاہ کی قیادت کے باعث ہی فوجی آپریشن ممکن ہوا ہے ورنہ یہ ایک عرصے سے ٹل رہا تھا۔ اور سندھ میں امن وامان کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ اب سید مظفر حسین شاہ نے اپنے کولیشن پارٹنرز کی قربانی دی ہے۔ ان کے خلاف کارروائی میں وہ رکاوٹ نہیں بنے ہیں۔ اس لیے صوبے میں امن و امان قائم ہورہا ہے۔ وہ اس وقت ہمارے چاروں وزرائے اعلیٰ سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ قانون اور پارلیمانی امور پر ان کی بڑی گرفت ہے۔ اس لیے وہ اسمبلی میں ہمیشہ چھائے رہتے ہیں۔ اور تمام امور کا قانونی نقطہ نظر سے احاطہ کرتے ہیں۔

گفتگو میں علی احمد خان بھی شریک ہوگئے ہیں۔ یہ بھی سینئر صحافی ہیں۔ کراچی میں 'امن' سے وابستہ تھے۔

اب یہ علی احمد خان ہمارے ساتھ بی بی سی کے کینٹے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ جن کے مغالطے میں علی احمد ستی نے تھانہ نیوٹاؤن کی سیاحت کرلی۔ خیال رہے کہ اس وقت گلشن اقبال اپنے پولیس اسٹیشن کے سلسلے میں خود کفیل نہیں تھا۔

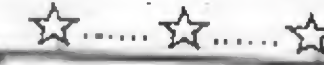
علی احمد خان کی آواز اسی طرح پاٹ دار ہے۔ انداز بحث بھی وہی ہے۔ ان کے ساتھ مل کر ہم سیاستدانوں کی رپورٹنگ کیا کرتے تھے۔ انہیں اس وقت انہی سیاستدانوں کی یاد ستارہی ہے۔ جتوئی کیسے ہیں، حفیظ پیرزادہ، خواجہ خیر الدین۔

''وہ جو ہم سے بچھڑ گئے۔ ان کی باتیں۔

جناب آصف جیلانی کو اپنی شفٹ پر جانا ہے۔ ہم اجازت لے رہے ہیں۔ شاید بی بی سی پھر آنا ہو۔ اس وقت کے لیے خدا حافظ۔

علی احمد خان ہمارے ساتھ ہی چل رہے ہیں۔ کچھ سڑک نوردی کا ارادہ ہے۔ روشنیاں دیکھیں۔ اور کراچی کی گلیاں کوچے یاد کریں۔

مجید عباسی آج کچھ زیادہ خوش ہیں۔ آج ہمیں ایشیائیوں کا کلب دیکھنا ہے۔



☆......☆......☆

ایشائی نوجوانوں کی رقص گاہ

گوروں کے رقص ہم والہانہ دیکھتے رہے ہیں ایشیائیوں کو مصروف رقص دیکھ کر جیسے شرمندگی محسوس ہورہی ہے۔ نہ جانے کیوں؟

پہلے دن ہی، ہمیں ہمارے میزبانوں نے بتایا تھا کہ ٹوٹنگ میں ایشیائی نوجوانوں نے اپنا کلب بنا رکھا ہے۔ جہاں ایشیائی لڑکے لڑکیاں آتے ہیں۔ ڈانس کرتے ہیں۔ جوا کھیلتے ہیں۔ عام نائٹ کلبوں میں رنگ کا تعصب بہت ہے۔ تصادم بھی ہوجاتے ہیں۔ اس لیے ایشیائیوں نے اپنے علاقے میں اپنا نائٹ کلب بنالیا ہے۔ بزرگوں نے اگرچہ اس کی بہت مخالفت کی ہے، لیکن نوجوانوں میں یہ مقبولیت اختیار کرتا جارہا ہے۔

ایشیائیوں کی اب تیسری بلکہ چوتھی نسل برطانیہ میں پیدا ہوکر یہیں پل بڑھ رہی ہے۔ ان کا اپنی ثقافت سے رشتہ بہت کمزور ہے نہ ہونے کے برابر ہے، اپنی ثقافت انہوں نے اپنے گھروں میں کسی حد تک دیکھی ہے یا فلموں میں۔ ذاتی طور پر انہیں اس ثقافت، معاشرت اور تہذیب کا کوئی تجربہ یا مشاہدہ نہیں ہے۔ انہوں نے تو برطانیہ میں آنکھ کھولی۔ لڑکپن یہیں گزارا۔ جوانی کی حدود میں بھی اسی ماحول میں داخل ہوئے۔ اپنے ماحول سے انسان زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے مغربی تہذیب کو وہ لاشعوری طور پر قبول کررہے ہیں۔ ان کے اور بزرگوں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ لیکن یہاں کا معاشرہ ہر بالغ لڑکے لڑکی کو آزادی دیتا ہے۔ وہ اپنے والدین کی مرضی اور حکم کے قطعی خلاف زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اگر والدین ان پر سختی کریں تو وہ عدالت سے ان کیخلاف فیصلہ لے سکتے ہیں۔

نئی نسل کے ایشیائی لڑکے لڑکیاں اس کلب میں اپنی آزادی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ ان کے اپنے بینڈز ہیں۔ میوزک گروپ ہیں۔ زیادہ تر گیت تو مغربی ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھار بھارت کی فلموں کے ہندی گانے، پاکستان کے پنجابی گانے گائے جاتے ہیں اور ان پر کھل کر ڈانس ہوتا ہے۔

ہمیں پتا چلا ہے کہ یہ کلب ہفتے میں تین دن کھلتا ہے۔ بدھ، جمعہ، ہفتہ، صرف رکن آسکتے ہیں یا ان کے مہمان، ہر ایک کے لیے کھلا نہیں ہے۔ اس کلب سے ایشیائیوں کا ایک مسئلہ حل ہوا ہے کہ ایشیا کے لڑکے لڑکیاں یہاں اپنی پسند کا انتخاب کرلیتے ہیں۔ اب کافی شادیاں اس کلب کے حوالے سے ہونے لگی ہیں۔



20th وکٹوریہ اسٹریٹ لندن کل اور آج کے تناظر میں

باقی لوگ تو قدرے مصروف ہیں۔ ناصر ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوا ہے۔ وہ بھی پہلی بار ہی جارہا ہے۔ اگرچہ وہ اس کا ممبر شروع میں ہی بن گیا تھا۔ ہم کلب کے رجسٹر میں اندراج کے بعد اندر داخل ہوگئے ہیں۔ زیادہ کشادگی نہیں ہے۔ استقبالیہ، پھر ایک ہال میں ایک طرف بار، دوسری طرف وسیع ہال میں مہمانوں کے لیے کرسیاں اسٹیج بھی ہے۔ اس کے ساتھ ڈانس کے لیے کافی جگہ خالی ہے۔

ہم دیر سے پہنچے ہیں۔ محفل جمی ہوئی ہے۔ بار کاؤنٹر بھی ہجوم کی زد میں ہے اور رقص گاہ بھی بھری ہوئی ہے۔ ایشیائیوں کو مختصر سا وقت تو ملتا ہے۔ یہاں تفریح کے لیے۔

رقص رقص

ایشیائی لڑکے لڑکیاں بھی اب انگریز لڑکے لڑکیوں سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کی شکلیں، ان کے لباس تو یہ بتاتے ہیں کہ وہ مقامی باشندے نہیں ہیں۔ لیکن ان کی آنکھوں کی شرارت بھری پتلیاں' مقامی حسیناؤں کی شرارت بھری پتلیوں سے مختلف تو نہیں ہیں۔ وہی انداز، وہی تیور، رقص کے طور بھی ان سے مختلف نہیں ہیں۔ انہوں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ اس لیے انہوں نے وہی کچھ سیکھنا تھا جو سکھایا جاتا ہے۔

اب اس نسل کے واپس وطن جانے کے بھی امکانات نہیں ہیں۔ کیونکہ وطن میں وہ بالکل اجنبی ہوں گے۔ وہ اب اسی سرزمین کا حصہ ہیں یہاں کی تہذیب ان کی تہذیب ہے۔ یہاں کی روایات ان کی روایات ہیں۔

ایشیائی جسم تحرک رہے ہیں۔ کالے گندی، سلونے، نمکین چہرے چمک رہے ہیں۔ بتیاں جل بجھ رہی ہیں۔ ان میں پاکستانی بھی ہیں بھارتی بھی، بنگلہ دیشی بھی، سری لنکن بھی۔

ہم ایک عجیب کیفیت سے گزر رہے ہیں' جن کلبوں میں ہم گوروں کو ناچتے دیکھتے آئے ہیں۔ وہاں ہم ان کے رقص کو بڑے جوش اور جذبے سے دیکھتے رہے ہیں۔ لڑکوں یا لڑکیوں کسی کے جسم کو ناچ میں دیکھ کر کوئی احساس تکلیف دہ نہیں بنا تھا۔ لیکن اپنے ہم وطنوں کو مصروف رقص دیکھ کر جیسے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔ نہ جانے یہ احساس کیوں ہے۔

جس علاقے میں، جس ملک میں رہنا ہے۔ اور تسلسل سے رہتے آ رہے ہیں۔ وہاں کا معاشرہ تہذیب اور ثقافت تو آپ کے اندر خود اترتی رہتی ہے یہ ایک فطری منطقی اور تاریخی امر ہے۔ اسے کون روک سکتا ہے۔

لیکن ہماری سوچ کو بھی کون روک سکتا ہے۔

جوڑے کھل کر ڈانس کر رہے ہیں۔ رقص کے آداب، پیچ وخم، اعضا کی شاعری ہی اس وارفتگی کا جواب بن سکتا ہے۔ ایشیائی مقامی آبادی کے شانہ بشانہ ترقی کر رہے ہیں۔ اگرچہ شانہ بشانہ رقص نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ کلب رفتہ رفتہ اتنے مقبول ہو جائیں گے کہ مقامی آبادی اپنا کلب چھوڑ کر یہیں آیا کرے گی۔ یہاں کے ارکان مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کالے گورے مل جل کر رقص کیا کریں گے۔

جب اکٹھے رقص کر سکتے ہیں تو ایک دوسرے سے ملاقاتیں بھی کر سکتے ہیں، اس پر بھی یہاں کے والدین کوئی اعتراض نہیں کر سکتے، ورنہ والدین کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

Co-Habitation ہمدی (بغیر شادی کے اکٹھے رہنا) ایشیائی لڑکے لڑکیوں میں بھی مقبول ہو رہی ہے۔

ایک تہذیب دوسری تہذیب سے گلے مل رہی ہے۔

تضادات دور ہو رہے ہیں۔

ہم یہاں تھوڑی دیر ہی رکتے ہیں۔ اس لیے ہماری آمد کا نوٹس کوئی نہیں لیتا۔

ہم خوشی، تشویش اور حیرت کے ملے جلے جذبات لے کر رخصت ہو رہے ہیں۔ ناصر کہہ رہے ہیں۔ جمعہ اور ہفتے کی رات یہاں سنا ہے بہت رونق ہوتی ہے۔

''کیا اس روز جوا بھی ہوتا ہے؟''

''ہاں...... بالکل ہوتا ہے۔''

ہم اپنے ہم وطنوں، اور اس دیس میں رچ بس جانے والوں کو الوداع کہہ رہے ہیں۔ یہاں کوئی تنہا نہیں ہے۔ کوئی ہمارا ہاتھ نہیں تھام سکتا۔ ہم انگلینڈ میں تنہا تنہا آئے تھے۔ اور اسی طرح چلے جائیں گے۔

اسٹاک ویل کی ایک اور حسین سحر۔ ہم سورج کی کرنوں کی دستک پر اٹھ بیٹھے ہیں۔

روشنی یوں بے ترتیب کمرے میں در آتی ہے۔ جیسے کسی کی یاد دل میں اترتی ہے۔ آج ہمیں حکومت برطانیہ کی دعوت پر کچھ اہم مقامات دیکھنے ہیں۔

ہم جب اسلام آباد سے روانہ ہو رہے تھے۔ تو ہم نے برطانوی سفارت خانے سے خواہش ظاہر کی تھی کہ برٹش ٹورسٹ اتھارٹی ہمیں سیاحت کے نقطۂ نظر سے انگلینڈ دکھائے گی۔ کچھ مقامات ہم خود دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر حکومت برطانیہ ایسا اہتمام کر سکے۔ برطانوی ہائی کمیشن کے پریس سیکشن کے انچارج صادق لودھی ایک طویل عرصے سے سفارت خانے سے وابستہ ہیں۔ او بی ای بھی لے چکے ہیں۔ برطانیہ کا یہ اعزاز بہت کم پاکستانیوں کو ملتا ہے۔

صادق لودھی پاکستان کے صحافیوں اور حکومت برطانیہ کے درمیان ایک اہم رابطہ ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ لندن میں محکمہ خارجہ تک ہماری یہ خواہش پہنچا دیں گے اور وہ ضرور اس کا اہتمام کریں گے۔ ہم نے اپنا رابطے کا فون نمبر بھی انہیں دے دیا تھا۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی محکمہ خارجہ نے فون آ چکا تھا اور انہوں نے ہمیں رابطے کے لیے کہا تھا۔

مس فیونا کوربی سے ہماری بات ہوئی تو ان سے طے ہو گیا کہ 15 اکتوبر کا دن ہم ان کے لیے وقف رکھیں گے۔ کہاں کہاں جانا ہوگا۔ یہ ان کا دفتر طے کرے گا۔ ممکن ہوا تو پہلے بتا دیں گے۔ ورنہ 15 اکتوبر کی صبح 9 بجے 20 وکٹوریہ اسٹریٹ پہنچنا ہوگا۔ جہاں دولت مشترکہ اور امور خارجہ کے محکمہ اطلاعات کا غیر ملکی مہمانوں کا سیکشن ہے۔

ہماری منزل آج 20 وکٹوریہ اسٹریٹ ہے۔ ٹیوب سے متعلقہ اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد ایک طویل وکٹوریہ اسٹریٹ ہمارے سامنے ہے۔ ہم 20 نمبر کی تلاش میں ہیں۔ استقبالیہ پر مامور خاتون ہمیں دیکھتے ہی مسکرا اٹھتی ہے۔ ''آپ پاکستانی صحافی ہیں۔''

''جی۔''

''مس کوربی آپ کے لیے بے تاب ہیں آپ



لندن میں ایشین نائٹ کلبز میں نوجوان ہلہ گلہ کرتے ہوئے

بیٹھیے میں اطلاع کر لی ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ایک درمیانی قامت کی جواں سال خاتون مسکراتی ہوئی آتی ہیں۔ گلاب کی طرح تر و تازہ۔

''ہیلو مسٹر!'' ہاتھ بڑھاتے ہوئے۔

''میں محمود شام۔'' ہاتھ مصافحے کے لیے تھامتے ہوئے۔

''ہیلو مسٹر مجید عباسی۔''

''آیئے کچھ دیر ہو گئی آپ کو۔''

''20 نمبر نہیں مل رہا تھا۔''

''ایک مختصر سے کانفرنس روم میں میز لگی ہے۔''

''ان سے ملیے، یہ ہیں کلیرا وائٹ محکمہ خارجہ اور دولت مشترکہ کی آفیسر۔''

میز پر ہمارے نام لکھے ہیں۔ ہم اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ رہے ہیں۔ وہ دونوں خواتین اپنے اپنے نام کے سامنے سیٹ پر بیٹھ گئی ہیں۔

☆......☆......☆

دولت مشترکہ میں واپسی

اب اس دربار میں ہم معزز مہمانوں کی طرح آتے ہیں پہلے ہمیں پا بجولاں لایا جاتا تھا۔

ہمارے سامنے چھپا ہوا پروگرام رکھ دیا گیا ہے۔ سب کچھ بڑے منظم انداز سے، پہلے سے سب طے شدہ۔

یہ لوگ اپنے سابقہ غلاموں کے لیے کتنا اہتمام کرتے ہیں۔ اب ان کا گزارا ہماری سیاحتوں پر ہی ہے۔ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی سلطنت اب جزائر برطانیہ میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔

پروگرام کے بارے میں مس کوربی ہمیں مرحلہ وار بتاتی ہیں۔ ایک ایک کپ کوفی، پھر وقت کم ہے۔ اس لیے ہم اپنے دورے کا آغاز کر دیتے ہیں۔

مسز کلیئر وائٹ کے شوہر بھی محکمہ خارجہ میں کام کرتے ہیں۔ محکمہ خارجہ کے پاس شاید گاڑیاں کم ہیں۔ اس لیے مسز کلیر وائٹ ٹیکسی روک رہی ہیں۔ ان سے تو ہمارا محکمہ خارجہ کہیں زیادہ خوشحال ہے۔ نئے سے نئے ماڈل کی ہر قسم کی، ہر سائز کی کاریں سوچ بھی

نہیں سکتے کہ محکمہ خارجہ کے مہمانوں کو ٹیکسی میں لے جایا جائے گا۔

ٹیکسی ہمیں دولت مشترکہ کے سیکریٹریٹ لے آئی ہے۔ جہاں استقبالیے پر ایک ایشیائی صاحب بیٹھے ہیں۔

کوائیڈ رینٹ ہاؤس۔ لندن اس ڈبلیو ون میں 55-58 پال مال پر واقع ہے۔ سیاہ فام مسز پیٹسی رابرٹسن محکمہ اطلاعات کی سربراہ ہیں۔ ان کا تعلق جمائیکا سے ہے۔ ان کے ساتھ دو اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ ایک برطانیہ سے کلائیو کے جورڈن اور ملائیشیا سے شیول جے ڈوال۔ محکمہ اطلاعات کی نگرانی میں دولت مشترکہ کے کئی جرائد باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر رپورٹیں اور کتابچے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جو دولت مشترکہ کے سب ممالک میں تقسیم ہوتے ہیں۔ دولت مشترکہ کے صحافیوں کی اپنی انجمن بھی ہے۔

دولت مشترکہ کیا ہے۔

یہ دراصل ایک رضاکارانہ ایسوسی ایشن ہے۔ ان ممالک کی جو کبھی برطانیہ کے زیر اقلیم رہے ہیں۔ پہلے اس کا نام برطانوی دولت مشترکہ تھا۔ لیکن 1980ء میں اس کے رکن ممالک نے اس نام کو مسترد کر دیا۔ اب دولت مشترکہ کے تمام ارکان مساوی حیثیت رکھتے ہیں اب ان کا بنیادی مقصد اپنی آزادی اور ترقی کی حفاظت میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے۔

ملکہ برطانیہ دولت مشترکہ کی سربراہ ہیں۔ اور دولت مشترکہ سیکریٹریٹ کا سربراہ ایک سیکریٹری جنرل ہوتا ہے۔ جسے دولت مشترکہ کے ارکان ممالک کے سربراہان حکومت منتخب کرتے ہیں۔ آج کل نائیجریا کے ایک سابق وزیر خارجہ اور دولت مشترکہ سیکریٹریٹ کے سابق ڈپٹی سیکریٹری جنرل چیف ایمیکا انایو کو سیکریٹری جنرل ہیں ان کے ساتھ منتخب کیے گئے دو ڈپٹی سیکریٹری جنرل برطانیہ کے پیٹر آنون اور پاپوانیوگنی کے مسز انتھونی سیاگورو ہیں۔ پیٹر انون اقتصادی امور اور مسز انتھونی سیاگورو سیاسی امور کے ذمہ دار ہیں۔

دولت مشترکہ سیکریٹریٹ کے اخراجات رکن حکومتیں اپنی آمدنی اور آبادی کے لحاظ سے چندہ دے کر پورا کرتی ہیں۔ 92-1991ء میں سیکریٹریٹ کا بجٹ 86 ملین پونڈ تھا۔ بعض اخراجات کے لیے حکومتیں الگ حصہ بھی ادا کرتی ہیں۔

مسز پٹسی رابرٹسن بے تکان بولتی ہیں۔ سوالات کا موقع بھی نہیں دے رہی ہیں۔ اس وقت دولت مشترکہ کے 80 ممالک رکن ہیں۔ پاکستان 1972ء میں دولت مشترکہ سے الگ ہوگیا تھا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں۔ کیوں کہ برطانیہ نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا تھا۔ لیکن پھر ان کی بیٹی محترمہ بینظیر بھٹو کے دور میں پاکستان پھر دولت مشترکہ کا رکن بن گیا۔

مسز پٹسی رابرٹسن اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ سیکریٹریٹ میں کافی ٹیکنیکل ماہرین ہیں۔ جو ترقی پذیر ممالک کو ماہرانہ مشورے دے سکتے ہیں۔

نوجوانوں کے بہت سے پروگرام ہیں۔ اس کے تحت زمبیا، بھارت، گیانا اور ساؤتھ سینک میں نوجوان کو تربیت دی جارہی ہے۔ جس کے ذریعے ان ممالک میں سماجی خدمات کا معیار بلند کیا جاتا ہے۔

تعلیم ایک ایسا شعبہ ہے۔ جس میں دولت مشترکہ کے کئی پروگرام چل رہے ہیں۔

مسز رابرٹسن کہہ رہی ہیں کہ دولت مشترکہ ایک خاندان کی طرح ہے۔ یہ مملکتوں کا ایک بڑا گروپ ہے جس نے مل جل کر کام کرنے کی ٹھانی ہے کیونکہ ان میں ایک رشتہ ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ شراکت سے وہ اپنے مفادات کو آگے بڑھا سکتے ہیں اور عالمی معاملات کو بھی آگے لے کر چل سکتے ہیں۔ جنہیں وہ اہم سمجھتے ہیں۔ دولت مشترکہ کے رکن ممالک کے سربراہان حکومت اسے آزاد اور خودمختار ملکوں کی رضاکارانہ ایسوسی ایشن کہتے ہیں۔ اس کے 80 ممالک دنیا کے ممالک کا ایک تہائی، اور آبادی کا ایک چوتھائی ہیں ان ممالک کی کل آبادی 1.4 بلین ہے۔ اس میں کئی نسلوں، مذاہب اور زبانوں کے لوگ آباد ہیں۔

ان ممالک کے سربراہ ہر دو سال بعد اجلاس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ان ممالک کے خزانہ، قانون، تعلیم، صحت، زراعت اور شعبہ خواتین کے وزراء کے بھی باقاعدگی سے اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں متعلقہ مسائل پر بات چیت ہوتی ہے۔

کوفی بہت مزیدار ہے۔

مسز رابرٹسن کی سیکریٹری سفید فام ہے۔ اور ان کی نسبت بہت دبلی پتلی، کوفی اسی نے بنائی ہے۔ مسز رابرٹسن کے پاس کوفی کو سراہنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم ان کی سیکریٹری کی طرف تحسین گزار نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جب مسز رابرٹسن کی گفتگو میں ایک فون کے باعث وقفہ آتا ہے۔ تو ہم فوراً کوفی کی تعریف کرتے ہیں۔ جس کے جواب میں وہ شکریہ ادا کرتی ہے۔

مسز رابرٹسن خود سیاہ فام ہیں۔ شاید اس لیے وہ دولت مشترکہ کی طرف سے سیاہ فاموں کی آزادی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات بڑی تفصیل سے بتا رہی ہیں۔

ہماری دلچسپی تعلیم اور صحافت کے شعبے سے ہے۔ اس لیے ہم اس سے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کئی فیلوشپ، وظائف اور تربیتی پروگرام جاری ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں کامن ویلتھ فنڈ برائے ٹیکنیکل کوآپریشن زیادہ قابل ذکر ہے۔

دولت مشترکہ سیکریٹریٹ مختلف رکن ممالک کے انتخابات کے دنوں میں پولنگ کی مانیٹرنگ کے لیے غیر جانبدار ٹیمیں بھی بھیجتا ہے۔ جو انتخابی طریق کار جائزہ لے کر مختلف مقامات پر پولنگ کا نظارہ کرکے۔ حکومت اور اپوزیشن کے نمایاں افراد کے تاثرات یکجا کرکے رپورٹ مرتب کرتی ہیں۔ ان ٹیموں میں مختلف ممالک سے سیاسی رہنماؤں اور بیوروکریٹوں کو شامل کیا جاتا ہے۔

صحافت کی تربیت کے کئی خصوصی کورسز کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں تھامس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مختلف ممالک سے اخبار نویسوں کو بلا کر تربیت دی جاتی ہے۔

دولت مشترکہ کا فنڈ برائے ٹیکنیکل تعاون ترقی پذیر ممالک کے لیے بہت سود مند رہا ہے۔ اس پروگرام کے سلسلے میں ماہرین زیادہ تر آسٹریلیا، برطانیہ، کینیڈا اور نیوزی لینڈ سے آتے ہیں۔ ان کی مہارت سے فائدہ زیادہ تر افریقہ اور بحر ہند کے قریبی ممالک کو حاصل ہوتا ہے۔ جن شعبوں میں اطلاق زیادہ ہوتا ہے۔ ان میں تعلیم، سماجی بہبود، کامرس، ٹریڈ، ٹرانسپورٹ، مواصلات، صنعت، قانون زرعی اور دیہی ترقی، فنانس، اور ٹیکس، پبلک ایڈمنسٹریشن شامل ہیں۔

دولت مشترکہ کے اکثر ممالک میں اب جمہوری نظام چل رہے ہیں۔ ان کی پارلیمنٹوں کے درمیان رابطے کے لیے بین الپارلیمانی کانفرنسیں بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ پارلیمانی وفود بھی ترتیب دیے جاتے ہیں۔

دولت مشترکہ کے سلسلے میں ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر یہ بحث ہوتی ہے کہ دولت مشترکہ میں شامل ہونے سے کیا فائدہ ہے اور نہ شامل ہونے سے کیا نقصانات ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دولت مشترکہ کے تمام پروگرام کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ ٹیکنیکل فنڈ کے زمرے میں شامل پروگراموں کو بھی دیکھا جائے کہ اس سے ہمیں کہاں کہاں فائدہ ہوسکتا ہے۔ مسز کلیئر وائٹ اب پھر ٹیکسی کی تلاش میں ہیں۔

یہ جگہ ہماری دیکھی بھالی ہے۔

یہ کنگ چارلس اسٹریٹ میں حکومت برطانیہ کا محکمہ خارجہ اور دولت مشترکہ ہے۔

ہم یہاں محترمہ بینظیر بھٹو، وزیراعظم پاکستان کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کے صحن میں گارڈ آف آنر پیش کیا گیا تھا۔ ان دنوں مارگریٹ تھیچر وزیراعظم تھیں۔

سکیورٹی کے مراحل سے گزرتے ہوئے ہم محکمہ خارجہ کے جنوبی ایشیا کے شعبے میں جارہے ہیں۔ برطانیہ اپنی روایات کا تحفظ بھی کرتا ہے۔ اور ان سے محبت بھی کرتا ہے۔ یہ کئی سو سالہ پرانے دفاتر ہیں۔ جو

دو عالمی جنگیں بھی دیکھ چکے ہیں۔ اور نہ جانے کتنے انقلابات کا مرکز رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے بڑے بڑے دروازے کھلے برآمدے، محرابیں۔

محکمہ خارجہ کی ایک بزرگ خاتون ہماری رہنمائی کررہی ہیں۔

یہ مسٹر کرس ڈکس ہیں۔ جنوبی ایشیا کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ مسز ایلین واٹرز ہیں۔ تحقیق اور تجزیہ کے شعبے سے۔

کرس ڈکس، جواں سال ہیں۔ ایلن واٹرز کچھ ادھیڑ عمر کے ہیں۔

یہ پاکستان کے بارے میں ہم سے یقیناً کچھ زیادہ ہی جانتے ہوں گے۔ ان کا سفارت خانہ اور قونصلیٹ انہیں تازہ ترین معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ سفارت خانوں کے قونصل، سیکریٹری مختلف سیاسی رہنماؤں سے اس لیے ملتے ہیں۔ ہمارے سیاسی رہنما تو اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں کہ کوئی غیر ملکی اور وہ بھی سفید فام ڈپلومیٹ ان سے ملنے آئے یا انہیں اپنے دفاتر بلائے۔ پھر وہ ان سے کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ ایسی ایسی باتیں جو وہ اپنے ملکی صحافیوں یا اپنے سیاسی کارکنوں سے بھی نہیں کرتے۔ پاکستان میں متعین ڈپلومیٹ یہ تمام کوائف اور حالات حاضرہ اپنے محکمہ خارجہ کو بھیجتے رہتے ہیں۔ جہاں سے وہ متعلقہ شعبوں کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

موضوع گفتگو ممکنہ لانگ مارچ ہے۔ مہاجر قومی موومنٹ کیخلاف فوجی آپریشن ہے۔ ان لوگوں کو کراچی کے اکثر مسائل کا علم ہے۔ ہم دونوں صحافیوں کا تعلق کراچی سے ہے۔ اس لیے وہ سندھ کے لسانی مسائل۔ کراچی کی سیاسی گروپ بندی، ارکان اسمبلی کے استعفوں اور ان سے خالی ہونے والی سیٹوں پر ممکنہ امیدواروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم ان سے کچھ سوال کررہے ہیں۔ وہ ہم سے۔

پاکستان سے اگر کوئی سیاسی رہنما لندن آتے ہیں اور وہ محکمہ خارجہ میں کسی سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ تو شعبہ جنوبی ایشیا کے افسروں سے ہی ملایا جاتا ہے۔

محکمہ خارجہ کے اس حصے میں ہم پہلے بھی آچکے ہیں۔ اور اس کی چھت پر لکھے اپنے شہروں اور دریاؤں کے ناموں نے مجھے پہلے بھی متاثر کیا تھا۔ جب ہم انگریزوں کے غلام تھے۔ تو ہمارا دربار یہاں لگا کرتا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے نمائندے یہیں پیش ہوتے تھے۔ برصغیر کے معاملات پر یہیں مذاکرات ہوتے تھے۔ شاید اسی نسبت سے یہاں لاہور، ملتان، راوی، سندھ چناب وغیرہ کے نام مختلف نقش کاریوں کے ساتھ نظر آرہے ہیں یہ ''راج'' کی نشانیاں ہیں۔ جو انگریزوں کو عظمت رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔ یہیں سے بیٹھ کر وہ ہندوستان کی اقلیم کے فیصلے کرتے تھے۔ کسی زمانے میں تاج برطانیہ کی عملداری دنیا کے سارے براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا فرمان ہی چلتا تھا۔

اب یہ اقلیم پھر اپنے جزیرے میں سمٹ گئی ہے۔ اب اس دربار میں ہم معزز مہمانوں کی طرح آتے ہیں۔ پہلے ہمیں پابجولاں لایا جاتا تھا۔ اب یہ صرف حالات پوچھتے ہیں کہ کیسے ہیں۔ پہلے حالات کی باگ ڈور یہاں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔

پروگرام کے مطابق اب ہمیں کہیں دوپہر کا کھانا نوش کرنا ہے۔

مسز کلیرا ہماری میزبان ہیں۔ ہم ان سے کہہ رہے ہیں کہ وہ جہاں مناسب سمجھیں لے چلیں۔ سیکریٹریٹ اور پارلیمنٹ کے قریب ہونے کے باعث اس ریستوران کی بار میں بہت رش ہے۔ لنچ کا وقفہ بحث مباحثہ اور تبادلہ خیال میں گزرتا ہے۔ آوازیں شور بن رہی ہیں۔ سگریٹوں کا دھواں۔

کھانے کی میزوں پر اتنا رش نہیں ہے۔ شاید بار میں ہی کچھ ڈرنکس کے بعد وہیں ہلکے اسنیکس لے کر لوگ چلے جاتے ہیں۔ ہمیں کھانے کی میز آسانی سے خالی مل گئی ہے۔

مسز کلیئر مہنگائی کی شکایت کررہی ہیں۔ دونوں میاں بیوی کماتے ہیں۔ تب بھی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ چھٹیاں اپنی پسند کے مطابق نہیں گزار سکتے ہیں۔

متحدہ یورپ کا نظریہ مسز کلیئر کو پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے برطانوی تشخص کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ جس کے لیے برطانیہ نے کئی جنگیں لڑی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہاں اکثریت کو یہ خدشہ ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ برطانوی تشخص کم ہوتا چلا جائے گا۔

اپنے کام کو وہ پسند کرتی ہے۔ اس کی ذمہ داریوں میں باہر سے آنے والے مہمانوں کو پروگرام کے مطابق مختلف مقامات پر لے جانا اور لوگوں سے ملانا شامل ہے۔ انگلش بولنے اور جاننے والے ہوں تو اس کا پروگرام بہت دلچسپ رہتا ہے۔ کوئی دوسری زبان بولنے والے ہوں اور انگلش بالکل نہ سمجھتے ہوں تو بہت مشکل ہوتی ہے۔ مسز کلیئر کے خاوند ایک زمانے میں اسپین میں برطانوی سفارت خانے سے متعلق تھے۔ وہاں انہوں نے ہسپانوی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ اب اگر غیر ملکی مہمانوں میں کوئی ہسپانوی بولنے والا آجائے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں کہ اس طرح انہیں اپنی ہسپانوی روانی سے بولنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اور یہ جاننے کا بھی کہ انہیں یہ زبان کتنی یاد رہ گئی ہے۔


انڈیا آفس لائبریری لندن کا ایک منظر

پھر ٹیکسی۔ اور اب ہمیں ذرا دور کا سفر درپیش ہے۔ 197 بلیک فرائرز، روڈ پر واقع دی برٹش لائبریری، اورینٹل اور انڈیا آفس کی جمع کردہ دستاویزات۔

ٹیکسی ڈرائیور بالآخر پتا دریافت کرلیتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیونگ لندن میں سب سے مشکل کام ہے۔ آپ اسے ایڈریس مکمل بتادیں تو وہ آپ کو متعلقہ جگہ پر پہنچا کر ہی دم لے گا۔

☆......☆......☆

انڈیا آفس لائبریری میں چند گھنٹے

برصغیر میں انگریز کے چار سو سالہ ان الماریوں اور شیلفوں میں سانس لے رہے ہیں۔ کتنے ہی طالع آزماؤں کی داستانیں ایک دوسری قوم کو مجبور و مطیع بنانے کی کوششیں۔

انڈیا آفس لائبریری پاکستان میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اس کے حوالے سے کئی کتابیں، مضامین بھی آچکے ہیں۔ اس لائبریری کے سلسلے میں آزادی کے فوراً بعد بھارت کے وزیر تعلیم اور پاکستان کے وزیر تعلیم کے درمیان بات چیت ہوئی تھی۔ اس میں بھارت کی طرف سے مرکزی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد آئے تھے۔ اور پاکستان سے کرنل (ریٹائرڈ) عابد حسین، یہ اس وقت ہمارے وزیر تعلیم تھے۔ یہ جھنگ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پاکستان کی سفیر سیدہ عابدہ حسین انہی کرنل عابد حسین کی صاحبزادی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم، مورخ صحافی، اور ماہر تعلیم تھے۔ کرنل عابد حسین محض ایک زمیندار سیاستدان۔ انڈیا آفس لائبریری میں موجود خزانوں کی اہمیت کا احساس مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عالم اور ماہر تعلیم کو تو ہوسکتا تھا۔ کرنل عابد حسین اس سلسلے میں پاکستان کے حق کو کیسے جتلا سکتے تھے۔





اب میں برٹش لائبریری میں کھڑا ہوں۔ لفٹ سے ڈاکٹر رچرڈ بنگل باہر آرہے ہیں۔ یہ انڈیا آفس ریکارڈز کے سربراہ ہیں گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہیں۔ برٹش لائبریری میں آمد پر خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ خود ایک بڑے اسکالر ہیں۔ محقق ہیں۔ یہ ان کی عظمت ہے کہ وہ ہم بے مایہ کم علموں کے لیے نیچے استقبالیہ تک آئے ہیں اب ہمیں ساتھ لے جارہے ہیں۔ ان خزانوں میں، ماضی کے انمول نوادارت ہیں۔ جہاں ہمارے آباؤ اجداد کے ادوار حروف مطبوعہ میں زندہ ہیں۔

برٹش لائبریری برطانیہ کی قومی لائبریری ہے۔ اور لائبریری واطلاعاتی دائرہ کار میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ جولائی 1973ء میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت قائم ہوئی تھی۔ جس کے تحت برطانیہ کے پانچ بڑے اداروں کو آپس میں ضم کیا گیا۔ جو بنیادی طور پر قومی حوالوں، کتابیات اور کتابیں، جاری کرنے کی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔ یہ لائبریری اب دو مقامات سے تشنگان علم کی پیاس بجھاتی ہے۔ لندن Collection ابتدائی طور پر حوالے کے مقاصد کے لیے ہیں۔ ان میں سماجی علوم سے متعلق کتابیں ایک کروڑ 20 لاکھ کی تعداد میں ہیں ان کے ساتھ ساتھ مسودے، نقشے، موسیقی کے ریکارڈ اور ٹکٹ بھی بڑی تعداد میں جمع کیے گئے ہیں۔ ان کے مطالعے کے ہال برٹش میوزیم کی عمارت میں ہیں۔ جبکہ سائنس ریفرنس، انفرمیشن سروس ہولیورن میں۔ اور ٹیلی اور انڈیا آفس کے جمع کردہ ریکارڈز بلیک فرائرز روڈ کی بلڈنگ میں ہیں۔ جہاں اس وقت ہم موجود ہیں۔

لندن میں ہی ریسرچ اور ڈیلوپمنٹ ڈیپارٹمنٹ ہے۔ جس کا منصب لائبریری اور انفارمیشن سروس کی تربیت حاصل کرنے کے لیے گرانٹس جاری کرتا ہے۔ اور مقامی طور پر جمع کردہ ریکارڈز کو تحفظ دینا اور ان کی تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کو عوام تک پہنچانا ہے۔

لائبریری بتدریج اپنے دوسرے شعبوں کو ویسٹ یارک شائر کے قصبے بوسٹن ایس پی اے میں منتقل کررہی ہے جہاں 'ڈاکومنٹس سپلائی سینٹر' فی الحال موجود ہے۔ یہ سینٹر لائبریریوں اور دوسرے مجاز اداروں کو فوٹو کاپی اور دستاویزات مستعار دینے کا فرض ادا کررہا ہے۔ بوسٹن میں ہی نیشنل بیلوگرافرک سروس (قومی سطح پر کتابیات اور حوالہ جات کے اندراج کا ادارہ) موجود ہے۔ جو کتابوں کے حوالوں کو مختلف انداز اور صورتوں سے تلاش اور طبع کرنے کا ذمہ دار ہے۔

لیگل ڈیپارٹمنٹ آفس بھی حال ہی میں لندن سے یارک شائر منتقل کیا گیا ہے۔ لندن کے علاقے سینٹ پانکراز میں برٹش لائبریری کی نئی عمارت زیر تعمیر ہے۔ جہاں لندن کے جمع کردہ تمام ریکارڈز کو مربوط کیا جائے گا تاکہ لائبریری استعمال کرنے والوں، مطالعے اور تحقیق کی پیاس بجھانے والوں کو آسانی ہو سکے۔

ڈاکٹر رچرڈ بنگل برصغیر کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور جانتے رہتے ہیں۔ ان کی تحقیق اور مطالعہ اب بھی جاری ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے محفوظ شدہ کاغذات میں 350 برس سے چار سو برس کے دوران کے مسودے، تصاویر اور خطوط موجود ہیں۔ ان دستاویزات میں صرف پاکستان اور بھارت ہی نہیں بلکہ تبت چین، جنوب مشرقی ایشیا، بھارت، پاکستان، برما، بنگلہ دیش سے متعلقہ کاغذات شامل ہیں۔ بلکہ خلیج کے علاقوں کی کاغذات بھی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے کہ ریکارڈ 1947 کے بعد یہاں شفٹ کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان علاقوں میں نامور برطانوی آفیسر یہاں محکمہ خارجہ کو، اپنے خطوط اور دوسرے اہم سرکاری کاغذات ارسال کرتے تھے۔ وہ بھی ایک خاص وقت کے بعد قومی لائبریری کے حوالے کردیے جاتے تھے۔ جن میں لندن اور ان متعلقہ آفیسرز کے درمیان خط وکتابت ہے۔ عدالتوں کی کارروائیاں ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے سروے اور تصفیے کے ریکارڈز، ستر ہزار سے زیادہ ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے 65000 نقشے، جن کی مدد سے انگریز فوجی برصغیر کو فتح کرتے رہے محکمہ تعلیم کے کتابیاتی ریکارڈ، بپتسمہ اور شادی کے ریکارڈز، برطانیہ سے جو سپاہی اور دوسرے سرکاری افسر برصغیر جاتے تھے۔ ان کے بچوں کو بپتسمہ وہاں دیا جاتا تھا۔ شادیاں وہاں ہوتی تھیں۔ ان سب کے ریکارڈز، انڈیا آفس میں منتقل کردیے گئے تھے۔ ان فوجیوں اور افسروں کی اولادیں اپنی خاندانی تاریخ سے آگاہی کے لیے اس آفس سے رابطہ کرتے ہیں۔ یہ ریکارڈ کیٹیلاگ ہال میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اب تک یہاں تین لاکھ کے قریب افراد کے بارے میں معاملات یکجا کی جاچکی ہیں۔ پیدائش کی رجسٹریشن اور دیگر تفصیلات کے علاوہ تدفین کی تفصیلات بھی دستیاب ہیں۔ بعض خاندانوں کی وصیتیں بھی یہاں محفوظ ہیں۔ پنشن اور ایسے ہی دیگر فنڈز کے سلسلے میں بھی یہ ریکارڈ واضح معلومات رکھتا ہے۔

ڈاکٹر بنگل کہہ رہے ہیں کہ کوئی جوڑا بڑی بے تابی اور جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے آتا ہے کہ میرے دادا مدارس میں تھے۔ وہیں ان کی شادی ہوئی تھی۔ مجھے ان کا ریکارڈ دیکھنا ہے۔ ہمارا اسٹاف بھی ان کی مدد میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ ریکارڈ کئی میل لمبا ہے۔ اکثر خاندان اس ریکارڈ کی فوٹو کاپی یا مائیکرو ہم سے لے جاتے ہیں۔ اور اپنے خاندان کا یہ ریکارڈ بڑے فخر سے محفوظ کرتے ہیں۔ برصغیر میں اپنے فرائض ادا کرنے والے ان برطانوی افراد کا یہ ریکارڈ 1858ء سے 1947ء تک مستقل انڈیا آفس ریکارڈز میں جمع ہوتا رہا ہے۔ کئی خاندانوں نے اپنے طور پر بھی اپنے ریکارڈز ہمارے ہاں جمع کروادیے۔ اس ریکارڈ میں وہ خطوط بھی ہیں۔ جو سول سرونٹ (عام سرکاری افسر) اپنے والدین کو ہر ہفتے باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ ان والدین نے یہ خطوط تاریخ کا حصہ بنانے کے لیے اس آفس کے حوالے کردیے۔

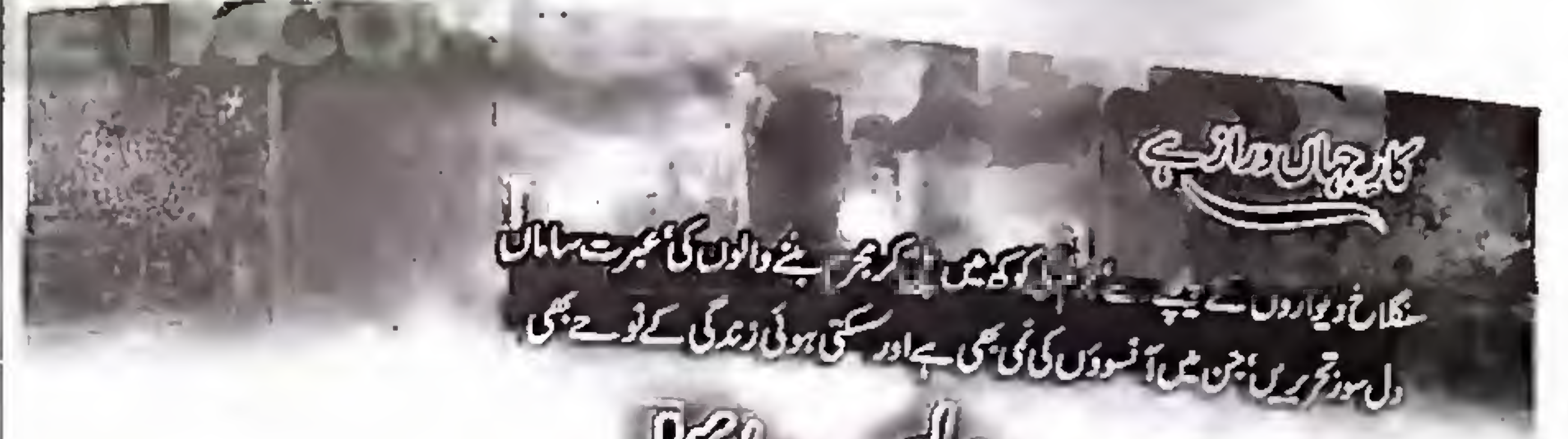
اسی ریکارڈز کا اہم حصہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ کے درمیان ہونے والی خط وکتابت بھی ہے۔ دہلی میں مقیم وائسرائے سیکریٹری آبادیات سے ہر ہفتے جو خط وکتابت کرتا تھا۔ اس میں اس ہفتے کے برصغیر کے اہم معاملات کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ اور کئی اہم پالیسی امور شامل ہوتے تھے۔ وہ زمانی میں برصغیر کی تاریخ مرتب کرنے میں یہ کاغذات بہت مدد کرسکتے ہیں۔



کواڈرنٹ ہاؤس لندن کا بیرونی

انڈیا آفس لائبریری کا آغاز کلکتہ سے ہوتا ہے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ریکارڈ جمع کرنے شروع کیے۔ 1867ء کے بعد لائبریری میں اضافہ بہت تیزی سے ہوا۔ کیونکہ پھر سرکاری طور پر یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ انڈیا میں کہیں بھی کوئی کتاب شائع ہو۔ وہ لائبریری میں ضرور جمع کی جائے۔ کتابیں یورپی زبانوں میں بھی تھیں۔ اور ورنیکر زبانوں یعنی فارسی، اردو بنگالی اور ہندی میں بھی۔ ہندوستان کی زبانوں میں چھپی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار کے قریب ہے۔ اور یورپی زبانوں کی کتابیں دو لاکھ 65 ہزار ہیں۔

برطانیہ کی دیگر دلچسپیوں کا حال ماہ ستمبر میں ملاحظہ فرمائیے



واپس جاؤ!



جاوید راہی

جیل سے بھاگ کر سائیں چڑی اور ساوی بابا
کے ڈیرے میں پناہ لینے والے قیدی کی عجب کہانی

میرے والد صاحب بڑے ہونے کے ناتے پوری فیملی کو ایک ہی سائبان کی چھت کے نیچے لیے ہوئے تھے۔ دادا جان کی وفات کے بعد سارے خاندان کا بوجھ اُٹھانا میرے والد صاحب کی ذمہ داری بن گئی۔ سارے چھوٹے بھائی والد صاحب کو'چودھری بھائی' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

سارے کاروبار کو تینوں بھائی یوں سنبھالے ہوئے تھے کہ زمینوں کی دیکھ بھال چچا اقبال اور چچا افضال کرتے جبکہ شہر کا سارا کاروباری معاملہ والد صاحب کے سپرد تھا۔ غلہ منڈی میں آڑھت اور ساتھ میں کھاد کی ایجنسی بھی تھی۔

چچا اقبال کی تین بیٹیاں ہی تھیں جبکہ چچا افضال کے دونوں لڑکے امتیاز اور امجد والد صاحب کے ساتھ آڑھت پر ہی ہوتے تھے۔ ہم دونوں بہن بھائی شروع دن سے ہی تعلیم کی طرف راغب چلے آرہے تھے۔ گریجویشن کے بعد میرا باجی کی شادی امتیاز بھائی سے کردی گئی اور میں ابھی کالج میں ہی تھا۔

میری والدہ صاحبہ نے دونوں کی بیویوں کو کبھی بھابیوں کا رشتہ نہیں دیا تھا بلکہ شروع سے ہی اپنی چھوٹی بہنیں تصور کیا۔

چچا اقبال کی بڑی بیٹی فری نے مشکل سے ایف اے کیا جبکہ دوسری دونوں بہنوں نے میٹرک میں ہی اسکول کو خیر باد کہتے گھر داری سنبھال لی۔

والدہ صاحبہ نے امجد بھائی کے لیے فری کو منسوب کر رکھا تھا، ویسے بھی ایک گھر میں رہتے دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

باتوں باتوں میں میرا نام مریم کے لیے لیا گیا مگر والدہ صاحبہ نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ رضوان تو ابھی پڑھ رہا ہے۔"

والد صاحب کے پاس اکثر ایک بزرگ آیا کرتے تھے۔ جنہیں وہ پیر صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ گھنٹوں وہ اوپر والے حصے میں پتا نہیں کیا راز و نیاز کرتے؟ پھر رات بسر کرکے وہ اپنے گاؤں واپس چلے جاتے۔

والد صاحب سٹے کا دھندہ بھی کرتے تھے۔ کئی بار پیر صاحب (بقول والد صاحب) کی دُعا سے بڑا فائدہ ہوا۔ یہاں تک کہ پیر صاحب اگر کسی بات کی نفی کردیتے تو مجال ہے کہ والد صاحب اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھتے۔

میں اپنے کمرے میں اسٹڈی کر رہا تھا کہ میرے والد صاحب کی آواز آئی "اور رضو"۔

گھر والے کبھی مجھے رضو کہہ کر بلاتے تھے۔ میں جی آیا جی کہتے تیزی سے اوپر کی طرف لپکا۔ وہ کمرے میں زمین پر بیٹھے تھے جبکہ پیر صاحب اوپر بیڈ پر۔ مجھ پر نگاہ پڑتے وہ بولے۔

"جلدی سے جاکر سوا کلو گوشت لے آؤ۔" انہوں نے پانچ سو کا نوٹ میری طرف بڑھاتے کہا۔ میں انہی قدموں واپس ہوگیا اور نیچے آکر موٹر سائیکل سنبھالی اور مارکیٹ کی طرف چل پڑا۔

مارکیٹ کے اندر بڑے گوشت کی ایک ہی شاپ تھی مگر اس پر گوشت ختم ہو چکا تھا۔ اب مجھے بڑا گوشت تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور چل پڑا مگر گہری مایوسی۔ ایک دوکاندار نے بتایا کہ باہر والے موڑ پر ایک دوکان ہے شاید وہاں سے مل جائے۔ شہر سے خاصا فاصلہ تھا اس دوکان کا جبکہ والد صاحب نے جلد آنے کی تاکید کی تھی اس لیے میں موٹر سائیکل کو اُڑائے لیے جارہا تھا۔ وہاں گوشت مجھے آسانی سے مل گیا۔

واپسی پر میری اسپیڈ پہلے سے بھی زیادہ تھی یکدم ایک سات آٹھ سالہ لڑکا سڑک کراس کرتا موٹر سائیکل کے سامنے آگیا اور میں اسے بچا نہ پایا۔ موٹر سائیکل کی ٹکر سے وہ دور جا گرا۔ میں بھی سڑک پر لڑکھڑاتا کافی دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ میرے بھی چوٹیں آئیں مگر وہ لڑکا کافی حد تک زخمی ہوا تھا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ تھے میں نے موقع غنیمت جانتے گوشت اور موٹر سائیکل اٹھایا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

والد صاحب نے ڈانٹ کر پوچھا کہ اتنی دیر کہاں لگادی۔ تو میں نے تفصیل بتاتے گوشت اور بقایا پیسے ان کے آگے رکھ دیے اور خود کمرے سے نکل کر نیچے آگیا۔

والدہ صاحبہ نے میرے زخموں سے نکلتے خون کو دیکھ کر وجہ پوچھی تو انہیں بھی میں نے سچ سچ سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے میرے زخم صاف کر کے ان پر مرہم لگائی اور آرام کرنے کا کہا اور پیر صاحب کی شان میں قصیدے پڑھتی کچن کی طرف چلی گئیں۔

☆......☆......☆

صبح ہمارے گھر پولیس آ پہنچی۔ اُن کی زبانی پتا چلا کہ جو لڑکا میری موٹر سائیکل سے ٹکرایا تھا اسے ہسپتال







سے نازک حالت میں لاہور ریفر کر دیا گیا۔ وہاں کسی نے میری نشاندہی کرتے بتایا کہ میں چودھری بھائی کا بیٹا تھا اور یوں پولیس گھر پہنچ گئی۔

پولیس کو دیکھ کر آس پاس کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ والد صاحب نے بہت کوشش کی مگر کوئی بات نہ بنی اور مجھے ملازم اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔

میں اس صورتحال سے خاصا دلبرداشتہ اور سہما ہوا تھا۔ لڑکے کے ورثا گو اتنی پہنچ والے نہیں تھے مگر اس لڑکے کی حالت کے پیشِ نظر پولیس ان کی ہی طرفداری کر رہی تھی۔ والد صاحب شہر میں خاصے اثر و رسوخ والے تھے مگر کوئی بھی حربہ کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ میں حوالات میں بند اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اگر لڑکے کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟

مجھے اپنے والد صاحب پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور پیر صاحب پر تو میرا بس نہیں چل رہا تھا جن کے جادو گنڈے کے لیے گوشت لینے نکلا اور حادثہ پیش آ گیا۔

رات حوالات میں بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔ دوسرے دن ایکسیڈنٹ کی دفعہ کے مطابق میرا چالان کر دیا گیا۔ تیسرے دن لاہور ہسپتال سے لڑکے کے مرنے کی اطلاع موصول ہوگئی، ڈر کے مارے میرے اوسان خطا ہو گئے۔

میرے خلاف زیرِ دفعہ 304 الیف بھی مقدمہ میں شامل کر لی گئی۔ سارے گھر میں اس صورتحال پر صفِ ماتم کا سا ماحول تھا۔

میرا چالان مکمل کر کے عدالت پیش کیا گیا، میرے وارنٹ تیار ہو رہے تھے۔ عدالت لانے والا تھانیدار اور کانسٹیبل مجھے لے کر عدالت کے سامنے بنے گراسی پلاٹ کے دونوں جانب درختوں کے سائے میں آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد تھانیدار یہ کہتا ہوا اُٹھا کہ میں وکیل کے چیمبر سے ہو کر رضوان کے وارنٹ کا پتا کر آؤں تم خبردار ہو کر بیٹھنا۔

''جی جناب''۔ کانسٹیبل (جو ریٹائرڈ ہونے کی عمر میں تھا) نے سر ہلاتے تھانیدار کو مطمئن کیا تو وہ عدالت کی طرف چلا گیا۔

میں نے ڈرے سہمے لہجہ میں کانسٹیبل کو مخاطب کیا۔

''سر اَب کیا ہوگا''؟

''کچھ نہیں، تمہارے وارنٹ سائین ہو جائیں تو تمہیں جیل روانہ کر دیا جائے گا اگر ورثا کو راضی کر لیا تمہارے والدین نے تو شاید مقدمہ خارج ہو جائے۔''

''اگر مقدمہ چلا تو عدالت مجھے کیا سزا دے گی؟''

''اب مضروب چونکہ مر چکا ہے اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عدالت تمہیں رعایت دے گی، مرا تو تیری غلطی سے ہے نا، اب بھگتو۔'' کہہ کر کانسٹیبل نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالتے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور ماچس جلانے میں مصروف ہو گیا۔

ہتھکڑی کا سنگل اس نے اپنے پیر کے نیچے دبا رکھا تھا۔ ایک لمحہ گزرا اور میں نے زور کا جھٹکا دیتے سنگل کھینچا اور اندھا دھند بھاگتا ہوا عدالت کی دیوار پھاند گیا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ اس کانسٹیبل نے ہتھکڑی کے دونوں کڑے میرے ایک ہی بازو میں لگائے تھے۔ اسے تو شاید مجھ سے یہ توقع نہیں تھی اور میرے اندر بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی خدا جانے مجھ میں یہ طاقت کہاں سے آ گئی کہ میں بھاگ نکلا۔

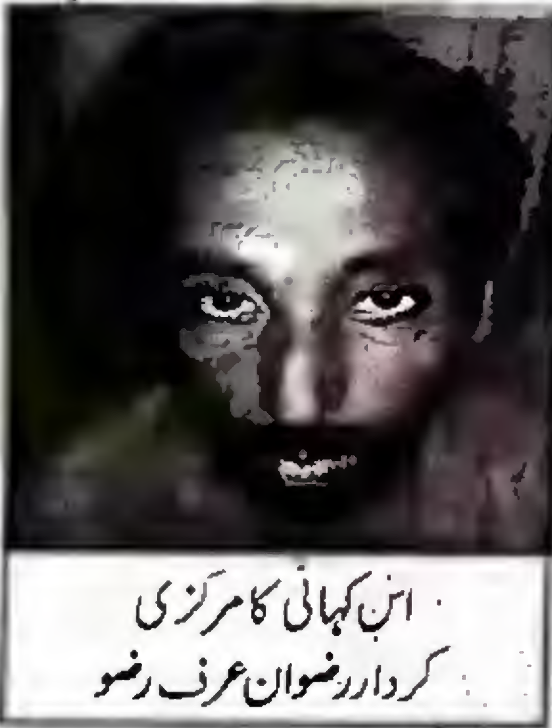
میرے پیچھے صرف کانسٹیبل بھاگا آ رہا تھا میں لوگوں کے سامنے بھاگا جا رہا تھا مگر کسی نے مجھے پکڑنے کی کوشش نہ کی، یہ شاید پولیس کے خلاف نفرت تھی ورنہ کسی کو بھی مجھے قابو کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ کانسٹیبل کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ میں نے بھاگتے ہوئے ہتھکڑی کا سنگل اپنے بازو پر لپیٹ کر قمیض کا بازو اس کے اوپر چڑھا دیا۔

پہلی نظر میں دیکھنے پر کسی کو شبہ نہیں ہوتا کہ میرے بازو پر ہتھکڑی لگی ہوئی ہے۔ میرا رُخ کھیتوں کی طرف تھا۔ میں بجائے شہر کی طرف رُخ کرتا میں نے ریلوے لائن والی سائیڈ کو سامنے رکھ لیا اُدھر جھاڑیاں اور آمد و رفت بھی کم تھی اس لئے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی بھاگنے میں۔ کالج کی ٹیم کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لیتے رہنے کی وجہ سے مجھے بھاگنے میں کوئی دِقت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

کبھی کبھار گزرنے والوں کی نظروں سے بچتا ہوا میں کافی دور نکل آیا تھا۔ اب سب سے پہلا کام خود کو

ہتھکڑی سے آزاد کرنا تھا اس کے لیے مجھے ریلوے لائن کے دونوں اطراف لگے لوہے کے بڑے کیل جن سے لائن کے درمیان لگے لکڑی کے پھٹے اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ ایک دو کو ہاتھ میں پکڑے پتھر کی مدد سے اُکھاڑنے کی کوشش کی مگر سخت مایوسی ہوئی لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ جب چلتے چلتے تھک جاتا تو کسی جھاڑی کی اوٹ میں رُک کر ذرا سا آرام کر لیتا اور پھر آگے چل پڑتا۔

کوئی چھوٹا سا غیر آباد اسٹیشن تھا، جس کی عمارت دور سے دکھائی دی جب میں قریب گیا تو پتا چلا کہ وہ ٹوٹے پھوٹے کوارٹر تھے جن کے دروازے کھڑکیاں غائب تھیں۔ شاید ریلوے نے یہ چھوٹا سا اسٹیشن لاوارث قرار دے دیا تھا اور لوگ یہاں کی ہر چیز اُکھاڑ کر لے گئے تھے۔ بھوک سے نڈھال اور خوف سے بھرا اپنا وجود سمیٹے میں نامعلوم راستوں پر آگے بڑھ رہا تھا۔



اس کہانی کا مرکزی کردار رضوان عرف رضو

کبھی مجھے اپنے گھر سے باہر تک جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر اب میں جس انداز سے چل رہا تھا اس سے میرے اندر خود کو بچانے کی جدوجہد جاگ اُٹھی تھی۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد میں اُٹھ کر دوبارہ چل پڑا۔ جب کوئی گاڑی گزرتی تو میں خود کو اِدھر اُدھر چھپا لیتا اسی طرح مسلسل آگے بڑھتے دِن ڈھل گیا۔

میرے سامنے ریلوے لائن سے ذرا ہٹ کر شاید کسی پرائیویٹ کمپنی نے اپنے گودام بنا رکھے تھے جس جگہ چھپ کر میں جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے وہاں کچھ لوگ کھانا بناتے دکھائی دیے وہ یا تو لیبر والے تھے یا پھر ان گوداموں کے کرتا دھرتا ہوں گے۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر گوداموں کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ میرا اور ان کا فاصلہ تھوڑا ہی تھا۔ میں ان کی نظروں سے بچتا ہوا رہائشی حصے کی طرف آ گیا۔ وہ سب کھانے کے چکر میں لگے ہوئے تھے اور مجھے تلاش تھی کسی ایسے اوزار کی جس کی مدد سے میں خود کو ہتھکڑی سے آزاد کر لیتا مگر بے سود۔

یہاں سے نکل کر میں گوداموں کے شیڈ والے بلاک کو عبور کر کے پرانے ناکارہ کھڑے ایک ٹریکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لوہے کی ایک ہُک تھی جو شاید ٹرالی کو ٹریکٹر کے ساتھ جوڑنے کے لیے کام آتی ہوگی جس کو میں نے آہستگی سے کھینچ کر باہر نکال لیا اور رینگتا ہوا گوداموں سے کافی فاصلے پر آ گیا۔

وہاں سے چلتے ہوئے میں نے ایک پتھر بھی اُٹھا لیا تھا جو میری بغل میں تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ان کی نظروں سے خاصا دور ہوں تو قمیض بازو سے اوپر کرتے ہتھکڑی کے تالے میں لوہے کی ہُک پھنسا کر ہتھکڑی پر ضرب لگائی تو وہ کھل گئی اسی طرح میں نے دوسرا تالا بھی توڑ دیا پھر وہ سنگل اور ہتھکڑی کو زمین سے مٹی ہٹا کر دفن کر دیا۔

اب میں آزاد تھا پھر ایک فیصلہ کرتے دوبارہ گودام کی طرف چل پڑا۔ اب میں چھپنے کی بجائے سیدھا اس طرف جا رہا تھا جہاں وہ لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ قریب جا کر میں نے سلام دُعا کے بعد پانی مانگا تو ان میں سے ایک نے میرے آگے پلیٹ میں سالن رکھتے کھانے کا اشارہ کیا تو میں کچھ بولے بغیر کھانے میں جُت گیا۔ جب پیٹ بھر گیا تو ذہن نے بھی کام کرنا شروع کر دیا۔

اسی نے مجھ سے پوچھا کہ ''اس وقت کدھر؟'' تو میں نے فوراً من گھڑت کہانی تراشتے اسے بتایا کہ دوسری طرف ہمارا گاؤں ہے کالج کے ہوسٹل میں رہائش پذیر ہوں۔ دو ماہ کی فیس نہیں ادا کر سکا جس کی وجہ سے ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ اب میں گھر جا رہا ہوں۔''

''اتنی رات گئے؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے''۔ میں نے اس ہوشیاری سے جھوٹ بولا تھا کہ سب کو میری بات پر یقین آ گیا۔ مجھے چائے بھی دی گئی اور رات رُکنے کی بھی آفر کر دی، اس نے جس سے میں

نے پانی مانگا تھا اور اس نے کھانا میرے آگے رکھ دیا تھا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے چائے کی پیالی سنبھالتے جواباً کہا۔

وہ رات میں نے گوداموں میں گزاری صبح ناشتا ان کے ساتھ کیا اور اجازت لے کر دوبارہ نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔

ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں اپنے گھر والوں کے بارے میں بھی سوچتا جا رہا تھا کہ پولیس والے میرے فرار ہونے کے بعد ضرور گھر والوں سے پوچھ گچھ کرنے پہنچ گئے ہوں گے۔ اپنے پکڑے جانے کا خوف اپنی جگہ الگ تھا۔

اب جو راستہ میں نے اختیار کر رکھا تھا وہ کوئی نہر تھی جس کے دونوں کناروں پر گھنے درختوں کا سلسلہ پانی کے بہاؤ کی جانب تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ ریلوے لائن کو میں نے اس لیے چھوڑ دیا کہ اب آنے جانے والوں کی آمد و رفت تھی۔

ناشتا میں نے پیٹ بھر کر کیا تھا اور ایک پراٹھا میں نے شاپر میں بھی ڈال لیا تھا۔ پانی کی بوتل بھی ہاتھ میں رکھ لی تھی۔ راستے میں دو تین آبادیاں آئیں مگر میں رُکا نہیں چلتا جا رہا تھا۔ جب کافی تھک گیا تو ایک جگہ بیٹھ کر پراٹھا کھا کر پانی پیا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی اور میں ایک ایسی جگہ پر آ رُکا جہاں کوئی پرانے زمانے کا قبرستان تھا۔ ایک دو دربار بھی تھے جن پر کئی ملنگ ٹائپ بابے ڈیرہ ڈالے نظر آئے۔ میرا رُخ قبرستان کے داخلی حصہ میں بنے دربار کی طرف تھا۔ دربار کے باہر بڑا سا گڑھا تھا جس میں لکڑیاں روشن تھیں اور اس کے چاروں اطراف بڑے ادب سے چند ایک لوگ ایک بزرگ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ وہ بزرگ دین کے بارے میں وعظ کر رہا تھا اور وہاں موجود سبھی لوگ بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔

دو ملنگ مٹی کی بڑی سی دوری میں کوئی سبزی چیز رگڑ رہے تھے میرا دھیان بزرگ کی باتوں کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی طرف بھی تھا جو سلور کے ڈول میں وہ رگڑا اُنڈیل کر اس میں دودھ ڈال رہے تھے۔ وعظ ختم ہونے پر سب کو مٹی کے پیالوں میں وہ سبز سفید مشروب پیش کیا گیا۔ مجھے بھی پیالہ ملا میں نے سب کی تلقین میں پہلا گھونٹ بھرا تو اس کا ذائقہ میری سمجھ سے باہر تھا مگر میں نے پیالہ پی کر خالی کر دیا۔ اسی دوران خالی پیالے کو پھر بھر دیا گیا۔ جہاں وہ بزرگ اس محفل کی امامت کر رہے تھے وہاں وہ سارے نظام کی نگرانی بھی کر رہے تھے۔ جس کا پیالہ خالی ہوتا وہ آواز دے کر دوبارہ بھروا دیتے۔ دوسرا پیالہ بھی میں نے خالی کرتے واپس پکڑا دیا۔ وہاں موجود لوگوں میں سے کچھ اُٹھ کر جا چکے تھے اور بقایا جو میرے سمیت بیٹھے تھے وہ شاید دربار کے اور بزرگ کے پکے خادمین ہوں گے۔

میرا سارا وجود عجیب قسم کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا اور میں وہاں سے اُٹھ کر دربار شریف کی باہر والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ مجھے ان کی آواز دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

جس دن سے پولیس مجھے پکڑ کر تھانے لائی تھی اسی دن سے پہنا ہوا شلوار سوٹ دھول سے اَٹا پڑا تھا۔ میرے اپنے جسم سے سڑاندسی اُٹھ کر مجھے ناگوار محسوس ہو رہی تھی تو دوسروں کو یہ بدبو کیسی لگتی ہوگی؟

میں اسی طرح دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے دنیا مافیہا سے بے خبر رات بھی پڑا رہا۔ میرا سارا جسم ساکت، ذہن بوجھل تھا۔ دربار کے متولی بزرگ اپنے بستر پر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ دونوں بابے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ قبرستان میں چند عورتیں اور مرد شاید اپنے پیاروں کی قبروں پر مٹی ڈالتے اور فاتحہ خوانی کرتے پھر رہے تھے۔ میں اُٹھ کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ قدم زمین پر یوں پڑ رہے تھے جیسے میں ہوا میں تیر رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا چیز تھی؟ جو انہوں نے مجھے پلا دی جس کی وجہ سے میرا بُرا حال ہو گیا تھا۔

واپس آیا تو باباجی اُٹھ کر بیٹھے ہوئے تھے اور دونوں ملنگ بھی آ چکے تھے۔ ان کی بالٹیوں میں طرح طرح کے سالن اور روٹیاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کہیں سے مانگ تانگ کر لائے ہیں۔ مجھے بھی کھانے کے لیے روٹی مل گئی۔ پھر یہ معمول ہو گیا میرا کہ میں قبرستان میں ان ملنگوں کے ساتھ قبروں کی مرمت اور لیپا تاپی میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔

میرا حلیہ بھی بدل گیا۔ بھنگ چرس کے نشہ نے مجھے بھی درویش بنا دیا۔ میں کون تھا؟ اور کہاں سے آیا تھا؟ نہ کسی نے پوچھا نہ میں نے بتایا۔ آس پاس کے کئی بڑے چھوٹے دیہات تھے جہاں میں بھی سائیں چڑی اور ساوی بابا کے ہمراہ بھیک مانگنے جانے لگا تھا۔ میری شکل بگڑ گئی، نہانا دھونا نہ صفائی ستھرائی بس بھیک مانگ کر کھا لیا اور بھنگ چرس پی کر کسی کونے میں خارش زدہ کُتے کی طرح سر پھینک کر پڑے رہنا...... یہ تھی میری زندگی جو والد صاحب کے پیر صاحب نے میرے مقدر میں لکھ دی۔

دربار کے متولی پیر بالے شاہ مجھ سے اس لئے بھی بہت خوش تھے کہ میں کئی کئی گھنٹے ان کی ٹانگیں دباتا رہتا۔

اب میں سائیں چڑی کی شاگردی میں بھنگ گھوٹنے اور چرس کے سگریٹ بنانے میں بھی ماہر ہو چکا تھا۔ دونوں نے مجھے قبر کھودنے اور مرمت کرنے کا بھی ہنر دے دیا۔

سائیں چڑی پھیری پر گیا ہوا تھا اور ساوی بابا کے دو دن سے کھانسی بخار میں پڑا ہونے کی وجہ سے سارے کام مجھے ہی سرانجام دینے پڑتے تھے۔

قریبی گاؤں میں ایک بچہ گزر گیا اور قبر بنانے کے لیے اس کا رشتہ دار مجھے ہزار روپے پکڑا کر چلا گیا جنازہ چار بجے آنا تھا۔ میں قبر کھودنے کا سامان اُٹھا کر اس کونے کی طرف چل پڑا جہاں اب قبریں بنائی جاتی تھیں۔

خالی جگہ کا انتخاب کر کے میں نے کدال، کُھرپی اور دوسرے اوزار نیچے رکھے اور کدال سے زمین کی مٹی ہٹانے لگا۔ جب میں نے لحد تک کھدائی کر لی تو ستانے کے لیے قبر سے باہر نکلا اور قریب کھڑے برگد کے درخت کے نیچے آ بیٹھا۔ جیب میں رکھا چرس بھرا سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لگانے لگا۔ دو چار لمبے لمبے سوٹے کھینچ کر میں نے کمر درخت کے تنے سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔ چرس کا سرور دماغ میں تاریکی بھر چکا تھا۔ وجود کی تھکاوٹ کو سمیٹ کر میں دوبارہ اُٹھا اور قبر میں اُتر کر کام کرنے لگا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ قبر ہر طرح سے تیار ہو چکی ہے تو اپنے اوزار سمیٹتا قبر سے باہر نکل کر جب کھڑا ہوا تو سامنے برگد کے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے ایک خوبرو لڑکی کو بیٹھے دیکھا جو میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

پہلے میں سمجھا کہ شاید مرنے والے کی کوئی عزیزہ ہے جو بچے کی قبر دیکھنے آ پہنچی ہوگی مگر جب ذرا قریب ہو کر اس کا جائزہ لیا تو اس کے چہرے کی تازگی بتا رہی تھی کہ اسے کوئی پریشانی نہیں۔ میرے قریب کھڑے ہونے کا اس نے کوئی نوٹس نہ لیا اور ''بولی تیار ہو گئی قبر؟''

''جی ہاں مگر آپ یہاں؟''

اس نے میرے منہ سے لفظ اُچک لیا۔

''کیوں قبرستان میں آنا منع ہے کیا''؟ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''نہیں یہ بات ہرگز نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا''۔ میں نے اپنے اوزار ترتیب سے ایک جگہ رکھتے جواباً کہا۔

''مرنے والا بچہ آپ کا کچھ لگتا ہے؟''

''نہیں تو''! اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''تو پھر آپ یہاں؟'' میں نے اپنے اوزار اُٹھاتے پھر سوال کیا۔

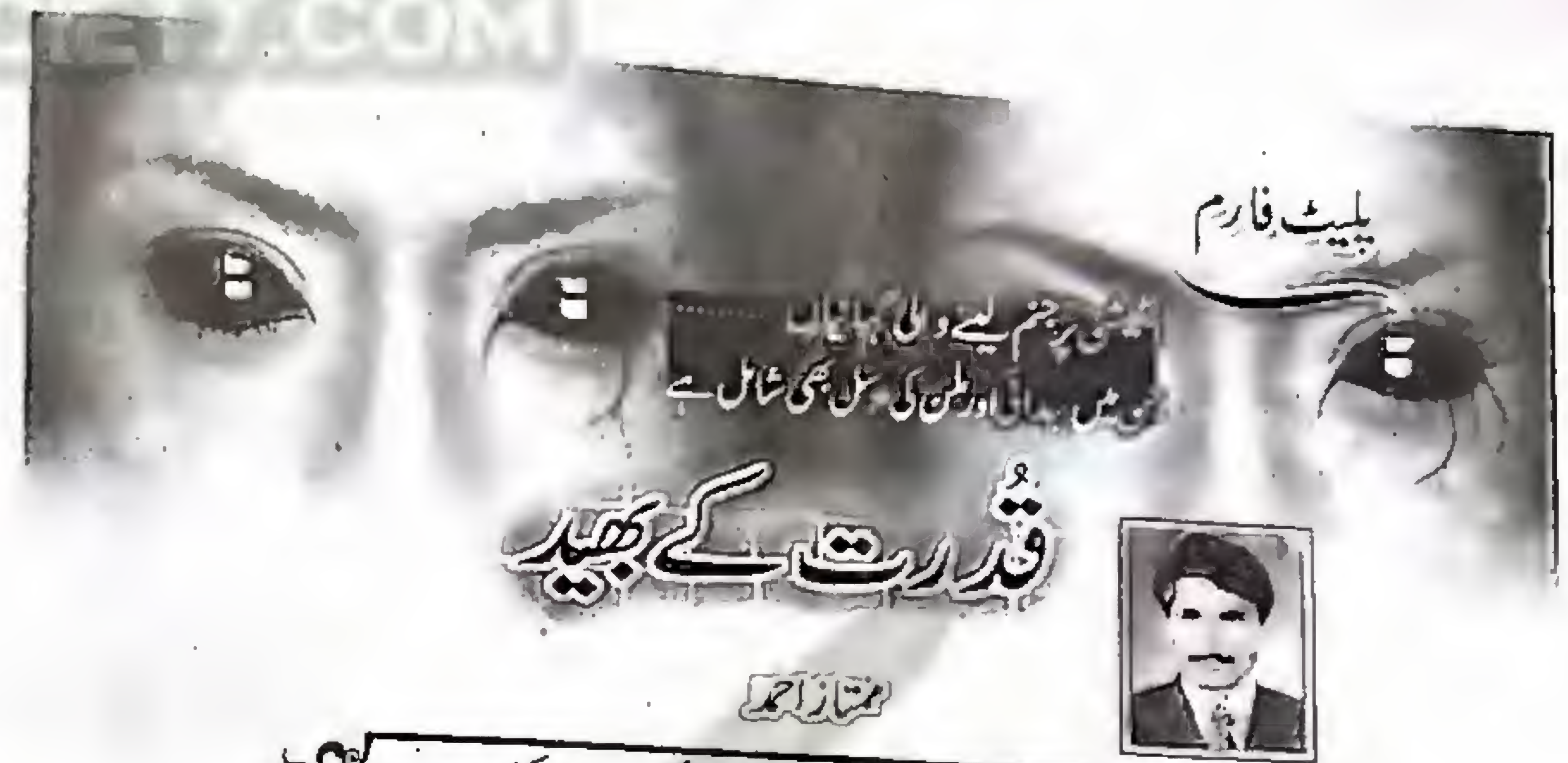
''بتا تو چکی ہوں کہ یہاں قبرستان آنا منع ہے''؟ میں لاجواب سا ہو کر دربار کی طرف چل پڑا۔

بچہ دفنا کر اس کے لواحقین کب کے جا چکے تھے۔

میں اپنے نشہ پانی سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر آ گیا جو میں نے پیر بالے شاہ کے پاؤں کی جانب زمین پر بچھا رکھا تھا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند نے دبوچ لیا۔

صبح فجر کے وقت میں اُٹھ کر جایا کرتا تھا۔ مجھے گاؤں میں روٹی سالن اکٹھا کرنے کی پھیری لگانا ہوتی تھی۔ کھیتوں سے فراغت کے بعد میں ہاتھ منہ دھو کر اپنی بالٹی اور تھیلا اُٹھاتا قبرستان سے باہر جانے والے راستے کی طرف ہو گیا۔

جب پھیری لگا کر واپس آیا تو پیر بالے شاہ کے پاس کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا۔ پہلے تو میں گھبرا گیا کہ کہیں



قُدرت کے بھید



ممتاز احمد

پلیٹ فارم پر اُس حسین دوشیزہ کی دو ٹکڑوں میں کٹی

لاش اُس نے دیکھی تھی...... پھر وہ زندہ کیسے ہوگئی تھی

بچپن اور زمانہ طالب علمی سے ہی میں ایک سیلانی انسان ہوں۔ آوارہ گردی، گھومنا پھرنا، سیر سپاٹا میری فطرت میں شامل ہے۔ ہوتا یوں جیسے ہی کالج سے گرمی کی چھٹیاں ہوتیں تو اگلے ہی روز بیگ کاندھے پر لٹکائے میں کسی نہ کسی علاقے کی سیاحت کے لیے نکل پڑتا۔ سفر مجھے ہمیشہ ٹرین کا اچھا لگتا اور ٹرین کا ہی سفر کرتا۔

میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور کئی جگہوں پر جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ کچھ ٹیسٹ انٹرویو دے چکا تھا۔ مگر کہیں سے سلیکشن کی کال نہ آ سکی تھی۔

ایک دن مجھے ایک محکمہ کی طرف سے ٹیسٹ اور انٹرویو کی کال موصول ہوئی۔ جس شہر میں ٹیسٹ انٹرویو ہونا تھا۔ وہ ہمارے شہر سے کافی دور تھا اور اٹھارہ بیس گھنٹے کا سفر تھا۔ تحریری امتحان کی تاریخ بیس تھی۔ مگر میں نے پانچ روز پہلے پندرہ تاریخ کو رختِ سفر باندھا اور اپنے ضروری سامان اور تمام کاغذات ڈگریوں وغیرہ کو ایک بیگ میں ڈالا اور ٹرین میں بیٹھ گیا۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ٹرین ساری رات چلتی رہی۔ تقریباً صبح چار بجے کے قریب ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ ٹرین کے رُکتے ہی پنکھے اور لائٹیں بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد گرمی کی وجہ سے سوئے ہوئے مسافر بیدار ہونا شروع ہوگئے۔ اور آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ ٹرین کیوں رُک گئی ہے۔ آہستہ آہستہ کچھ مسافر ٹرین سے نیچے اترنے لگے، تو ان کے ساتھ میں بھی نیچے اتر گیا۔

ٹرین آبادی سے ہٹ کر ایک کھلے میدان میں کھڑی تھی۔ دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ کھیت تھے۔ درختوں کی قطاریں اور دائیں طرف تھوڑا سا آگے ایک گھنا جنگل تھا۔ ٹرین کے رکنے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ انجن کے الیکٹریکل نظام میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ جس کی وجہ سے ٹرین کا انجن لائٹیں اور تمام پنکھے AC بند ہوگئے ہیں اور اگلے اسٹیشن سے کوئی انجن آئے گا۔ تب وہ ٹرین کو لے کر آگے جائے گا۔ اور نئے انجن کے آنے میں کم از کم ڈیڑھ سے دو گھنٹے لگیں گے۔ اب اتفاق سے مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور سگریٹ کی بھی شدید طلب تھی کیونکہ سگریٹ بھی ختم ہو چکے تھے۔ تو میں نے سوچا کے دوسرا انجن آنے تک اردگرد کوئی آبادی تلاش کرتا ہوں۔ جہاں سے کچھ کھانے کو اور سگریٹ مل جائیں۔



چنانچہ میں اکیلا ایک جانب پیدل چل پڑا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ چلتا رہا مگر دائیں بائیں، آگے پیچھے دور دور تک کوئی آبادی کے آثار نہ تھے۔ سپیدہ سحر نمودار ہونا شروع ہوگیا تھا۔ پھر میں ریلوے لائن کے ساتھ ہی واپس چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور ہی آگے آیا تھا کہ میں ایک دم ٹھٹھک کر رُک گیا۔ دیکھا کہ ریلوے لائن کے اوپر ایک انتہائی خوب صورت اور جوان لڑکی کی لاش دو ٹکڑے پڑی ہوئی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی اُس کے اوپر سے ٹرین گزری ہے۔ اس کے کٹے ہوئے جسم سے تازہ خون رس رہا تھا اور اُس کے مردہ چہرے پر تکلیف اور شدید کرب کے آثار نمایاں تھے۔ میں چند منٹ غور سے لاش کے پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ میں تیز تیز دوڑتا رہا پسینے سے شرابور۔ جس جگہ ٹرین کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچا تو ٹرین نہیں تھی۔ ٹرین یقیناً اگلے اسٹیشن پر جا چکی تھی۔ میرا بیگ بھی گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ ایک تو میں اس لڑکی کی لاش دیکھ کر بدحواس ہوگیا تھا، دوسرا ٹرین جا چکی تھی اور تیسرا یہ کہ میرا

بیگ بھی گاڑی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اب پتا نہیں وہ مجھے ملتا بھی یا نہیں۔ چوتھا یہ کہ بھوک اور گرمی سے نڈھال چنانچہ میں بوجھل قدموں سے ریلوے لائن پر آگے کی طرف چلتا رہا۔

کوئی دو گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد بالآخر ایک ریلوے اسٹیشن کے آثار نظر آئے۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے کولر سے پانی پیا اور پھر کینٹین یا کھانے پینے والے اسٹال، ٹھیلے کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تو اچانک مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، دیکھا کہ پلیٹ فارم پر بنے ایک بینچ پر وہی لڑکی بیٹھی تھی۔ جس کی لاش دو ٹکڑوں میں کٹی ریلوے لائن پر دیکھ کر آیا تھا۔ اب وہی زندہ حالت میں بنچ پر بیٹھی تھی۔ مجھ پر خوف سے ہلکی سی کپکپی طاری ہوگئی اور میں حیرت سے سوچوں میں گم تھا کہ ایک پسنجر ٹرین آ کر رُکی اور وہ لڑکی جلدی سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی جلدی سے اس ٹرین میں سوار ہو جاؤ۔ یہ صرف پندرہ سے بیس سیکنڈ یہاں رُکتی ہے۔ تمہاری جو ٹرین چھوٹ گئی تھی۔ وہ اگلے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔

میں جیسے ہی ٹرین میں سوار ہوا گاڑی چل پڑی اور میں نڈھال ہو کر ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیس منٹ کے بعد وہ ٹرین اگلے اسٹیشن پر پہنچی تو میں نیچے اتر گیا اور دیکھا وہ ٹرین جو مجھ سے چھوٹ گئی تھی۔ دوسرے پلیٹ فارم پر روانگی کے لیے تیار تھی۔ میں دوڑ کر ریلوے کراسنگ پُل کے ذریعے دوسرے پلیٹ فارم پر پہنچا تو وہ ٹرین چل پڑی۔ اور میں بھاگ کر بمشکل اس کے آخری ڈبے میں سوار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ بھوک اور تھکن سے بے حال تھا تو ایک خالی برتھ پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اچانک میری آنکھ کھلی تو پتا چلا یہ تو وہی ریلوے اسٹیشن ہے جہاں مجھے آنا تھا۔ یہی وہ شہر تھا۔ جہاں میرا جاب کے لیے انٹرویو تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور برتھ سے اتر کر نیچے آیا تو گاڑی بیس منٹ کے اسٹاپ کے بعد چلنے لگی اور میں جلدی سے گاڑی سے جیسے ہی اترا ٹرین چل پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں پلیٹ فارم پر کھڑا تھا کیونکہ میرا بیگ تو گاڑی میں ہی چلا گیا تھا۔ میرے بیگ میں کپڑے، ضروری سامان میری تمام تعلیمی اسناد اور ٹیسٹ انٹرویو لیٹر اُسی میں تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا تو مجھے ایک بار پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ دیکھا تو سامنے بینچ پر وہی لڑکی بیٹھی تھی اور میرا بیگ اُس کے پاس تھا۔ وہ اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی جبکہ مجھ پر خوف کی ایک کیفیت طاری تھی اور میں یک ٹک حیرانگی سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ جب اُس نے مجھے دوبارہ اشارے کے ساتھ میرا نام لے کر پکارا تو میں مزید حیران رہ گیا اور پھر دل بڑا کر کے اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا جیسے ہی میں بینچ پر بیٹھا تو اس نے مجھے مخاطب کیا اور کہنے لگی۔

"ساجد صاحب! یہ رہا آپ کا بیگ! اچھی طرح چیک کرلیں۔ اس میں کوئی چیز کم تو نہیں......؟"

تو میں نے جواب دیا۔ چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر چیز پوری ہی ہوگی۔" پھر لڑکی نے کہا۔

"ساجد صاحب! میں آپ کو اپنے شہر میں خوش آمدید کہتی ہوں۔"

اب میرے حواس کچھ بحال ہو چکے تھے۔ جب میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو وہ ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اس کا حسن آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا۔

میں نے لڑکی سے سوال کیا کہ تم کون ہو اور میرا نام کیسے جانتی ہو......؟"

"وہ بولی۔ ساجد صاحب آپ گھبرائیں مت۔ آپ کو سب سوالوں کے جواب ملیں گے۔ اس کے لیے آپ کو میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔"

میں نے کہا کہ ایک اجنبی شہر میں ایک انجان لڑکی کے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں۔"

تو وہ کہنے لگی۔ "آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ دراصل مجھے آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے اور آپ ہی وہ واحد انسان ہیں جو میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"کیسی مدد؟ تم کھل کر بتاؤ کہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر کیوں لے جانا چاہتی ہو۔"

تو وہ مسکرا کر بولی۔ "کہا نہ آپ کو سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ بس آپ میرے ساتھ چلیں۔"

میں بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا۔ "چلو آؤ۔"

میں نے اپنا بیگ کاندھے پر لٹکایا اور اُس لڑکی کے پیچھے چل پڑا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر ہم ایک رکشے میں بیٹھ گئے۔ بیس منٹ کے بعد رکشہ ایک مکان کے آگے رُک گیا۔ لڑکی نے رکشہ ڈرائیور کو کرایہ دیا اور وہ چلا گیا پھر اُس نے ڈور بیل بجائی تو فوراً ہی دروازہ خود بخود کھل گیا اور ہم گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

ایک کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنا بیگ رکھا تو لڑکی کہنے لگی۔ ساجد صاحب آپ نہا دھو کر چینج کرلیں میں تب تک آپ کے کھانے کے لیے کچھ بناتی ہوں۔"

میں اس کی ان پراسرار سرگرمیوں سے کچھ کچھ پریشان سا ہوا تھا۔ پھر میں نے اپنے بیگ سے تولیہ اور شلوار اور قمیض سوٹ نکالا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ جب نہا کر فریش ہو کر کمرے میں آیا تو میز پر کھانا اور چائے پڑی تھی۔

میں نے کھانا کھایا اور چائے پی لی تو لڑکی نے مجھے میرے برانڈ کا سگریٹ پیکٹ دیا۔ اور میں حیرت و استعجاب میں ڈوب کر کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں سگریٹ پینے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد لڑکی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"ساجد صاحب اب آپ کو میں اپنا مکمل تعارف کرواتی ہوں۔ میرا نام کلثوم ہے اور میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔ میرے ابو بچپن میں ہی فوت ہوگئے تھے۔ میری امی نے بڑی مشکل سے مجھے پالا پوسا ہے۔ یہ مکان ہمارا اپنا ہے۔ جسے میرے ابو نے اپنی زندگی میں ہی تعمیر کروایا تھا۔ ہم دو بہنیں ہیں۔ میری دوسری بہن رابعہ میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے اور کراچی کے ایک میڈیکل کالج میں فائنل ایئر میں ہے۔ میں نے بی اے بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی اور پھر جاب کی تلاش میں روزانہ گھر سے نکل جاتی کیوں کہ ابو کی جو پنشن آتی ہے، وہ بہت قلیل ہے۔ گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی جاب کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا۔ تو وہاں انٹرویو کے لیے گئی۔

اس اسکول کی پرنسپل جو کہ اسکول کی مالک بھی تھی۔ بہت ہی خرانٹ قسم کی عورت تھی۔ اس نے مجھے جاب تو دے دی۔ مگر بغیر کسی اپائنٹمنٹ لیٹر کے زبانی کلامی۔ چنانچہ اگلے روز سے میں نے اسکول جوائن کرلیا۔ آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ پرنسپل کوئی اچھے کردار کی عورت نہیں ہے۔

اُس کا ایک بھائی تھا۔ جس کا نام شہروز تھا۔ وہ اکثر اسکول آتا جاتا رہتا تھا اور لیڈی ٹیچرز کو بھوکی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی بہت کوشش کی مگر میں اُسے ذرا بھی لفٹ نہ کراتی تھی۔ ایک دن پرنسپل کے آفس گئی تو پرنسپل واش روم میں تھی جبکہ شہروز وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے وہاں فری ہونے کی کوشش کی اور زبردستی میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑوا کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گھر چلی آئی۔ کچھ دن گزرے تو پرنسپل اسکول نہ آئی۔ پتا چلا ان کی طبیعت خراب ہے اور وہ گھر پر ہے۔ جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو جاتیں پرنسپل کی سیٹ پر شہروز بیٹھے گا۔

اگلے دن شہروز نے مجھے اپنے آفس میں بلایا اور کہا کہ پرنسپل صاحبہ نے مجھے گھر بلایا ہے۔ وہ میرے ذمے کوئی اہم ڈیوٹی لگانا چاہتی ہیں۔ شہروز نے فون ملا کر میری بات پرنسپل صاحبہ سے کروائی۔ وہ مجھے گھر بلا رہی تھیں۔ مجھے ابھی تک دو مہینے کی تنخواہ بھی نہیں ملی تھی۔ پرنسپل نے کہا آ کر تنخواہ بھی لے لو میں چاروناچار شہروز کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑی ایک بنگلے میں داخل ہوئی۔ شہروز نے مین گیٹ بند کر دیا اور مجھے ایک کمرے میں لے گیا لیکن وہاں پرنسپل کے بجائے اس کے دو دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ جو شکل سے ہی چھٹے ہوئے غنڈے اور بدمعاش اور بگڑے ہوئے رئیس زادے لگ رہے تھے۔ ان تینوں نے مجھے دبوچ لیا اور سارا دن میری آبروریزی کرتے رہے۔ اور شام کو میں لٹی پٹی گھر آ گئی۔ دو دن کے بعد اسکول جا کر پرنسپل کو ساری بات بتائی اور تنخواہ مانگی تو اس نے مجھے اپنے اسکول کی ٹیچر

ماننے سے انکار کر دیا۔ اور بے عزت کر کے اپنے آفس سے نکال دیا۔ میں بہت روئی۔

یہاں تک بتا کر کلثوم خاموش ہوگئی اور کہا باقی کل بتاؤں گی۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا کھا کر میں سو گیا اور خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ کلثوم کو ان تینوں بدمعاشوں نے جکڑ رکھا ہے اور آبرو ریزی کرنے کے بعد قہقہے لگا رہے ہیں اور شہروز کہہ رہا تھا۔

''میڈم کلثوم یہ تمہارے اُس تھپڑ کی سزا ہے۔ جو تم نے مجھے مارا ہے۔ تو اس پر کلثوم بولی۔ میں تمہارے خلاف پولیس میں پرچہ درج کرواؤں گی۔ میڈیا میں جا کر تمہارا پول کھولوں گی۔ تو شہروز بولا۔ زندہ رہو گی تو کچھ کرو گی نا...... پھر وہ تینوں مل کر کلثوم کو کلوروفام سنگھا کر بے ہوش کر دیتے ہیں اور اُس کو گاڑی میں ڈال کر ریلوے لائن پر پھینک دیتے ہیں۔''

ساری رات یہ خواب میں بار بار دیکھتا رہا۔ صبح جب بیدار ہوا تو گھر میں صرف کلثوم کی امی تھیں۔ جب میں نے کلثوم کا پوچھا۔ تو وہ کہنے لگیں بیٹا کلثوم کو مرے ہوئے چھ ماہ ہوگئے ہیں۔''

میں حیران و پریشان رہ گیا اور کہا آنٹی میں کل کلثوم کے ساتھ ہی تو آیا تھا۔'' مگر وہ کہنے لگیں۔

''نہیں بیٹا! تم اکیلے آئے تھے۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔'' کلثوم کی امی کا نام شمشاد بیگم تھا۔

میں نے آنٹی شمشاد سے کلثوم کی موت کا پوچھا تو انہوں نے مجھے سب کچھ وہی بتایا جو کلثوم مجھے بتا چکی تھی اور خواب میں جو کچھ میں دیکھ چکا تھا۔

شمشاد آنٹی نے بتایا کہ کلثوم کی لاش دو ٹکڑوں میں گھر لائی گئی۔ پولیس نے پوسٹ مارٹم کروایا۔ رپورٹ درج کروائی گئی۔ تو کلثوم کی موت کو خودکشی کا کیس قرار دے کر کیس ختم کر دیا گیا۔ اگلی رات کلثوم میرے خواب میں آئی اور مجھ سے کہنے لگی۔

''ساجد صاحب میں نے خودکشی نہیں کی تھی۔ مجھے ان تینوں درندوں نے مل کر قتل کیا ہے۔ تو پلیز آپ میرے قاتلوں کو سزا دلوائیں۔ وہ تینوں درندے دندناتے پھر رہے ہیں اور اور کئی اور لڑکیوں کی عزتوں کو بھی داغدار کر چکے ہیں۔''

☆......☆......☆

اگلے روز میں کلثوم کے کیس کی جانکاری کے لیے متعلقہ تھانے گیا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرا ایک کالج فیلو دانش ارباب ASP کے یونیفارم میں تھانے کے ریکارڈ وغیرہ چیک کر رہا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ساجد تم......؟ خیریت تو ہے نا؟''

میں نے اُسے اپنے ٹیسٹ انٹرویو کا بتایا تو اس پر وہ بولا ٹھیک ہے مگر تم پولیس اسٹیشن کس سلسلے میں آئے ہو۔'' تو میں نے کہا علیحدگی میں بتاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد دانش مجھے اکیلے کمرے میں لے گیا۔ پھر میں نے اُسے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات بتائی۔ وہ میری بات سن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے CSS کا امتحان پاس کر کے بطور ASP پولیس کا محکمہ جوائن کیا ہے اور ٹریننگ کے بعد ایک ماہ پہلے اس کی شہر میں ڈیوٹی جوائن کی ہے۔

دانش ارباب کے ساتھ کالج میں میری اچھی دوستی تھی۔ میری درخواست پر دانش نے کلثوم کیس کی فائل نکلوائی۔ جس میں روٹین کی کارروائی کر کے کلثوم کی موت کو خودکشی قرار دے کر فائل بند کر دی گئی تھی۔

دانش میرے ہمراہ آنٹی شمشاد سے ملا۔ ان کی زبانی پوری تفصیل سننے کے بعد ان کی طرف سے ایک درخواست لکھوا کر کیس کی دوبارہ تفتیش شروع کر دی۔

جس ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھی تھی اُسے ملا تو ڈاکٹر نے بتایا کہ کلثوم کو کلوروفامس نگھایا گیا تھا۔ تو کوئی بھی انسان بے ہوش ہو کر خودکشی نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر کی اصل پوسٹ مارٹم رپوٹ کو غائب کر کے دوسری جعلی رپورٹ لگا دی گئی تھی اور یہ سب کچھ پیسے اور اثر و رسوخ کے بل پر کیا گیا تھا۔''

دانش ارباب نے بڑی جانفشانی اور محنت سے اس کیس کی ازسرِ نو تفتیش کی۔ تمام شواہد اور ثبوت اکٹھے کیے اور شہروز اور اس کے دونوں دوستوں اور پرنسپل کو گرفتار کر لیا۔

ایک اہم انکشاف یہ بھی ہوا کہ شہروز اسکول کی پرنسپل کا بھائی نہیں تھا بلکہ ایک دوست تھا۔ پرنسپل ایک طلاق یافتہ عورت تھی اور شہروز بھائی کے روپ میں اس کو جنسی تسکین پہنچاتا تھا۔ کلثوم کے قتل کیس اور آبرو ریزی میں پرنسپل برابر کی شریک تھی۔ اسکول کے دیگر عملے کے بیانات لیے گئے اور پولیس کے روایتی حربے کے نتیجے میں چاروں مجرموں نے اپنے اپنے جرم کا اعتراف کیا اور پھر یہ کیس عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ ڈاکٹر جس نے پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اس کے بیان، دیگر گواہوں کے بیانات اور مجرموں کے اقرارِ جرم کے بعد ان چاروں کو 25،25 سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

دانش ارباب کی پہلی کامیابی صاف اور شفاف تفتیش کو پولیس کے اعلیٰ حکام نے خوب سراہا اور اُسے انعام اور تعریفی اسناد دی گئیں۔ تو اس طرح سفاک مجرمان اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے۔

اس کارروائی کے دوران میں اُسی شہر میں دانش ارباب کا مہمان رہا۔ جاب کے لیے ٹیسٹ انٹرویو میں کامیاب رہا اور مجھے ایک بہترین جاب اسی شہر میں مل گئی۔ قارئین کرام آپ کو بتا تا چلوں کہ دنیا میں میرا ابھی کوئی نہیں ہے۔ والدین کا انتقال زمانہ طالب علمی میں ہی ہو گیا تھا۔ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔

جب کلثوم کے قاتلوں کو سزا ہوئی تو آنٹی شمشاد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور وہ میرا بار بار شکریہ ادا کرتی تھیں کہ میری وجہ سے کلثوم کے قاتل اپنے انجام کو پہنچے۔

اُسی رات کلثوم میرے خواب میں آئی اور میرا شکریہ ادا کیا کہ اُس کے قاتلوں کو سزا دلوائی۔ اب اُس کی روح کو سکون مل گیا ہے اور وہ بہت خوش ہے۔

اسی اثناء میں کلثوم کی چھوٹی بہن رابعہ کا ایم. بی. بی. ایس مکمل ہو گیا اور وہ کراچی اپنے شہر لوٹ آئی رابعہ ہو بہو کلثوم کی ہم شکل تھی۔ وہی بولنے کا، ہنسنے کا انداز کلثوم والا۔ آنٹی شمشاد نے جب رابعہ کو تفصیل سے بتایا کہ میری وجہ سے ہی کلثوم کے قاتل پکڑے گئے ہیں، تو وہ بہت ممنون ہوئی۔

میرے والد صاحب کی کچھ زمینیں تھیں۔ جو کہ ٹھیکے پر دی ہوئی تھیں۔ اب چونکہ مجھے ایک بہت اچھی سرکاری نوکری مل گئی تھی، تو میں نے اپنے شہر واپس آ کر وہ زمینیں اور آبائی گھر کو فروخت کر دیا۔ جس سے مجھے اچھی خاصی رقم ملی جو کہ کروڑوں میں تھی۔

میری سرکاری ڈیوٹی جاری تھی۔ میں اکثر آنٹی شمشاد کے گھر چکر لگاتا رہتا تھا۔

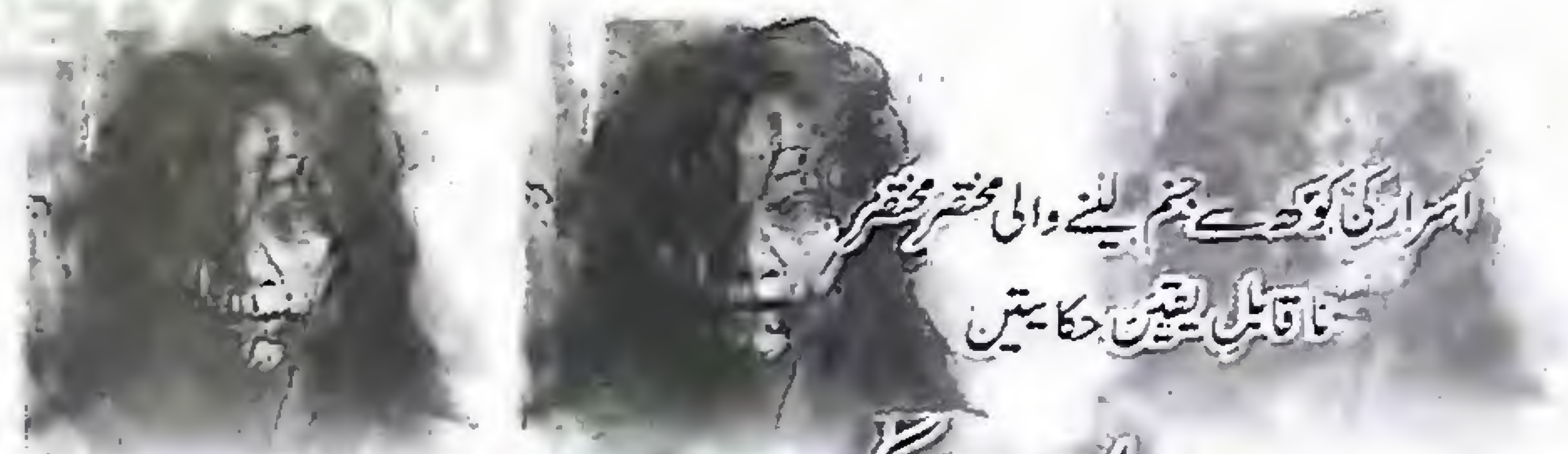
ایک دن میرے خواب میں کلثوم آئی اور کہنے لگی۔ ساجد تم رابعہ کو اپنی شریکِ حیات بنا لو اور پلیز میری یہ خواہش پوری کر دو۔ رابعہ مجھے بھی اچھی لگتی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں آنٹی شمشاد نے مجھے اپنا بیٹا بنانے کی بات کر دی، تو اس طرح کچھ عرصے بعد میرا نکاح رابعہ سے ہو گیا۔ جس اسکول میں دو ماہ کلثوم نے ٹیچر کی جاب کی تھی، پرنسپل کی گرفتاری کے بعد وہ اسکول بند ہو گیا تھا۔ وہ کرائے کی ایک بلڈنگ تھی۔ جس میں اسکول بنایا گیا تھا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے وہ عمارت خرید لی۔ اور اُسے گرا کر ایک ماہر آرکیٹیکٹ سے نقشہ بنوا کر وہاں ایک ہسپتال کی تعمیر شروع کروا دی۔ دو سال کے عرصے کے اندر ایک بہترین اور شاندار ہسپتال تعمیر ہو گیا۔ اس ہسپتال کا نام ''کلثوم میموریل ہسپتال'' رکھا ہے۔ جس کی انچارج میری بیوی لیڈی ڈاکٹر رابعہ ہے۔ جہاں کلثوم، اس کے ابو اور میرے والدین کے ایصالِ ثواب کے لیے غریبوں اور مستحق مریضوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔

دانش ارباب سے دوستی اور گہری ہو گئی۔ وہ اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کے بل پر اعلیٰ عہدے پر پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے تمام معاملات بہ حسن و خوبی چل رہے ہیں۔ کئی سال بیت گئے مگر آج تک اس گتھی کو سلجھا نہیں سکا۔ اور نہ ہی اُن پراسرار حالات و واقعات کو سمجھ سکا ہوں کہ کلثوم کی لاش کو دو ٹکڑوں میں دیکھنا، پھر اس کا زندہ حالت میں میرے بیگ سمیت مجھے اپنے گھر لے جانا، اور اپنی زبانی اپنے ساتھ ہونے والے واقعات سنانا اور خواب میں سب کچھ دیکھنا اور اس کے قاتلوں کا سزا پانا۔ یہ سب کیا ماجرا تھا؟

قدرت کا کیسا بھید تھا جسے میں آج تک سمجھ نہیں سکا۔

☆☆......☆☆



لندن کی وہ رات

رضوانہ پرنس

لندن کے اُس فلیٹ کی رات اور وہ پُراسرار ہاتھ، یقیناً مسز رابرٹ بھی......



یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور میرا بڑا بھائی شاہین اسٹڈیز کے لیے نئے نئے لندن پہنچے تھے۔ ظاہر سی بات ہے اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے ہم لوگ رہائش کے لیے کوئی مناسب کرائے کا گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ کسی نے ہمیں ایک فلیٹ کے بارے میں بتایا جس کا کرایہ بہت کم تھا۔ اتفاق سے وہ فلیٹ میرے کالج سے بہت ہی نزدیک تھا، جب کہ شاہین کو وہ فلیٹ اپنے کالج سے بہت دور پڑ رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے اس میں اکیلے ہی شفٹ ہونا پڑا کیوں کہ اس سے زیادہ سستا فلیٹ نہیں مل سکتا تھا۔

اس فلیٹ کی مالکہ ایک اسی سالہ انگریز بوڑھی عورت تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت سے ملی، ایڈوانس وغیرہ بھی نہیں مانگا۔ ہاں البتہ یہ وعدہ ضرور کیا کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پابندی سے کرایہ مجھے ضرور پہنچانا ہوگا۔

فلیٹ فرنشڈ تھا۔ کراکری سے لے کر فرنیچر تک ہر چیز موجود تھی۔ بس مجھے اپنا سوٹ کیس لے کر وہاں شفٹ ہونا تھا۔ شروع کے کچھ دن تو بہت اچھے گزرے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ بوڑھی لینڈ لیڈی بھی اکثر آتے جاتے نظر آ جاتی تو اس سے ہیلو ہائے ہو جاتی کیوں کہ وہ بالکل میرے سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔

☆......☆......☆

ایک رات میں جو غافل سو رہا تھا تو اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی کھڑکی کھٹکھٹا رہا ہے۔ میری آنکھ بے اختیار کھل گئی۔ میں نے کھڑکی کی جانب دیکھا تو دو ہاتھ کھڑکی کے شیشے پر نظر آئے۔ میں اچھل کر اپنے بستر سے باہر نکلا اور بہت تیزی سے کھڑکی کے نزدیک آیا تو ہاتھ غائب ہو چکے تھے۔ میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ تب ہی اچانک ایک خیال میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑا گیا۔ میرا فلیٹ تو تیسری منزل پر تھا اور کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ کھڑکی تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ کوئی ہوا میں معلق ہو کر کیسے کھڑکی کھٹکھٹا سکتا تھا۔ پسینے سے میرا پورا جسم بھیگ گیا۔ ابھی کل رات ہی کو اتفاق سے چچا ذاکر کے گھر کھانے پر یہ ٹاپک نکل آیا تھا کہ لندن میں زیادہ تر گھر آسیب زدہ ہوتے ہیں۔ پھر بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی، لیکن اس وقت وہی بات اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ میرے سامنے تھی۔

میں نے کمرے کی لائٹ جلا دی، لیکن ڈر کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔ تب ہی ایک بار پھر کھڑکی پر زوردار دستک ہوئی۔ خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سامنے کھڑکی پر پھر وہی دو ہاتھ دستک دیتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہاتھ پیروں میں جیسے جان ہی نہیں

رہی تھی۔ اچانک ہی کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ لندن میں لائٹ جانے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ ایک لمحے کو تو میں خوف کی شدت سے بالکل ہی بے جان ہو گیا۔ تب ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کھڑکی کھل رہی ہے۔ میرے جسم میں جیسے بجلی سی بھر گئی۔ میں اٹھا اور پوری قوت سے باہر کی طرف بھاگا۔ اندھیرے میں مجھے دروازہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں دیوانہ وار دروازہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لائٹ جھم سے جل اٹھی۔ میں نے پیچھے دیکھے بغیر دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ اندر کمرے سے لگاتار مجھے دستک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ باہر نکل کر کچھ دیر تو اپنی سانس قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اس وقت موبائل فون کا دور شروع نہیں ہوا تھا کہ شاہین کو فون ہی کر لیتا۔ ٹیلی فون اندر تھا۔ آدھی رات کو سلیپنگ سوٹ میں فلیٹ کے باہر کھڑے سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ ایک بڑا عجیب سا سناٹا چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اچانک ہی اس سناٹے کو کسی کے قدموں کی چاپ نے توڑ دیا۔ شاید کوئی سیڑھیوں پر تھا۔ اور اوپر کی طرف آ رہا تھا۔ دل کو تھوڑی تسلی ہوئی۔ جو کوئی بھی ہوگا کم از کم اس کو ساری سچویشن بتا تو سکوں گا۔ ایک سے دو ہونے کے خیال نے خوف میں بھی کچھ کمی سی کر دی۔ ایک لمحے میں یہ بھی سوچ لیا کہ آنے والے شخص کے فلیٹ سے شاہین کو بھی فون کر لوں گا۔

☆......☆......☆

قدموں کی چاپ نزدیک آتی چلی گئی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ سامنے سیڑھیوں سے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی، لیکن کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”اوہ خدایا“ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ کچھ کچھ



میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں تب ہی میں نے کچھ بنا سوچے سمجھے سامنے والے فلیٹ کا دروازہ جس میں میری لینڈ لیڈی رہتی تھی۔ بہت زور زور سے دھڑ دھڑایا لیکن یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ میرا ہاتھ پڑتے ہی دروازہ کھل گیا ہے، گویا وہ ٹھیک سے بند نہ تھا۔ شاید وہ خاتون دروازہ بند کرنا بھول گئی تھیں۔ میں بنا کچھ سوچے سمجھے اندر گھس گیا۔ اندر سارے گھر کی لائٹیں بند تھیں۔ بس سامنے والے کمرے میں ایک مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''مسز رابرٹ۔'' میں نے ان کے کمرے کے نزدیک جا کر پکارا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید وہ کوئی میڈیسن لے کر سوئی ہوں۔ تب ہی ان کی آنکھ نہیں کھلی۔ میں نے سوچا اور ایک بار پھر زور سے پکارا لیکن جواب نہ آیا۔ تب میں جھجکتا ہوا ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ سامنے ہی ریوالونگ چیئر پر بیٹھی ہوئی نظر آ گئیں۔

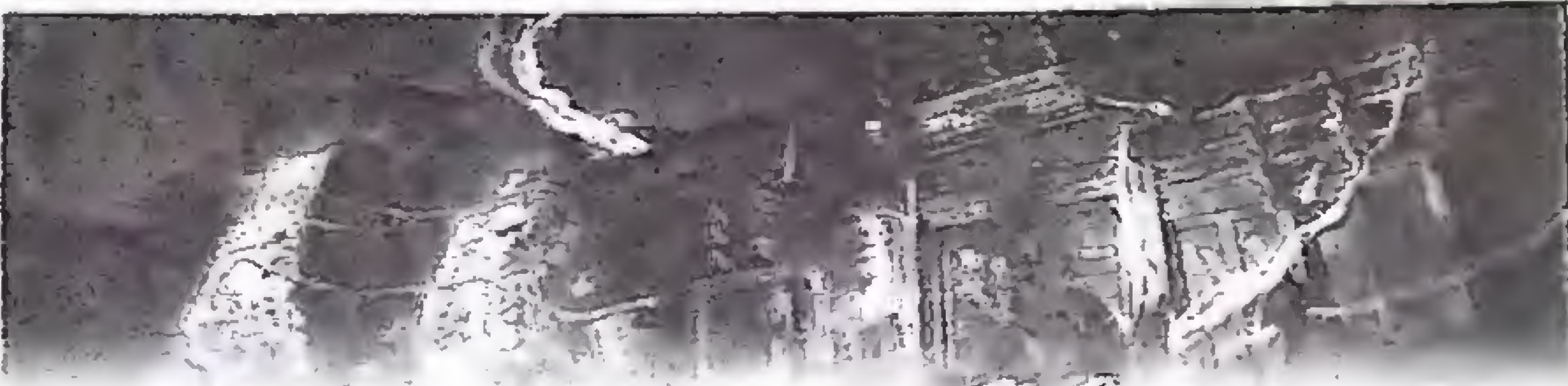
ارے یہ تو جاگ رہی ہیں۔ پھر جواب کیوں نہیں دے رہیں۔ میں جو پہلے ہی شدید خوف کے زیر اثر تھا اس نئی افتاد پر مزید خوف زدہ ہو گیا۔ اس نیم اندھیرے کمرے کا ماحول بے حد پراسرار لگ رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے نزدیک آ گیا۔ ''مسز رابرٹ۔'' میں نے جھک کر ایک بار پھر انہیں پکارا لیکن پھر ایک لمحے کو تو میں جیسے شاکڈ ہی رہ گیا۔ ان کی کھلی ہوئی بے جان ساکت آنکھیں جیسے مجھے ہی گھور رہی تھیں۔ میں لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''اوہ خدایا یہ تو مر چکی ہیں۔''

☆......☆......☆

تب ہی ان کے کمرے کی کھڑکی پر دستک ہوئی۔ میں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا تو کھڑکی پر وہی دو ہاتھ چپکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ تب ہی اچانک میرا ہاتھ اپنے گلے میں جھولتے ہوئے تعویذ پر پڑا جس میں آیت الکرسی رقم تھی۔ میں نے مضبوطی سے وہ تعویذ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے فون کی طرف بڑھا۔ پولیس کو فون کر کے بس اتنا ہی بتا سکا کہ یہاں ایک خاتون کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ پھر اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو شاہین میرے پاس تھا اور صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ مسز رابرٹ کی لاش پولیس اٹھوا کر لے جا چکی تھی۔ ان کی موت طبعی ہوئی تھی، لیکن میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے پورا یقین تھا ان کا مرنا بھی اس دہشت ناک واقعے کی ایک کڑی ہے۔

آج اس واقعے کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ میں نے وہ فلیٹ اسی روز چھوڑ دیا تھا، لیکن آج جب بھی وہ خوفناک رات یاد آتی ہے تو ایک خوف چار سو پھیل جاتا ہے۔

☆☆......☆☆



وہ گھونگھٹ والیاں...

نیر شفقت

آج بھی یہ بات میرے رونگٹے کھڑے کر

دیتی ہے کہ آخر گھونگھٹ میں وہ کون سی مخلوق تھی جو......

یہ واقعہ میرے رشتے دار نے کئی سال پہلے سنایا تھا۔ جسے میں نے تجسس بھرے انداز سے سن کر لاپرواہی سے لاشعور میں دھکیل دیا تھا۔ پراسرار کہانی نمبر کا اعلان ہوا تو لاشعور کی پٹاری کو کھول کر اسے جھاڑ پونچھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ دادی جان کی زبانی یہ کہانی ملاحظہ فرمائیں۔

میرے شوہر فلموں کے کام سے وابستہ تھے اور فلموں کی کمائی تو آپ سب کو پتا ہی ہے۔ فلم ہٹ ہو جائے تو ہر



طرف لہراں لہراں ہو جاتی ہے اور ہٹ جائے جائے تو بس بندہ ہر طرف لہراتا ہی رہ جاتا ہے۔

ان دنوں فلم پائے خان سو پر ڈوپر ہٹ جا رہی تھی۔ فلم بنانے والوں میں ایک نام میرے شوہر کا بھی تھا۔ چونکہ فلم ہٹ تھی اس لیے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ پیسہ آ جائے تو رہن سہن کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔ سو ہمارا معیار زندگی بھی قلعہ گجر سنگھ سے بلند ہو کر گلبرگ پہنچ گیا۔ اس زمانے میں گلبرگ ابھی زیادہ آباد نہیں ہوا تھا۔ مگر کئی کوٹھیاں ہنوز خالی تھیں۔

گلبرگ میں آ کر میری مصروفیات مزید بڑھ گئیں۔ آنا جانا تو پہلے بھی بہت کم تھا کہ اس زمانے میں رشتہ داروں کی اہمیت بھی بہت تھی اور احترام بھی۔ ساہیوال اور پنڈی سے جو بھی مہمان آتا ان کا قیام زیادہ تر ہمارے ہاں [illegible]

[illegible]

یہ گلبرگ میں شفٹ ہونے کے کوئی دو تین ماہ بعد کی بات ہے۔ اس دن میرے چھوٹے بیٹے منور کو بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔ وہ شام سے ہی بخار کی شدت سے بے چین تھا۔ میں اس کے ننھے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی۔ ڈاکٹر کے کلینک کا مجھے پتا نہیں تھا ورنہ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی اور میرے شوہر ابھی اسٹوڈیو سے واپس نہیں آئے تھے۔ میرے پاس یہی راستہ تھا۔ جس سے بخار کی شدت کم ہو سکتی تھی۔ بالآخر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جا کر اس کا بخار کم ہوا تو اُسے کچھ سکون ہوا اور وہ سو گیا۔

اسی اثناء میں میرے شوہر بھی آ گئے۔ اب رات بھی زیادہ ہو چکی تھی اور منور بھی سکون میں تھا۔ اس لیے یہی ارادہ کیا کہ اسے صبح ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔ میرے شوہر تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ بھی جلد ہی سو گئے۔ منور کی وجہ سے میں بھی تھک گئی تھی۔ اس لیے مجھے بھی جلدی نیند آ گئی۔

قریباً ڈیڑھ دو بجے کے قریب کا وقت ہوگا۔ جب منور کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس کا ماتھا چھو کر دیکھا تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔ پھر شاید اُسے بھوک لگی تھی۔ شوہر کی آنکھ نہ کھل جائے اس ڈر سے میں نے منور کو سینے سے لگایا اور صحن میں آ گئی۔ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر میں نے اُسے دودھ پلایا تو وہ جلد ہی سو گیا۔

میں اٹھ کر اندر جانے لگی تو اچانک چھن چھن کی آواز نے میرے قدم پکڑ لیے۔ میں تجسس سے اندر جاتے جاتے رُک گئی۔ ہمارے صحن کی دیوار کے ساتھ ہی دوسرے گھر کا صحن لگتا تھا اور صحن میں دائیں بائیں دونوں طرف سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جا رہی ہیں۔ چھن چھن کی آواز کے ساتھ کوٹھے پر سے ہلکی ہلکی روشنی بھی نظر آ رہی تھی۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں طرف سے آتی سیڑھیوں پر گھونگھٹ میں منہ چھپائے لڑکیاں اترنے لگیں انہوں نے ہاتھوں میں تھالیاں پکڑ رکھی تھیں اور ہر تھالی میں تین دیے جل رہے تھے۔ یہ روشنی ان ہی دیوں سے آ رہی تھی۔ میں ان لڑکیوں کی شکلیں دیکھنا چاہتی تھی مگر گھونگھٹ میں ہونے کی وجہ سے میں ان کی خوبصورتی جانچنے سے محروم رہی۔ منور کو سینے سے لگائے میں انہیں پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی شاید ساتھ والے گھر میں کوئی شادی ہوگی۔ اور ویسے بھی شادی بیاہ کے ماحول میں تو راہ چلتی عورتیں اور لڑکیاں بھی بہت دلچسپی لیتی ہیں اور یہ تو میرے پڑوس میں شادی ہو رہی ہے۔ پندرہ بیس کی تعداد میں وہ لڑکیاں نیچے اتر گئی تھیں۔

پھر ان کے صحن سے گانے بجانے کی آوازیں آنے لگیں مگر میرے لیے دیکھنے کو اب کچھ نہ بچا تھا۔ سو منور کو سینے سے لگائے لگائے میں کمرے میں آ کر پھر سو گئی۔

صبح تک منور کا بخار بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

ناشتا کرتے ہوئے میں نے اپنے شوہر کو رات منور کے رونے اور اپنے صحن میں آنے کے بارے میں بتایا پڑوس کے گھر شادی کا ذکر بھی بڑے اشتیاق بھرے انداز سے کیا۔ تو وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔

''کیا ہوا مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''تم کون سے گھر کی بات کر رہی ہو؟'' انہوں نے تصدیق کرنے والے انداز سے پوچھا۔

''وہ جو ہمارے صحن کے ساتھ لگتا ہے۔'' میں نے کچھ حیرانی اور کچھ پریشانی سے بتایا

''وہ گھر...... وہ گھر تو خالی ہے بلکہ......'' انہوں نے کچھ ناسمجھی کے عالم میں کہا۔ ''بلکہ وہ تو شاید کئی سالوں سے غیر آباد ہے۔''

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''آپ کا مطلب ہے کہ......'' میں اپنے بدترین خدشات کو زبان دینے سے گھبرا رہی تھی۔

''ہاں شاید...... اور میں نے سنا بھی تھا کہ وہ مکان آسیب زدہ ہے مگر میں ان چیزوں کو نہیں مانتا۔ اس لیے اس گھر میں آنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی تھی۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''اور میرا خیال ہے ہمیں یہ جگہ جلد از جلد چھوڑ دینی چاہیے۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں کہیں نقصان نہ ہو جائے۔''

پھر کچھ عرصے بعد ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا مگر مجھے آج تک سمجھ میں نہ آ سکی کہ گھونگھٹ میں کون سی مخلوق تھی۔ جنات میں سے تھی یا پھر وہ چڑیلیں تھیں۔

☆☆......☆☆

تسبیح کی کرامت

ثناء کنول اللہ دتا

اگر اُس کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی تو......

یہ آج سے کوئی چھ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ بھی عام سے دنوں میں سے ایک عام سا ہی دن تھا۔ جب امی نے مجھ سے کہا۔

''فاریحہ بیٹا! تیاری کر لو۔ آج شام کو ہم سب تمہاری نانی امی کے گھر گاؤں ان کی حویلی میں جا رہے ہیں۔''

مجھے بچپن ہی سے گاؤں بے حد اچھا لگتا ہے۔ وہاں کے سادہ سے لوگ، سادہ سا ماحول مجھے بے حد و حساب پسند رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امی کی بات سن کر میں نے خوشی خوشی اپنی تیاری شروع کر دی۔ اور شام کو ہم گاؤں کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

سکھر کے چھوٹے سے گاؤں میں میری نانی امی اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتی تھیں۔ میرا خوشی سے برا حال تھا اور اپنی اس خوشی میں ہر گزرتا لمحہ بڑا ہوتا جا رہا تھا اور پھر بالآخر تین گھنٹے کے طویل سفر کے بعد ہم سب نانی امی کی حویلی میں داخل ہوئے۔ حویلی کی نوکرانیاں تجسس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں نانی امی کے گلے میں بازو ڈالے جھول رہی تھی۔

دوسرے دن میں حویلی کی ایک ملازمہ خدیجہ کو ساتھ لے کر پرانی حویلی کی طرف چلی گئی۔ جہاں آ کر خدیجہ نے خوف سے کہا۔

''بی بی جی...... کہتے ہیں جو یہاں پر آتا ہے وہ کبھی واپس نہیں جا پاتا، جی۔ آپ واپس چلو جی۔''

''ارے کچھ نہیں ہوتا نا۔'' یہ دیکھو میرے پاس تسبیح ہے کچھ نہیں ہوگا۔''

''نہیں جی میں تو جا رہی ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ واپس مڑی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے مسکرا کر اُسے جاتے دیکھا اور پھر ایک





ڈر لگتا ہے



مور شاہد حسین

اُس رات گھر میں کوئی نا تھا کہ اچانک عفریت نے اُسے جکڑ لیا اور......

ابو کو سرکاری ملازمت ملتے ہی ہم گاؤں سے شہر میں آ بسے تھے۔ جس علاقے میں ہم نے اپنا گھر بنوایا تھا۔ وہ کالونی ابھی نئی نئی آباد ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی ہمارے اردگرد چند گھر آباد تھے۔ ان دنوں گاؤں میں میرے ماموں زاد کی شادی تھی۔ امی ابو میری بہن اور نادیہ گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اور اس رات میں گھر میں اکیلا تھا۔

:: دسمبر کی ایک سرد



نظر حویلی پر ڈالی۔ نجانے کتنے سال پہلے یہ حویلی واقعی خوبصورت ہوگی، مگر اس وقت بنجر سی لگ رہی تھی۔ میں سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ تب ہی مجھے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی، شاید نہیں یقیناً وہ آواز حویلی میں سے آ رہی تھی۔ مجھے لگا شاید گاؤں کی کوئی لڑکی بھول کر حویلی میں چلی گئی ہو۔ تو میں نے قدم بڑھا دیے۔

آواز تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی میں نے حویلی کا گیٹ پار کیا مجھے لگا جیسے میرے پیچھے کوئی چل رہا ہو۔ میں آہستہ آہستہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ سامنے پرانے زمانے کا ایک بڑا سا لاؤنج تھا۔ گھور اندھیرے میں بھی مجھے اس کا فرش چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی روزانہ اس جگہ کی صفائی کرتا ہو۔ میں چلتی ہوئی لاؤنج کے درمیان میں کھڑی ہوگئی اور اگلے ہی پل زمین کھلی اور میں نیچے لڑھکتی چلی گئی۔

لاؤنج کے نیچے کوئی تہہ خانہ تھا۔ جس میں، میں جا گری تھی۔ ایک پل کے لیے مجھے لگا جیسے میرے جسم کی ساری ہڈیوں کا کچومر نکل گیا ہو۔ میں تکلیف سے کراہ کر رہ گئی۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

نجانے کتنی دیر بعد میری آنکھ کھلی۔ چکراتے سر کو تھام کر میں نے اردگرد دیکھا تو مارے خوف کے میرے منہ سے نجانے کتنی چیخیں نکلتی چلی گئیں۔ اس تہہ خانے میں چاروں طرف خون بکھرا پڑا تھا اور خون میں لت پت نجانے کتنے ڈھیر ڈھانچے پڑے تھے۔

''تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے لڑکی۔'' مجھے اچانک ایک بھاری آواز سنائی دی۔ اس سے بھیانک آواز میں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ اور اس آواز کا چہرہ، لمبے زمین کو چھوتے بال، لمبے ناخنوں سے ٹپکتا خون، اور لمبی خون اگلتی آنکھیں چہرہ ایک طرف سے جلا ہوا تھا۔ وہ کوئی چڑیل تھی۔

''میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ بس تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ پہلے میں اپنے بارے میں بتاتی ہوں۔ میرا نام نیل چڑیل ہے۔ میں اپنے کزن دیو جن سے محبت کرتی تھی۔ جب کہ ہندو جن مجھ پر عاشق تھا۔ میں نے دیو سے شادی کر لی اور شادی کی رات اُس ہندو جن نے میرے پتی کا قتل کر دیا اور مجھے یہاں پر لا کر قید کر دیا ہے۔ بس تمہیں اتنا کرنا ہے کہ تمہیں اپنی اس تسبیح کو اس پر پھینک دینا ہے وہ مر جائے گا اور میں آزاد ہو جاؤں گی۔ اور ہاں اگر میں آزاد ہوگئی تو تمہیں زندہ صحیح سلامت تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔ منظور ہے۔''

''ہاں......''

ہندو جن ساتویں پہاڑی پر بیٹھا کوئی چلہ کر رہا ہے۔ میرے غلام تمہیں پہاڑی پر پہنچا دیں گے مگر تم اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ہاتھ سے تسبیح نہ چھوٹنے پائے۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔

میں دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگی۔ نیل چڑیل کے کہنے پر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی سی دیر کے بعد جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک بہت بڑی سی پہاڑی پر پایا۔

میں نے جیسے ہی قدم اٹھایا نجانے کہاں سے دو منہ والا سانپ نکل کر میرے پاؤں پر چپک گیا۔ مجھے نیل چڑیل نے بتا دیا تھا کہ سامنے والے سانپ مجھے کاٹیں گے نہیں، صرف ڈرائیں گے۔ اسی لیے میں نے کلمہ پڑھ کر جیسے ہی اس پر پھونکا وہ پل بھر میں غائب ہوگیا۔ نجانے میرے سامنے کتنی چیزیں آتی گئیں اور میں چلتی چلی گئی۔ آخر مجھے نیل چڑیل کو آزاد کروانا تھا۔ یعنی خود بھی آزاد ہونا تھا۔

پھر بالآخر میں ساتویں پہاڑی پر پہنچ گئی۔ سامنے بہت ہی بری شکل والا ہندو جن بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ میں پکڑی تسبیح اس پر پھینک دی اور اگلے ہی پل ہندو جن کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں وہیں پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔

جب میری آنکھ کھلی میں نانی کے گھر پر تھی۔ امی ابو مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ امی بتاتی ہیں کہ میں انہیں پرانی حویلی میں بے ہوش پڑی ملی تھی۔

میں نے عقیدت سے اس تسبیح کو پڑھتی ہوں، جس نے میری جان بچائی تھی۔

واقعی کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں، جو آپ کو اندر تک لرزا کر رکھ دیتے ہیں۔ ہماری زندگیوں سے جڑے یہ واقعات ہی ہماری زندگی کی یادیں ہوتے ہیں۔

☆☆......☆☆

رات تھی۔ بجلی نہ ہونے کے باعث پورے ماحول پر اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ اندھیرے اور سناٹے کی وجہ سے ماحول عجیب پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ ماحول پر چھائی خاموشی مجھے کھانے کو آ رہی تھی۔ یکدم ہی مجھے وحشت نے آ گھیرا اور میں گھبرا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ واش روم سے مجھے پانی گرنے کی آواز نے بری طرح چونکا دیا۔

میں نے واش روم کے نزدیک کان لگا کر سن گن لی۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ اندر کسی ذی روح کی آہٹ نہیں ہے تو میں نے یکدم دروازہ دھیرے سے کھولا۔ دروازہ کھلا۔ میں نے اندر جھانکا واش روم بالکل خالی تھا۔ مگر نل سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے نل کو اچھی طرح بند کیا اور کمرے میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ اگلا منظر میری جان لینے کے لیے کافی تھا۔ یکا یک سناٹے میں قدموں کی آہٹ سی ابھری میں انجانے خوف سے ساکت ہو کر رہ گیا۔ قدموں کی آہٹ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے باہر کی طرف جھانکا۔ تو قدموں کی آہٹ سناٹے میں ڈوب کر معدوم ہو گئی۔ مگر مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں فوراً مڑا لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد ایک سایا میرے سامنے سے آ کر گزرا۔ اب میں بدحواس ہو کر کمرے کی جانب بھاگا اور کمرہ اندر سے لاک کر دیا۔ میں بدحواسی میں کانپنے لگا تھا۔ اس لمحے میری نظر میز پر رکھے موبائل پر پڑی۔ میں نے موبائل اٹھا کر کسی دوست کو بلانے کی کوشش کی کہ موبائل میں حرکت ہوئی اور وہ سرک کر آگے ہو گیا۔ اگلے لمحے موبائل میری نظروں سے بالکل ہی غائب ہو گیا۔ یہ منظر میرے اوسان خطا کر گیا تھا۔

وحشت اور خوف نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میرا دل خوف کے مارے اچھل کر باہر آنے لگا۔ میں گھڑیال کی ٹک ٹک کی آواز پر بھی چونک رہا تھا۔ ہر آواز پر میری روح لرز رہی تھی۔ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ چاروں طرف گھرا سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ مگر آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ خوف میرے دماغ پر بری طرح چھایا ہوا تھا۔

کچھ وقت اور گزرا کوئی غیر مانوس آواز نہیں آئی۔ مگر خوف سے میرا بدن بے جان ہو کر پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کافی دیر گزر گئی کہ اس گہرے سناٹے میں کسی کے قدموں کی آہٹ پر میرے کان کھڑے ہو گئے، ابھی میں سنبھل کر ہی بیٹھا تھا کہ مجھے میرے نام لے کر پکارا گیا تو میرا دل حلق میں آ گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا کوئی سایا صحن میں اتر رہا ہے۔ پھر وہ سایا دیوار پر لمبا ہوتا چلا گیا۔ میں بری طرح گھبرا کر کانپنے پر مجبور ہو گیا۔ شدید سردی کے باوجود بھی میں پسینے میں شرابور تھا۔ مارے دہشت کے خوف میرے جسم میں سرایت کر گیا۔ پھر اچانک گھر کے ایک کونے میں بلی کے دو بچے آپس میں لڑنے لگے۔ ان کی آواز انتہائی خوفناک تھی اور پھر کچھ دیر بعد وہ اچانک ہی غائب ہو گئے۔

اندھیرے نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ لوگ نرم گرم بستروں میں نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ مگر میں لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ دن نکل رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر چھائی وحشت دن کی روشنی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ مگر اس وقت میں بخار میں بری طرح جل رہا تھا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میرا موبائل جو رات کو میز پر سے غائب ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے پہلو میں رکھا ہوا تھا۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے ناصر نامی دوست کو کال کر کے فوراً بلایا۔

☆......☆......☆

ناصر آیا تو میں نے اُسے ساری کہانی سنائی۔ جسے سن کر وہ بھی ہکا بکا رہ گیا۔

''اس نے کہا ضرور تم پر کسی چیز کا اثر ہو گیا ہے۔''

یہ سن کر میں خاصا پریشان ہوا۔ تو اس نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ابو کی ایک بہت پہنچے ہوئے پیر سے اچھی سلام دعا ہے۔ جو پیر سائیں کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ضرور اس معاملے میں ہماری مدد کریں گے۔''

اُس نے مزید بتایا کہ پیر سائیں بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ جن کے قبضے میں بہت سے جنات بھی ہیں۔ وہ جنوں بھوتوں اور بد روحوں کے علاوہ روحانی علاج بھی کرتے ہیں۔''

ناصر کی باتوں سے مجھے کافی حوصلہ ملا۔ لیکن میری بے تابی میں اضافہ ہو گیا۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے اندر گھر کر گئی تھی۔ انجانا سا خوف میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ پورا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ میں خوفزدہ ہو کر بیٹھ گیا۔

میری حالت دیکھ کر ناصر نے اپنے چھوٹے بھائی کو فون کر کے ہمارے گھر بلایا اور وہ اسے میرے پاس چھوڑ کر خود پیر سائیں کو لینے چلا گیا۔

☆......☆......☆

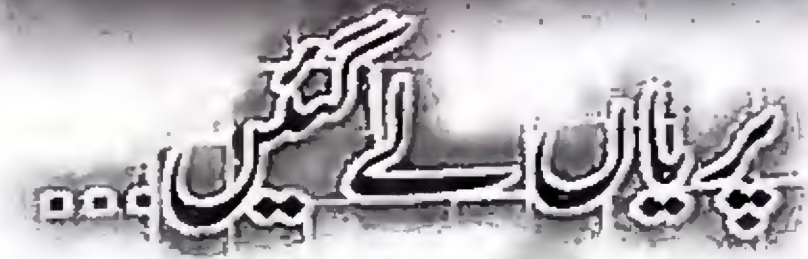
کافی دیر بعد وہ پیر سائیں کو لے کر آیا۔ پیر صاحب مجھ پر دم کرتے رہے اور ایک تعویذ مجھے پانی میں گھول کر پلایا۔ جس سے میری حالت قدرے بہتر ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ طبیعت سنبھل گئی۔

پیر سائیں نے میرے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا۔ اب ان کے چہرے پر بھی سکون تھا۔

انہوں نے بتایا کچھ شرارتی جنات مجھے تنہا دیکھ کر تنگ کر رہے تھے۔ مزید انہوں نے ایک وظیفہ پڑھنے کو دیا۔ جسے میں آج بھی پابندی سے پڑھتا ہوں۔

آج اس واقعے کو تین سال بیت گئے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ مگر میں ان واقعات سے بہت ڈر گیا ہوں۔ آج بھی اس رات خود پر بیتے ہوئے کسی بھی واقعے کا خیال آتا ہے تو شدید خوف محسوس کرتا ہوں۔ میرے دل و دماغ میں انجانا سا خوف بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے اور میں اکثر رات کو سوتے ہوئے ڈر جاتا ہوں۔ آپ سب دعا کریں۔ میرے دل سے خوف و ڈر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

☆☆......☆☆



پریاں لے گئیں...



عظمیٰ شکور

بس ایک ذرا سی غفلت نے ہمیں بے بس کر دیا اور......

صرف چھ ماہ کی عمر میں ماں دنیا میں باپ کی گود دے کر رخصت ہوگئی تھی۔ ایک بڑی بہن تین بھائیوں کی لاڈلی تھی میں۔ مگر ماں کی جدائی، اس کی ممتا کا عکس نہ محسوس کر پائی تھی۔ شاید میں بدنصیب ہوں مگر نہیں......

والد صاحب نے بہت ہی چھوٹی عمر میں میری شادی کر دی کہ ماں کا سایا سر پہ نہ تھا۔ کون دیکھ بھال کرتا۔

صرف تیرہ سال کی عمر میں، میں دلہن بن کر احمد کے گھر آ گئی۔ پھر وہی ذمہ داریاں جو کہ ایک عورت کے ناتے نبھانی ہوتی ہیں۔ اس عمر میں یہ بار میرے نازک کندھے جب نہ اٹھا سکے، تو پھر ساس کے طعنے نصیب بنے اور نندوں کی صلواتیں الگ، مگر شوہر پڑھے لکھے تھے۔ میں اس میں بیٹا کر تی۔ اور پھر اولاد کی آمد نے زندگی کو مصروف کر دیا۔ اور میں پہلے سے بھی زیادہ سمجھ دار ہوگئی اور گھر کو سنبھالنے لگی، گھر میں جب رحمتیں برسیں تو اکٹھی تین تین۔

ساس کی باتیں سن سن کر جب میں تنگ آ جاتی تو بولتیں یہ پتھر ہمارے ہی نصیب میں ہیں کہ لڑکیوں نے تو اس خاندان میں منجھی (چارپائی) ڈال لی ہے۔''

اُف میں کہاں جاؤں۔ مگر خیر دعا کا دامن میں نے ہرگز نہ چھوڑا۔

اس بار اللہ نے نعمت عطا کی۔ میں جتنا شکر ادا کرتی اس ذات باری تعالیٰ کا کم تھا۔ احمد تو ایسے خوش تھے۔ جیسے جنت پالی ہو۔ اور میں حیران حیران سی انہیں دیکھا کرتی۔ ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ میں ایک اور بیٹے کی ماں بن گئی۔

''یا اللہ میں اس قابل تو نہ تھی کہ تیری اتنی عنایتیں ہوتیں مجھ پر۔'' میں اشک بار تھی۔

بچہ انتہائی خوبصورت تھا۔ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اُف! اس قدر حسین...... میں ڈر جاتی۔ یا اللہ اسے نظر بد سے بچانا۔'' میری ساس مجھ سے جیسے خوش ہوگئی تھی اور میں شاکر تھی۔ اس رب کریم کی کہ میری جنت کو نظر نہ لگے کسی کی۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب شہروز چھ ماہ کا ہی تھا۔ میں اُسے نہلا کر کپڑے نکالنے الماری کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اُسے کیسے اٹھاؤں۔ جیسے تیسے میں اُسے پکڑ کر ساس کے پاس لے آئی۔ وہ رونے پیٹنے لگ گئیں۔ میں گلی میں بھاگی، گلی کے کچھ لوگ اُسے ہسپتال لے گئے۔ مگر کچھ ہی دیر میں وہ شہروز کو لے کر واپس آ گئے کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

میں شہروز کو ساتھ چمٹائے چمٹائے پھرتی۔ ''یا اللہ! میرے بچے کی حفاظت کر......''

مگر یہ تو اب روز ہی ہونے لگا...... روز ہسپتال جاتے مگر وہاں جا کر بچہ بالکل ٹھیک ہو جاتا۔

کسی نے کہا کہ اسے دم کرواؤ۔

اب ہم نے مولوی کے دم درود کی راہ لی اور صدقات و خیرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہمارے حالات ایسے تو نہ تھے کہ روز روز بکرا لے کر صدقہ کرتے۔ مگر عاملوں کی ہدایت پہ یہ سب کرنا پڑتا۔

''پھر احمد کے دوست نے مشورہ دیا کہ نوشہرہ میں ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کے پاس بچے کو لے کر جائیں۔''

احمد نے مجھے ساتھ لیا اور ہم نوشہرہ چلے گئے۔

مزار پہاڑ کے اوپر تھا۔ یہ وہاں قبریں بہت بڑی بڑی بنی ہوئی تھیں۔ اور ایک بہت بڑا سا قبرستان تھا۔ اتنا پُر سکون جیسے یہاں جنتی سو رہے ہوں۔

ان بزرگ کے پاس جب گئے تو انہوں نے کچھ لکھ کر حساب کیا اور پھر ہمیں جو بتایا وہ حیران کن تھا۔

وہ بولے کہ اس بچے پر 'پریوں' کا دل آ گیا ہے۔ غالباً کھڑکی کے پاس بچہ ننگا پڑا تھا۔ ان پریوں کا گزر وہاں سے ہوا تو وہ اس بچے پر عاشق ہو گئیں۔

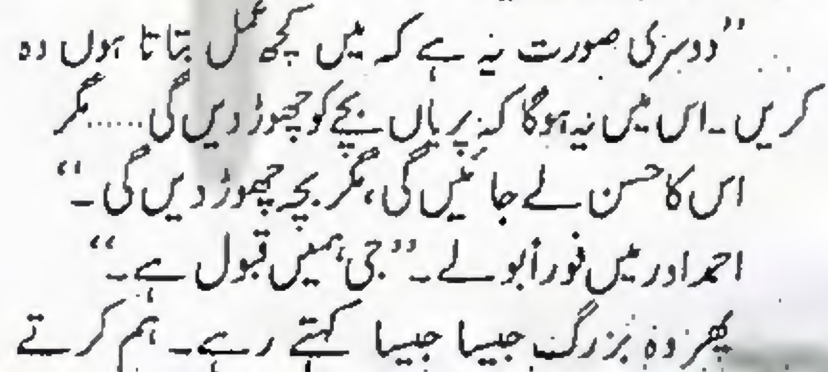
احمد کے ماتھے پہ پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ جو اُن کی پریشانی کا پتا دے رہی تھیں۔

''وہ پریاں اس بچے کو لے جانا چاہتی ہیں۔''

ان بزرگ کی یہ بات سن کر میں زار زار رونے لگی۔ احمد نے حوصلہ دیا۔

''دوسری صورت یہ ہے کہ میں کچھ عمل بتاتا ہوں وہ کریں۔ اس میں یہ ہوگا کہ پریاں بچے کو چھوڑ دیں گی...... مگر اس کا حسن لے جائیں گی، مگر بچہ چھوڑ دیں گی۔''

احمد اور میں فوراً بولے۔ ''جی ہمیں قبول ہے۔''



پھر وہ بزرگ جیسا جیسا کہتے رہے۔ ہم کرتے رہے بچے کے بال گھنگھریالے تھے، براؤن تھے۔ اس کی بار بار حجامت کرائی گئی، تو اس کے بال پہلے جیسے نہ رہے۔ ان کا رنگ بدل گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے دیکھا کہ اس کا رنگ بھی بدل گیا ہے۔ جو وہ چمکتا دمکتا تھا۔ ویسا نہیں رہا، مگر ہمیں اس کی زندگی چاہیے تھی، حسن نہیں۔

اللہ کی کرم نوازی سے میں اور احمد اللہ کی آزمائش میں سُرخرو ہوئے اور پھر اللہ پاک نے حساب برابر کر دیا۔ یعنی تیسرا بیٹا بھی عطا کیا۔ واہ اللہ تیری قدرت! تو کسی کو مایوس نہیں کرتا۔

میرا شہروز آج شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ خوبصورت تو ہے مگر ویسا نہیں ہے جیسا تھا۔ اس کا بیٹا اس جیسا ہے۔

یا اللہ تو بڑا رحیم و کریم ہے۔ بندے پہ ایسا بوجھ نہیں ڈالتا کہ وہ سہہ نہ سکے۔ بے شک، بے شک۔

☆☆......☆☆



وہ یکم جنوری...

تحسین جوینجو

وہ سال کا پہلا دن تھا مگر زندگی نے اُس دن......

ہم چار دوست ، میں یعنی روبیش ، جبران، فہد اور غلام مرتضیٰ روزمرہ کی روٹین سے کچھ بوریت محسوس کر رہے تھے اور کچھ فراغت بھی تھی، موسم سرما کی چھٹیوں کی وجہ سے۔ تو سوچا کیوں نے تھوڑی تفریح ہو جائے۔ آپس میں مشورہ کر کے نئے سال 2015 کی یکم جنوری کا دن منتخب کیا گیا۔

صبح ناشتے کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ میں اور جبران ایک بائیک پر، دوسری پر فہد اور غلام مرتضیٰ ویسے بھی ہماری رہائش حیدرآباد میں ہے تو کوئی دشواری پیش آئی نہ لمبی چوڑی فہرست بنانے یا گاڑیوں کے جھنجٹ میں وقت ضائع کیا، پروگرام طے پایا اور بس ہم لوگ نکل پڑے۔

حضرت نہال شاہ نوریؒ کا مزار تقریباً 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حیدرآباد سے تو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ یہ روڈ ٹنڈو محمد خان کہلاتا ہے جو کہ بدین تک جاتا ہے، یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ حیدرآباد سے ہوتا ہوا دریائے سندھ تک ایک پہاڑی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ وہاں جانے کے لیے ایک مخصوص روڈ ہے جہاں سے گاڑی سے آ سکتے ہیں۔ باقی ایک سنسان پیدل جانے کا راستہ ہے۔ جو کہ بہت ہی عجیب و غریب بھی دکھتا ہے۔

صحرا ہی صحرا ویران جب پہاڑ سے نیچے اترو تو پھر ایک جگہ اس سمت چلنا پڑتا ہے تو پہاڑ ہی پہاڑ آگے چڑھ کر دیکھیں تو پورا منظر ہی تبدیل لگتا ہے۔ درگاہ کسی اور ہی جگہ کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ بندہ کچھ دیر کے لیے دم بخود سا کھڑا رہ جاتا ہے کہ اب کس سمت جانا ہے۔ خیر درگاہ کی جانب ایک عام سا راستہ بنا ہوا ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر اب سڑک بنائی گئی ہے۔ عام حاضرین کے لیے اس میں کوئی دشواری درکار نہیں۔ ہم نے تو جان بوجھ کر اس ویران اور سنسان راستے کو منتخب کیا کہ ان پہاڑوں کے اجاڑ اور ویران راستے سے کیسا ڈر و خوف، رسک لینے سے ہی نیا تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ ہم قوتِ یقین کے ساتھ چل پڑے۔ ماتھے پر ایک شکن بھی نہ تھی کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

جبران نے کہا۔ ”روبیش یار! یہ سب کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں۔“

”ابے چپ کر مجھے تو عجیب ہی لگ رہا ہے اور تو مزے کی بات کر رہا ہے۔ میرے خیال سے ہمیں واپس پلٹنا چاہیے۔ محسوس ہو رہا ہے کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔“ روبیش نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”ہاں یار روبیش تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ فہد نے ٹوکا۔

”ارے سب بکواس ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور تم......“

”اچھا اچھا اب مزید موڈ خراب مت کرو، ہم انجوائے کرنے آئے ہیں نہ کہ بحث و مباحثے کی غرض سے۔“ میں نے جان چھڑانے میں ہی غنیمت جانی۔

نہ جانے دل پھر بھی مطمئن نہیں رہا میرا، شاید اس لیے کہ انسان میں مقناطیسی خوبیاں وافر مقدار میں پائی گئی ہیں۔ کچھ اس کا بروقت صحیح استعمال کر کے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ بعض اوقات کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو وقت پر ہم کہہ نہیں پاتے علاوہ ازیں ذہن کے پردے ہمیں اس وقت اجازت نہیں دیتے۔ مگر شعور ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں چوکنا کرتا ہے۔ اپنے ذہن کی لحہ بہ لحہ خبریں فراہم کرتا ہے۔ حالات سے آگاہ کرتا ہے، جس سے ہم باخبر رہتے ہیں۔ دراصل ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ قوت فکر، تصور اور خیالات سے کام لے کر ہی کرتے ہیں۔ اور وہی تصور اور خیال مجھے چوکنا کر رہے تھے۔ لیکن میرے ساتھی میری بات پر غور کرنے کے بجائے اظہارِ مسرت میں ہی مگن رہے، پھر سوائے خاموشی کے چارہ نہیں رہا تو آگے بڑھتے گئے۔

ہر بڑھتا قدم پتھر سے ہی سامنا کراتا رہا، اور میں دل ہی میں اپنے آپ کو کوستا رہا کہ اس راستے سے آ کر ہم بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ گاڑی سے آتے تو کتنا اچھا ہوتا جیسے سب لوگ آتے ہیں۔ خدانخواستہ اس ویرانے میں اگر کچھ ہو گیا تو کسی کی ہڈیاں بھی ہاتھ نہیں لگیں گی۔ جہاں انسان کا نام و نشان بھی نہیں۔

خیر ہم یہی باتیں کہتے سوچتے آخرکار درگاہ تک پہنچ ہی گئے۔ سلام عقیدت پیش کرنے درگاہ کے اندر داخل ہوئے تو اچانک سامنے نظر پڑتے ہی چونکے، درگاہ کے اندر کسی بھی انسان کا وجود نہیں لیکن یہ دو بچے اکیلے یہاں پر کیا کر رہے ہیں۔ بہت ہی خوبصورت، عمر تقریباً 4، 3 سال کے قریب ہوگی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور ہماری آمد پر چونکے بھی نہیں، حالانکہ ہم آپس میں چہ میگوئیاں کرتے رہے کہ یہ بچے یہاں کس کے ساتھ آئے ہیں۔ اس ویرانے میں انہیں کون یہاں چھوڑ گیا۔

فہد نے حواس مجتمع کر کے بچوں سے پوچھا۔
”بیٹا آپ کس کے ساتھ آئے ہیں؟ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو۔“ مگر جواب ندارد......

یہی عمل پھر سے دہرایا گیا۔ پھر وہی خاموشی......

یہ عجوبہ دیکھ کر اپنی تو جان ہی نکلی جا رہی تھی۔ آنکھ کے اشارے سے کہا ساتھیو کو ”نکلو یہاں سے“ وہ بھی اسی کے منتظر تھے۔ فوراً سرکنے لگے۔ درگاہ سے باہر آئے تو جان میں جان آئی کہ ہم صحیح سلامت نکل تو آئے۔ مزید کچھ دیکھنے اور بولنے کی ہمت جواب دے گئی۔

”یار جلدی چلو نا، معلوم نہیں یہاں کیا ماجرا ہے۔“ غلام مرتضیٰ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گیا تھا۔

ابھی ہم جانے ہی لگے تھے کہ وہی دو بچے بھی باہر آ گئے۔ برابر میں کوئی غار نما چیز تھی، وہ بچے دوڑ کر اس میں غائب ہو گئے۔ اب تو سب پر خوف طاری ہو گیا کہ بچے کہاں غائب ہوئے۔

موقع پا کر ہم تیز تیز قدم اٹھا کر چلنے لگے۔ پتھروں پر چلنے سے پاؤں پہلے ہی شل ہو گئے تھے اور اب بھاری بھی......اس خاموشی میں سوائے چیلوں کی آواز اور دل





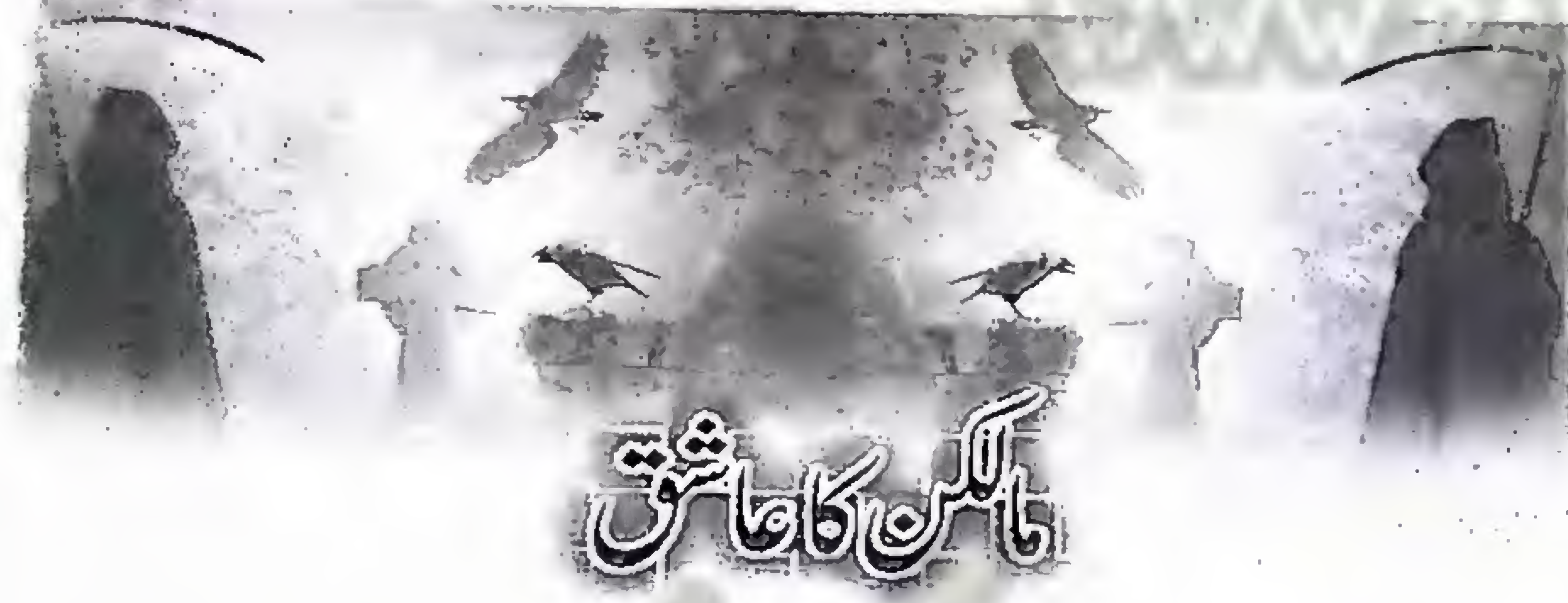


دشر کنے کی ہی صدا سنائی دے رہی تھی۔
پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت تو کسی میں تھی ہی نہیں، لیکن سورج کا ساتھ پا کر دیکھنا ہی پڑا۔
''جبران وہ دیکھو، وہی بچے وہ ہمارے ہی پیچھے آ رہے ہیں۔'' میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اب تو پاؤں بھی جواب دے گئے تھے۔
جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کے ورد کے علاوہ کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔
''آج تو پکا ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔'' فہد نے کہا۔ جیسے ہی ہم قدم اٹھاتے، وہ اتنے ہی قریب آتے...... اب ہماری رفتار کم ہو گئی تھی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ پھر وہ ہمارے سامنے ہی آ گئے۔
تب میں نے ان بچوں سے سندھی میں بات بات کی لیکن جواب ندارد، اردو، سرائیکی اور انگلش میں، پھر بھی خاموشی کا قفل نہیں ٹوٹا۔ بس چپ سادھے ہی رہے۔
فہد نے پتا نہیں کس خیال سے جیب میں سے 500 کا نوٹ نکال کر انہیں دکھایا۔ جسے دیکھ کر وہ بہت خوشی سے نظر آئے، آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر سوچا کہ اب یہ پیسے لے کر ہماری جان چھوڑ دیں گے۔ جو کہ ہماری خام خیالی ہی تھی۔ سب نے اپنی اپنی جیب میں سے پیسے نکالے جتنے بھی تھے، وہ بھی انہوں نے خوشی سے لیے۔ لیکن محسوس ہوا جیسے مزید پیسے مانگ رہے ہوں، یہ جانتے ہوئے ہماری پریشانی سوا ہو گئی۔
اب کیا ہوگا، یہ بول بھی نہیں رہے۔
اب ہم تو سب پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ ہم لوگ سوچنے کی صلاحیت گنوا چکے تھے کہ ایک دم ان بچوں نے عجیب قسم کے اشارے کیے ایک دوسرے کو بغیر آواز نکالے، جیسے سیکڑوں بچے ہمارے اردگرد موجود ہوں۔ ہم صرف محسوس ہی کر سکتے تھے۔ وہ گول دائرے میں نظر دوڑاتے اور اشارے کرتے رہے۔ ہم پھٹی آنکھوں سے انہیں گھورتے رہے۔ پھر ان بچوں نے ایک قطار بنائی اور پہاڑوں کے پتھر ہٹا کر ایک طرف کرنے لگے۔ جہاں جہاں سے ہم گزرتے تھے ہوش اڑانے والا منظر...... جو ہم نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ پتھر اتنے بھاری اور بڑے تھے کہ دس پندرہ بندے مل کر بھی ہلا تک نہ پائیں۔ جب کہ وہ ایک ہاتھ سے چٹکی بجا کر وہ سارے پتھر ہٹاتے جا رہے تھے۔ وہ ہمارے لیے راستہ بناتے جا رہے تھے جبکہ وہاں کوئی کانٹا وغیرہ بھی موجود نہیں تھا۔
اب ہماری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جبران تو یہ منظر دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم اسے سنبھالتے یا خود کو۔ اتنے میں کہیں دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا لمبا سا، چند ہی لمحوں میں وہ ہماری نظروں کے سامنے موجود تھا۔ قریب پہنچ کر ان بچوں سے کچھ بات چیت کی بلوچی میں جو ہم سمجھ نہیں پائے، بس محسوس یوں ہوا کہ وہ بچوں کو ڈانٹ رہے ہیں۔ ڈانٹ سن کر وہ بچے بھاگ کر کہیں غائب ہو گئے۔
ہم نے بہت کوشش کی کہ معلوم ہو سکے کہ وہ جا کہاں رہے ہیں، مگر ناکام ہی ہوتے۔
اس آدمی سے پوچھنا چاہا مگر اس نے ہمیں منہ نہ لگایا، بس اتنا ہی کہا کسی سے بھی اس بات کا ذکر مت کرنا، خاص طور پر کسی حکیم یا ڈاکٹر حضرات سے اور ہاں یاد رہے ہم سب سورۃ مزمل 41 بار پڑھ لینا۔'' اتنا کہہ کر وہ بھی ہماری نظر سے اوجھل ہو گیا۔
تب جا کر ہمارے ہوش ٹھکانے آئے۔ پھر ہم تیزی سے جبران کو گھسیٹ کر اٹھانے کی کوشش میں لگ گئے، تو اس کے بھی اعصاب بحال ہو گئے، پھرتی سے ہم نے دوڑ لگائی اور بائیک تک پہنچ کر اڑن چھو گئے۔

☆......☆......☆

خبر نہیں ہم گھر کیسے پہنچے۔ مسلسل 3 دن تک بستر پر پڑے رہے، ہوش نہ ہمت کہ سورۃ مزمل کا خیال بھی آتا۔ پانچویں دن طبیعت سنبھلی تو سورۃ مزمل 41 بار پڑھی تو اس ورد سے سب نارمل سا محسوس کرنے لگا۔
مگر ابھی تک میں اس واقعے کو فراموش نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ خواب تھا یا حقیقت جو آنکھوں کے کیمرے میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک سرد سی لہر وجود میں سرایت کر جاتی ہے کہ اس نئے سال کے آغاز میں ہی ایک پُراسرار منظر جاگتی آنکھوں نے دیکھا اور یکم جنوری 2015، میری زندگی کے البم میں اپنی پُراسرار تصویر کی نشانی دے دیا گیا ہے۔

☆☆......☆☆



مالکن کا عاشق

رئیسہ خالد

وہ اپنی مالکن پر مرمٹا تھا مگر اُن کا ملن کسی بھی جنم میں ممکن نہ تھا، اسی لیے......

میں اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظر سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ آج پھر آسمان ابر آلود تھا۔ موسلا دھار بارش ہونے ہی کو تھی۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا جہاں میں اپنے ابو کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ اونچی نیچی وادیوں کا سلسلہ تھا۔ کہیں سپاٹ، کہیں اونچی نیچی اور کہیں بل کھاتی ہوئی۔ میں کھڑکی کے قریب آ گئی۔ شیشوں سے باہر کا منظر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک برف



باری ہونے لگی۔ پھر میری نظریں برفیلی چوٹیوں سے ہوتی ہوئی اس پتلی سی پگڈنڈی پر آ کر ٹھہر گئیں جو یہاں سے سیدھے شہر کی طرف جاتی تھی۔

میرے ابو ایک ہفتے سے گھر سے باہر تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میری ماں کون تھی۔ میں نے اپنے ہوش میں اپنی ماں کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ میرے ابو مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کا کام شکاریوں کی مدد کرنا ہے۔ اس لیے وہ انہیں شکار کے لیے اکثر نئے نئے مقامات پر لے جاتے ہیں۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ کبھی کبھی وہ ہفتوں گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ میں تنہائیوں کی عادی ہو چکی تھی۔

جب سے میں یہاں آئی تھی سامنے والے بنگلے میں کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔ بنگلے کے پاس گہرا سناٹا ہوتا۔ کبھی کبھی ایک مخصوص کمرے سے ہلکی سی روشنی نظر آتی۔ اور چلنے پھرنے کی آوازیں بھی آتیں۔

کبھی کبھی اگر کوئی آ کر ٹھہرتا بھی تو ایک دو دنوں میں جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا۔ مشہور تھا کہ وہاں بھٹکتی ہوئی روحوں کا بسیرا ہے۔

اس دن بھی ایسی ہی بھیگی بھیگی شام تھی۔ میں کھڑکی سے لگی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ بہت حسین منظر تھا۔ اچانک ایک لڑکا جو غالباً چودہ پندرہ سال کا تھا۔ اس بنگلے کی طرف جاتا دکھائی دیا جو مدتوں سے بند پڑا تھا۔ لڑکا بہت خوبصورت تھا۔ اونچا قد، خوبصورت ڈیل ڈول حسین چہرہ آنکھیں بھیگی بھیگی۔

اُسے اس بنگلے کے قریب دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ گھر آسیب زدہ مشہور تھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں بس یہی سوچتی رہی کہ آخر یہ نوجوان کون ہے اور کس مقصد سے یہاں آیا ہے۔ اگر یہ شکاری ہوتا تو اس کے پاس ساز و سامان ہوتے۔ مگر اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ اس آسیب زدہ مکان میں کیوں جا رہا ہے؟ شاید اس مکان کے بارے میں اسے کچھ علم نہ ہو۔

میں نے سوچا کہ بھاگتی ہوئی جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے۔ اور پھر اسے بتاؤں کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ اسے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بنگلے میں داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ایک سیاہ بالوں والی بلی بھی چل رہی تھی۔ شاید اس لڑکے کو بلی کا علم ہی نہ ہو۔

آہستہ آہستہ میں بنگلے کے قریب گئی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور اندر جھانکنا چاہا تو اندر سے آواز آئی۔

''مجھے اپنا انجام معلوم ہے۔ میں پھر کہتا ہوں میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم مانو یا نہ مانو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔''

میرے پاؤں کانپنے لگے تھے اور جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ مگر میں دم سادھے کھڑی رہی۔ میرے قدموں میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی۔ میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ مرد کی آواز پھر آئی۔

''تم جانتی ہو میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے تم سے عشق کیا ہے۔ میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ ہماری اور تمہاری عمر میں فرق ہے تو کیا ہوا۔ اگر تم مجھ سے بڑی ہو تو بھی میں تم سے ہی شادی کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے اس لیے کہ میں نے تمہارے جسم سے نہیں تمہاری روح سے محبت کی تھی۔ اور روح کبھی مرتی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں روح کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ میری زندگی میں تم کسی اور کی ہو جاؤ...... یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی جان دے دوں گا۔'' لڑکے کی آواز میں بڑا درد تھا۔ لیکن عورت کی طرف سے خاموشی تھی۔ پھر کسی کی چاپ سنائی دی اور وہ لحظہ بہ لحظہ قریب آتی گئی۔ میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح تاریکی میں چھپا لیا اور سانس روکے کھڑی رہی۔ مگر مجھے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اچانک کمرہ تاریک ہو گیا اور کوئی سایا کمرے سے نکل کر باہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں اس کی صرف جھلک ہی دیکھ سکی۔ یہ وہی کم سن اجنبی تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اور پھر وہ تاریکی میں گم ہو گیا۔ پھر میں نے شیشوں سے کمرے کی طرف جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ پھر یہ کس سے باتیں کر رہا تھا۔ خوف کی سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

میں چھپتے چھپاتے باہر آئی اور سوچتی رہی کہ آخر وہ کون تھی جس سے وہ باتیں کر رہا تھا۔ مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اجنبی تو کمرے سے تنہا نکلا تھا۔ اس کے ساتھ تو کوئی بھی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

دوسری صبح جب میں پھر بنگلے میں گئی تو وہاں سناٹے کا راج تھا۔ بنگلے سے گزر کر باغ میں گئی تو وہاں کیاریوں کے درمیان سفید اور پیلے چہرے والی ایک جوان خاتون نظر آئیں۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ وہ سفید ساڑی میں ملبوس تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے جب اسے مخاطب کیا تو وہ مسکرا دی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ بھی انوکھی لگی۔ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے بارے میں آپ کچھ بتائیں گی۔''

محترمہ کا چہرہ اچانک سرخ انگاروں کی طرح چمک اٹھا۔ انہوں نے سرسرائی ہوئی اور کانپتی آواز میں خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے ان کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ بہت دور سے آ رہی ہو۔ اور وہ خود کہیں کھو گئی ہوں۔

''میری کہانی بہت دردناک اور تشنگی بھری ہے۔ میں اس وقت جوان تھی۔ دل کش اور خوبصورت دوشیزہ، مگر اس کی یاد اس قدر روح فرسا ہے کہ میں جب اسے یاد کرتی ہوں تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔''

میری بے تابیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب اس کمسن عاشق نے میرے لیے خودکشی کی تو اس کی عمر صرف پندرہ یا سولہ سال تھی۔ اور میں پچیس سال کی خوبصورت دوشیزہ تھی۔''

''اس نے آخر خودکشی کیوں کی۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ میرا عاشق تھا۔ سچا عاشق بس میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک غیر معمولی عاشق تھا۔ ایسی کم عمر میں ایسا عاشق میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی محبت پرستش سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ اس کا جذبۂ محبت بڑے بڑے عاشقوں سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ میں بھی بڑی معصوم دوشیزہ تھی۔ میرا اتنا معصوم اور حسین چہرہ تھا کہ دوشیزگی کی تمام رعنائیاں اُس پر صدقے ہوتی تھیں۔ یہ میں نہیں میرا عاشق کہتا تھا۔ میری بدقسمتی دیکھو کہ اس کی پیار بھری باتوں کو میں نے کبھی اہمیت ہی نہ دی کیونکہ میں ہمیشہ اسے بچہ ہی سمجھتی رہی۔ وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔ تقریباً دس سال چھوٹا۔

اکثر رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں لان میں چلے جاتے۔ وہ میرے کانوں میں سرگوشی کرتا۔ اور میرے ہاتھ دبا کر بڑی سنجیدگی سے کہتا۔ ''دیکھو اِدھر دیکھو میری آنکھوں میں دیکھو...... مگر آہ! تم مجھے نہیں سمجھتی ہو۔ کاش تم سمجھ پاتیں کہ محبت کس قدر دل کش چیز ہے۔''

میں ہنس پڑتی اس کی محبت کو مذاق سمجھ کر محض اسے خوش کرنے کے لیے ہنس پڑتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے آباؤ اجداد کی بہادری کے کارنامے سناتا اور پھر کبھی ان کے عشق کی داستانیں سناتا۔ کبھی اچانک وہ سنجیدہ ہو جاتا اور کہتا 'عشق میں جان دینا بہت مشکل مگر عشق میں جینا بہت آسان ہے......' میں سچ کہتا ہوں اگر تم نے کبھی میرے ساتھ بے وفائی کی تو میں عشق میں جان دینا بھی جانتا ہوں۔ یقین کرو کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہیں کبھی نہیں۔''

میں اقرار کرتی ہوں کہ بے شک میں مجرم ہوں اپنے کمسن عاشق کی مجرم، تمام عمر میں اس خیال سے کانپتی رہی ہوں۔ اس کی معصومانہ پرستش کا انداز اس وقت میرے لیے ایک مذاق تھا، ایک کھیل تھا۔ ایک دن وہ اشک بار آنکھوں سے میرے سامنے گڑگڑانے لگا اور بہت جذباتی ہو کر بولا۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تم سے عشق کرتا ہوں۔ میری بات غور سے سنو اگر کبھی تم میری محبت کو ٹھکرا کر کسی اور کے پاس چلی گئیں تو میں تمہاری محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ضرور خودکشی کرلوں گا۔ میری بات کا یقین کرو میں جو کہہ رہا ہوں وہ سچ ہے اور میں ایسا کر گزروں گا۔''

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بک رہا ہے۔ میں بالکل خاموش تھی۔ ہم اس وقت لان میں تھے۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''چلو اب گھر چلیں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔'' وہ چپ چاپ میرے پیچھے ہولیا۔ اس نے مجھے روک کر بڑی سنجیدگی سے پھر کہا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اگر تم نے ذرا بھی مجھ سے کنارہ کشی کی تو میں زندہ نہیں بچوں گا۔ میں اپنی جان دے دوں گا۔ میں مرجاؤں گا۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ ہم محبت میں کتنا آگے بڑھ چکے ہیں۔ ایک دن میری سنجیدگی اور خاموشی پر اس نے مجھے ٹوکا تو میں نے غصے سے بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھو اب تم بچے نہیں رہے کہ اس قسم کے مذاق کو روا رکھا جائے۔ مگر عشق کے میدان میں تم ابھی بچے ہو۔'' میں نے سمجھا کہ اب اس کا بچپنا رخصت ہو جائے گا اور اب وہ مجھے تنگ نہیں کرے گا۔

موسم گرما کی چھٹیاں ختم ہورہی تھیں۔ وہ جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر زبردستی اسے اسکول بھیج دیا گیا۔ اسی دوران میرا ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے والا تھا۔ میں خوبصورت تھی فوراً پسند کرلی گئی۔

میرے کمسن عاشق کو کسی طرح پتا چل گیا۔ وہ پڑھائی چھوڑ کر گھر آ گیا۔ ست اور اُداس رہنے لگا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ مجھ سے بھی نہیں۔ میں بہت پریشان ہوگئی۔

ایک دن جب صبح اٹھی تو دروازے پر ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ پڑا پایا اس میں لکھا تھا۔

''تم نے ان تمام حسین وعدوں کو توڑ دیا۔ اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ اب میرے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ میری موت کی ذمہ دار تم ہو اور صرف تم۔ میری تم سے آخری بار یہ التجا ہے کہ تم اسی باغ میں آ کر آخری بار ملو۔''

میں کانپ اٹھی۔ اور پہلی بار میرے ہوش وحواس اُڑ گئے۔ نہایت عجلت میں گرتی پڑتی باغ کی طرف بھاگی۔ میری نظریں اسے اِدھر اُدھر تلاش کررہی تھیں۔ آخر میں نے دیکھا کہ ایک گھنے پیڑ کے درمیان اس کا جسم جھول رہا تھا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ جب میں ہوش میں آئی تو میں اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ میری امی سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔''

پھر جانے کیا ہوا کہ وہ زار وقطار رونے لگی۔ میں مایوس اور اُداس قدموں سے دروازے تک آئی۔ قریب ہی ایک بوڑھا آدمی جو شکل وصورت سے مالی لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھرپی تھی۔ شاید وہ اس عجیب وغریب بنگلے کا مالی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس بنگلے کی مالکن یہاں اکیلی رہتی ہیں۔ مالی نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''کون سی مالکن! اُن کو تو مرے ہوئے زمانہ ہوگیا۔''

مجھ پر یہ سن کر خوف اور گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ میں نے پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''وہ نوجوان جو یہاں برابر آتا ہے، وہ کون ہے۔'' مالی نے پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ ایک قبر کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''یہ وہی ہے مالکن کا کمسن عاشق! جس نے آج سے چالیس سال قبل مالکن کے لیے خودکشی کرلی تھی۔ اس کے غم میں مالکن نے بھی جان دے دی تھی۔''

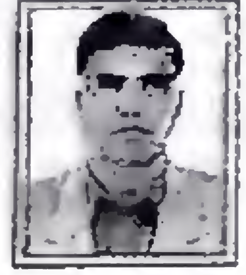
میں ڈر گئی اور بھاگنے لگی۔ پلٹ کر دیکھا تو مالی بھی غائب تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں کسی نہ کسی طرح بھاگتی ہوئی اپنے گھر پہنچ گئی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جن سے ملی، جن سے باتیں کیں، کیا وہ تینوں روحیں تھیں۔

☆☆......☆☆



پچیسویں قُربانی



محمد سلیم اختر

فراعنہ کی سرزمین سے، اُس نوٹی دیوی کی کہانی

جس کے سامنے لایا جانے والا چور، پتھر کا بت بن جایا کرتا تھا



نوید کافی دیر گھوم پھر کر جب خیمے میں داخل ہوا تو عقیل اور عدیل کھدائی میں سے برآمد ہونے والی متفرق اشیاء کے معائنے میں مصروف تھے۔ نوید بربری نسل کا ایک تومند انجینئر تھا۔ جسے انہوں نے خاص طور سے اس مہم کے لیے ایک دوست کی معرفت قاہرہ سے بلایا تھا۔ آثار قدیمہ کی کھدائی کی مہم جس کی ابتدا ایک عجیب اتفاق سے شروع ہوئی تھی۔ گزشتہ چالیس دنوں سے جاری تھی۔ جس کے نتیجے میں سطح زمین سے بستی کے آثار دریافت ہوئے تھے۔

زمانہ طالب علمی سے ہی عقیل کو تاریخ اور خاص طور سے قدیم مصر کی پُراسرار تاریخ کا مطالعے کا بے حد شوق رہا تھا۔ لندن میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے وطن واپس جانے سے قبل اہرام، ابوالہول اور دوسرے معروف آثار قدیمہ کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ یونیورسٹی میں کئی ماہ پہلے اس کی ملاقات ایک سینئر مصری طالب علم عدیل سے ہوئی تھی۔ جو قصر۔ فرافرا کا رہنے والا تھا۔ ہم ذوق ہونے کی وجہ سے دونوں کی دوستی اس قدر گہری ہوگئی کہ جب عدیل کو اس کے ارادے کا علم ہوا تو اس نے بڑے اصرار کے ساتھ عقیل کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔

چنانچہ عقیل نے قاہرہ پہنچتے ہی عدیل کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی۔ عدیل نے فوراً اسے خط لکھا کہ سردست وہ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے قاہرہ نہیں آسکتا لیکن عدیل مصر چھوڑنے سے قبل قصر فرافرا ضرور آئے۔ عقیل نے ایک ہفتہ تک اہرام مصر کی سیر کی اور پھر اپنے دوست سے ملنے چل دیا۔ قصر فرافرا قاہرہ سے جنوب مشرق میں تین سو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا صحرائی شہر ہے۔ جہاں صرف اونٹوں کے ذریعے ہی پہنچا جاسکتا ہے۔

عقیل ایک گائیڈ کی ہمدردی میں روانہ ہوا۔ مگر ابھی وہ قصر فرافرا سے پچاس میل کے فاصلے پر تھے کہ بادِ سموم کے ایک زبردست طوفان میں گھر گئے۔ طوفان اتنا شدید تھا کہ عقیل کے گائیڈ کے بقول اس نے پوری زندگی میں ایسا طوفان نہیں دیکھا تھا۔ ہوا کے زبردست تھپیڑوں اور بگولوں نے انہیں اپنے راستے سے بھٹکا کر کئی میل مغرب میں ایک پہاڑی سلسلے کی طرف ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جب طوفان گزر گیا اور عقیل آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا تھا تو اپنے سامنے چند گز کے فاصلے پر ریت کا ایک بڑا سا گڑھا دیکھا۔ جس میں ایک گول سی چٹان ابھری ہوئی تھی۔

جب اس نے گڑھے کے اندر اتر کر قریب سے اس کا جائزہ لیا تو اسے کچھ شبہ سا ہوا کہ جیسے وہ کسی عمارت کا گنبد ہو۔ کیونکہ وہ کوئی ایک پتھر نہیں تھا۔ بلکہ بڑے بڑے پتھروں کو تعمیراتی انداز میں مسالے سے جوڑ کر

گنبد کی شکل دی گئی تھی۔ اس نے مزید ریت اٹھا کر دیکھا تو گنبد کچھ اور نمایاں ہوگیا مگر وہ زمین کے اندر اتنا گہرا دبا ہوا تھا کہ اسے کھودنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس دریافت نے عقیل کے دل کو جوش سے بھر دیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس مقام پر ضرور کوئی قدیم عمارت زمین کی تہوں میں دفن ہے۔ ہوا کے زبردست طوفان نے بگولوں کی شکل میں ریت اُڑا کر دنیا کے سامنے تاریخ کا ایک اور ورق نمایاں کر دیا ہے۔

عقیل کے سامنے نہ صرف تاریخی تحقیقات کا ایک سنہری موقع بلکہ شہرت اور ناموری کے وسیع امکانات بھی اُجاگر ہونے لگے۔ اگر یہاں کوئی قدیم شہر دفن ہے تو اس کی دریافت کا سہرا اُس کے سر بندھ سکتا ہے۔ امیدوں، خوابناک اور تابناک مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا وہ عدیل کے پاس پہنچا۔ اور اسے اپنی دریافت کے بارے میں بتایا۔ عدیل نے اس کے ساتھ جا کر گنبد دیکھا اور عقیل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً مصری محکمہ آثار قدیمہ کو اس جگہ کی کھدائی کی اجازت حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ عام حالات میں محکمہ آثارِ قدیمہ خود اس قسم کے کام سرانجام دیا کرتا ہے۔ لیکن جنگ عظیم ختم ہوئے چند سال ہی گزرے تھے اور پھر داخلی طور پر ایسے مسائل میں اُلجھا ہوا تھا کہ عقیل اور عدیل کی درخواست کیس فائلوں کے انبار میں دب کر رہ گئی اور اس کا کوئی جواب یاد دہانی کے باوجود موصول نہیں ہوا۔ آخر عدیل' جو ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا نے اپنے وسائل سے کھدائی کا فیصلہ کر لیا۔

وہ خود قاہرہ گیا۔ ایک دوست کی معرفت نوید کی خدمات حاصل کیں۔ کھدائی کرانے کے لیے ضروری آلات خریدے اور تیس مزدوروں کی مختصر تعداد کے ساتھ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ جلد ہی ایسے آثار نمایاں ہونے شروع ہوگئے۔ جنہوں نے عقیل اور عدیل کے اندازوں کی تائید کر دی۔ پندرہ سے بیس فٹ کے بعد ہی ایک مختصر سی قدیم بستی کے مکانات بازار، گلیاں کوچے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ وہ گنبد ایک چھوٹے سے مندر کا ثابت ہوا۔ جس کی بلندی بستی کی دوسری عمارتوں سے زیادہ تھی۔ کھدائی کے دوران پتھر کی ایسی سلیں بھی ملیں۔ جن پر قدیم مصری زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ عقیل اور عدیل دونوں ہی کو مردہ زبانوں کے بارے میں کوئی تجربہ حاصل نہ تھا۔ اس لیے طے کیا گیا کہ ان سلوں کو پڑھنے کے لیے قدیم زبانوں کے ماہر کی خدمات بھی حاصل کی جائیں اور اس طرح اس گروپ میں پروفیسر عثمان کا اضافہ ہوا۔

☆......☆......☆

مندر یوں تو پوری طرح نکالا جا چکا تھا مگر اس کے دروازے میں پتھر کی ایک بہت بڑی چٹان سی اس طرح پھنسی ہوئی تھی کہ اندر جانا ناممکن تھا۔ بظاہر یہ چٹان مندر کے سامنے بنے ہوئے بلند سنگی چبوترے کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی جو کسی ناقابلِ فہم طریقے سے ٹوٹ کر دروازے پر گر گئی تھی۔ اور نوید گزشتہ تین دن سے اسے ہٹانے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ اس کوشش میں مندر کے اندر کا حال جاننے کے عام تجسس سے زیادہ ایک خاص اضطراب اور بے چینی بھی شامل تھی۔ جس کی وجہ پتھر کی دو تین سلیں تھیں۔ جو بستی کے مختلف مقامات پر زمین میں گڑی ہوئی پائی گئی تھیں۔

پروفیسر عثمان نے ان پر کھدی ہوئی تحریر کا جو ترجمہ کیا تھا اس کے مطابق یہ نوطی دیوی کا مندر کہلاتا تھا۔ سلوں کی عبارت کسی اشتہار یا اعلان کی صورت' میں تھی۔ جس میں مندر کے پجاری ہر درس کی جانب سے عام لوگوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے چوری کے مقدمات کا فیصلہ نوطی دیوی سے کرائیں۔ پجاری کا دعویٰ تھا کہ جہاں کوئی ثبوت، کوئی گواہی نہ ملے یا ایک یا ایک سے زیادہ افراد کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہو کہ ان میں اصل چور کون ہے تو وہاں نوطی دیوی کا بے لاگ فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے گا۔ اور اصل چور دیوی کے سامنے بیٹھتے ہی پتھر کا بن جائے گا۔

یہ کئی اعتبار سے بڑی عجیب بات تھی۔ اول تو یہ کہ قدیم مصری دیوی دیوتاؤں میں نوطی کے نام کی کوئی دیوی اب تک معلوم نہیں کی جا سکی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ آخر چوری کے جرم کا ہی فیصلہ کیوں کرتی تھی۔ اور تیسرے یہ کہ اس کی سزا مجرم کو اس انوکھے انداز میں کیوں دی جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں مندر کے اندر کسی ایسے قدیم مذہب کا راز بھی پوشیدہ ہو سکتا تھا۔ جس سے آج کی مہذب دنیا بالکل ناواقف تھی اور یہ ایک بڑی اہم دریافت ہوتی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ عقیل اور عدیل مندر کے اندر پہنچنے کے لیے جتنے بے تاب ہوتے کم تھا۔

☆......☆......☆

نوید خیمے میں داخل ہوا تو دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں بھائی! کیا خبر لائے؟ چٹان کو دروازے سے ہٹانے میں کامیاب ہوگئے؟'' عقیل نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

''صدیوں زمین کے اندر دبے رہنے کی وجہ سے چٹان اتنی مضبوط جم گئی تھی......''

''اوہ......تم نے پھر وضاحتیں شروع کر دیں۔'' عقیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ذرا ٹھہرو۔'' عدیل نے جلدی سے ہاتھ اٹھایا اور بولا۔

''نوید صاحب کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چٹان اتنی مضبوطی سے جم گئی تھی...... گویا اب نہیں ہے بہ الفاظ دیگر......''

''دروازہ کھل گیا ہے۔ آپ حضرات تشریف لے چلیں۔'' نوید نے اپنا فقرہ پورا کر دیا۔

''تم نے اندر جا کر دیکھا؟'' عقیل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں...... یہ کام آپ لوگوں کا ہے۔'' نوید نے جواب دیا۔

''اگر پتھر پر لکھی ہوئی عبارت درست ہے تو میں پتھر بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''لیکن یہ خطرہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جو چور ہیں۔'' عقیل بولا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں کم و بیش ہر شخص کسی نہ کسی چھوٹی یا بڑی چوری کا مرتکب ضرور ہوتا ہے۔'' نوید نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ محض نوطی دیوی کے سامنے جانے سے کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ اس کے لیے ضرور کچھ خاص قسم کی رسمیں یا الفاظ ادا کیے جاتے ہوں گے۔'' عقیل نے جواب دیا۔

''یعنی دھڑکا تمہیں بھی لگا ہوا ہے۔'' عدیل مسکرایا۔ ''بہرحال میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔''

''مگر میں رکھتا ہوں۔'' عقیل نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ قدیم مذاہب یا دیوی دیوتاؤں کے بارے میں جو عجیب روایات مشہور ہیں یا پرانی تاریخ کے ذریعے ہمیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے۔''

''اچھا بھئی ہوتی ہوگی۔ سردست اس بحث سے کیا حاصل ہے۔ آؤ چلیں۔'' عدیل نے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

تینوں خیمے سے باہر نکلے۔ مندر تک پہنچے مزدور چٹان ہٹانے کے بعد دروازے پر پڑا ہوا ملبہ صاف کر رہے تھے۔ عقیل نے اندر جھانک کر دیکھا۔ دن کی روشنی ہونے کے باوجود اندر نیم تاریکی تھی۔ مشعلیں جلائی گئیں اور یہ لوگ آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

مندر ایک کافی وسیع و عریض ہال پر مشتمل تھا۔ جس کے تین جانب برآمدے بنے ہوئے تھے۔ دائیں طرف دو تین فٹ اونچے اور تقریباً اتنے ہی لمبے چوڑے چبوترے پر پتھر کا ایک قد آدم مجسمہ رکھا تھا۔ مجسمہ بڑی عجیب وضع کا تھا۔ ہاتھ پاؤں اور گردن کے نیچے تک سارا دھڑ عورت کا تھا۔ مگر اس کے جسم پر کسی حسین چہرے کی جگہ ایک انتہائی بدشکل بلکہ خوفناک صورت نظر آ رہی تھی۔ بڑی بڑی باہر کو اُبلی ہوئی آنکھیں، چھوٹی اور بے حد پھیلی ہوئی ناک، ناک کے ساتھ ہی مونچھوں کی جگہ دو سینگ نما چیزیں ابھری ہوئی، موٹے موٹے ہونٹ جن سے اوپری دانت خوفناک انداز میں منہ سے باہر نکلے ہوئے

تھے۔ جن میں دائیں بائیں دو دانت کسی درندے کی طرح لمبے اور نوکیلے تھے۔ یہ غالباً نوطی دیوی کا مجسمہ تھا دیوی کے مجسمے کے سامنے بالکل پتھریلے فرش پر ہڈیوں کا ایک پنجر چبوترے سے کمر لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی جانب پتھر کی تین سلیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی تھیں اور ایک سل علیحدہ پڑی تھی۔

عقیل نے جھک کر سلوں کو دیکھا۔ ان پر قدیم طرز تحریر میں کچھ لکھا تھا۔ مگر شکلوں کی بناوٹ ناموزوں اور بگڑی بگڑی سی تھی۔ ایک دالان پتھر کے مجسموں سے بھرا پڑا تھا۔ عدیل نے انہیں گنا وہ تعداد میں 23 تھے۔ کمر تک بالکل عریاں اور کمر سے نیچے کوئی کپڑا دھوتی کے انداز میں باندھے تھے۔ ان مجسموں کا انداز تراشے ہوئے مجسموں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اپنے تناسب اور دوسری تفصیلات میں حیرت انگیز طور پر بیٹھے ہوئے انسانوں سے اتنے مشابہ تھے کہ پہلی نظر میں کسی زندہ آدمی کا شبہ ہوتا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چور ہیں جو دیوی کے سامنے پیش کیے گئے تھے اور دیوی نے انہیں پتھر کا بنا دیا۔'' عدیل نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے۔'' عقیل نے کہا۔

دوسرے دالان میں کھانے پینے کے برتن، پتھر کی سلیں، جن میں کچھ سادہ تھیں اور کچھ پر ویسی ہی تحریر معلوم ہوتی تھی۔ جیسی بستی میں ملنے والی سلوں پر پائی گئی تھی۔ تیسرا دالان یوں تو خالی تھا مگر اس میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کے ایک گوشے میں پتھر پر کھودنے کی کچھ اوزار نما چیزیں اور دوسرے گوشے میں ایک بڑا سا سنگی مرتبان رکھا ہوا تھا۔ عقیل نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مشعل کی روشنی مرتبان کے کھلے منہ میں ڈالی اور اس کی آنکھیں منعکس ہوتی ہوئی بے شمار کرنوں سے چکا چوند ہوگئیں۔

''اوہ...... عدیل دیکھنا تو...... مجھے تو یہ ہیرے جواہرات معلوم ہوتے ہیں۔'' اس کے منہ سے نکلا۔ نوید اور عدیل لپک کر مرتبان کے پاس پہنچے۔ جھانک کر دیکھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل کر رہ گئیں۔ نوید نے ایک دم سے مرتبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ پھر جو نکالا تو اس کی مٹھی میں ایک قدیم وضع کا زیور لٹک رہا تھا۔ یہ کوئی گلے میں پہننے کی مالا یا گلوبند کی طرح کا سونے کا زیور تھا۔ جس میں بہت سے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ مرتبان کو اُلٹ دیا گیا اور اس میں سے بے شمار چھوٹے بڑے زیور سب کے سب طرح طرح کے جواہرات سے مزین فرش پر ڈھیر ہوگئے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زیور ہیں جو نوطی دیوی کو چڑھاوے یا نذرانے کی صورت میں پیش کیے جاتے رہے ہوں گے۔'' عقیل نے کہا۔

''لاکھوں پونڈ کی مالیت ہوگی ان کی۔'' نوید ایک زیور اُٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

''ہوگی'' عقیل نے لاپروائی سے کہا۔

''یہ خزانہ ہماری ملکیت نہیں کہ اس کی قیمت جانچنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک قیمت کے مقابلے میں ان کی تاریخی حیثیت زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم محکمہ آثارِ قدیمہ سے دوبارہ رجوع کریں تو یقیناً وہ نہ صرف اب تک کے تمام اخراجات ادا کرے گا۔ بلکہ آئندہ تحقیقات کے سلسلے میں ضروری سہولتیں بھی فراہم ہو جائیں گی۔''

''خیر اخراجات کی مجھے پروا نہیں۔'' عدیل بولا۔

''تم جانتے ہو کہ میں نے یہ مہم صرف اپنے اور تمہارے شوق کے پیش نظر شروع کی تھی۔ بہرحال یہ باتیں بعد میں طے کی جاسکتی ہیں، اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس قیمتی خزانے کو کسی ایسی جگہ محفوظ کر دیں جہاں کسی اور کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے۔ ہمیں اس دریافت کو بھی صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا ہوگا۔ ورنہ شہری آبادی سے پچاس ساٹھ میل دور اس صحرا میں اگر کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی تو ہم کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کرسکیں گے۔''

''میرا مشورہ قابل قبول ہو تو ان زیورات کو کسی کپڑے وغیرہ میں باندھ کر عقیل صاحب کے سپرد

کر دیا جائے جو اسے اپنے آہنی صندوق میں حفاظت سے رکھ دیں۔ یہاں اس سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہوسکتی۔'' نوید نے کہا۔

''میں تائید کرتا ہوں۔'' عدیل نے کہا اور خود ہی گلے میں بندھا ہوا بڑا رومال کھول کر فرش پر بچھاتے ہوئے اس میں زیورات رکھنے لگا۔

☆......☆......☆

اور یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ عدیل اپنے خیمے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ نوید اندر داخل ہوا۔

''سونے کا پروگرام ہے؟'' اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... مگر تم اب تک کیسے جاگ رہے ہو؟'' عدیل نے کہا۔ ''تم تو روزانہ آٹھ بجتے ہی بستر پر پہنچ جاتے تھے۔''

''میں آج بھی سونے ہی کی کوشش کر رہا ہوں مگر اکیلے کام بنتا نظر نہیں آ رہا۔'' نوید نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ''اس لیے تمہارے پاس آ گیا۔''

''کیا مطلب...... یہاں میرے خیمے میں سونا ہے؟''

''بدھو ہی رہے تم سدا۔ میں دوسرے سونے کی بات کر رہا ہوں۔ جس کے ساتھ قسمت چمکانے کے لیے کچھ اور بھی چیزیں ہیں۔''

''اوہ...... تمہارا اشارہ زیورات کی طرف ہے مگر عقیل ایسی کوئی تجویز سننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ ایسا سنہری موقع زندگی میں بار بار ہاتھ نہیں آتا۔ تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔''

''ناممکن ہے۔'' عدیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

''اس صورت میں تم اگر میرا ساتھ دو تو ہم اس کی مرضی کے بغیر بھی اس خزانے پر قبضہ کرسکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' عقیل نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بہت آسان بات ہے۔ ہم اس کے آہنی بکس کا تالا توڑ کر زیورات نکال لیں گے۔''

''لیکن اس طرح تو براہِ راست میری یا تمہاری ذات شبہ کی زد میں آئے گی۔'' عدیل چونک کر بولا۔

''ظاہر ہے ہم تینوں کے علاوہ کوئی اور اس راز سے واقف نہیں ہے۔''

''جو الزام وہ ہم پر لگائے گا ہم اسے خود اسی پر اُلٹ دیں گے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''ظاہر ہے کہ زیورات اس کے قبضہ میں ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود اس کی اپنی نیت خراب ہوگئی تھی۔''

''لیکن بکس کا ٹوٹا ہوا قفل؟''

''کیا کوئی خود اپنے بکس کا تالا نہیں توڑ سکتا؟'' نوید نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''ہم دونوں اس پر الزام لگائیں گے کہ اس نے چوری کا شبہ ہماری جانب منتقل کرنے کے لیے خود ہی تالا توڑ کر زیورات کہیں چھپا دیے ہیں۔ ثبوت نہ اس کے پاس ہوگا اور نہ ہمارے پاس۔ ایسی صورت میں وہ ہمارے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کرسکتا۔''

''بات تو سمجھ میں آتی ہے۔'' عدیل نے کہا۔ ''مگر تالا توڑنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تو؟''

''میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔'' نوید نے جواب دیا۔

''ابھی اسے کوفی میں نیند کی تین گولیوں کا پاؤڈر پلا کر آ رہا ہوں۔''

''بہت خوب۔'' عدیل مسکرا دیا۔

''میرا خیال ہے تم نے جب سے وہ زیورات دیکھے ہیں۔ اس وقت سے ان پر قبضہ کرنے کی اسکیم بنانا شروع کر دی تھی۔''

''ہاں زیورات اس کے پاس رکھنے کا مشورہ بھی اسی اسکیم کا ایک حصہ تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کی نیت خراب ہوتی تو ہم انہیں اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتے۔''

''مجھے تعجب ہے کہ جب تم اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے تو تم نے مجھے شریک کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟''

''کوئی شک نہیں کہ میں تنہا بھی زیورات نکال سکتا تھا۔'' نوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس صورت میں ...... تم اور عقیل متحد ہو جاتے اور اگرچہ یہاں پولیس وغیرہ موجود نہیں ہے لیکن تم اپنے مزدوروں کے بل بوتے پر مجھے پکڑ بھی سکتے تھے اور میری ہی چیزوں کی تلاشی بھی لے سکتے تھے۔ جبکہ ہم دونوں مل کر عقیل کی ہر چال کا جواب دے سکتے ہیں۔''

''بہت ہوشیار ہو لیکن یہ بات جان لو کہ میرا حصہ دو تہائی ہوگا۔''

''وہ کس خوشی میں؟''

''اس لیے کہ اس مہم پر میرا پیسہ خرچ ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے اس خزانے پر میرا حق سب سے زیادہ ہے۔''

''بیکار باتیں مت کرو۔ ہم دونوں اسے برابر برابر تقسیم کرلیں گے۔ میری مدد کے بغیر نہ تم انہیں پا سکتے ہو اور نہ ٹھکانے لگا سکتے ہو؟''

''اچھی بات ہے...... یوں ہی سہی!'' عدیل کچھ سوچنے لگا۔ آخر اس نے جواب دیا۔

''مگر میں ایک بات اور بھی سوچ رہا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''اگر وہ چڑھاوے کے زیورات ہیں تو ان کی چوری نوطی دیوی کو غصہ کی بھی دعوت دے سکتی ہے۔'' عدیل نے کچھ فکرمندی سے کہا۔

''کمال کرتے ہو۔ صبح تو کہہ رہے تھے کہ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔''

''پھر بھی ان کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ ان کا نوطی دیوی سے تعلق نہیں ہے تو بہتر ہوتا۔''

''ان پتھر کی سلوں پر زیورات کے متعلق کوئی بات لکھی ہے؟'' نوید نے پوچھا۔

''نہیں!'' عدیل نے بتایا۔ ''عثمان صاحب کہہ رہے تھے کہ ان میں سے چند سلوں پر وہی اعلان تحریر ہے جو بستی میں ملنے والی سلوں پر درج تھا اور کچھ پر دیوی کی عبارت! اور اس طریقہ کا حال لکھا ہوا تھا جس کے ذریعے مجرموں کو انصاف کے لیے اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ وہ چار سلیں جو پنجرے کے پاس پائی گئی تھیں ان کی عبارت اتنی شکستہ ہے کہ ابھی پڑھی نہیں جاسکیں۔ عثمان صاحب کا خیال ہے کہ وہ پنجرہ مندر کے پجاری کا ہے اور اس نے مرتے وقت گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اس تحریر کے ذریعے دوسروں تک کوئی پیغام پہنچانا چاہا ہے۔''

''وہ زیورات دیوی کے ہوں یا کسی اور کے ہوں۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔'' نوید نے جواب دیا۔ ''میں اپنے مستقبل کی راحت ہزاروں سال پہلے گزری ہوئی کسی دیوی کے خوف سے قربان نہیں کرسکتا۔''

''زیورات رکھو گے کہاں؟''

''ہم اپنے پاس بھی رکھ سکتے تھے۔'' نوید نے کہا۔

''عقیل ہماری یا ہمارے سامان کی تلاشی لینے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر عقیل نے بات بڑھانے کی کوشش کی تو یہ خبر عام مزدوروں کو بھی معلوم ہو جائے گی اور پھر اگر ان میں سے کسی نے قسمت آزمانی چاہی تو ظاہر ہے کہ وہ ہم تینوں کے خیموں کا ہی رُخ کریں گے۔ چنانچہ زیورات چھپانے کے لیے میں نے ایک محفوظ جگہ بھی تلاش کرلی ہے۔''

''کہاں؟''

''خیموں سے باہر پہاڑیوں میں۔'' نوید نے بتایا۔

''میں آج سہ پہر ٹہلتا ہوا اس طرف چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے ایک چٹان میں اتنی بڑی دراڑ دیکھی۔ جس میں کوئی چیز آسانی سے چھپائی جاسکتی ہے۔ دراڑ زمین سے کچھ بلندی پر ہے اور جب تک کوئی خاص طور پر اس کی تلاش میں نہ ہو۔ وہ نظر نہیں آسکتی۔''

''معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔'' عدیل مسکرایا۔

''تو پھر چلو دیر کس بات کی ہے؟''

☆......☆......☆

عقیل کا خیمہ قریب ہی تھا۔ ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ پہاڑی کے دامن میں پانچ خیمے ایک نیم دائرے کی صورت میں لگائے گئے تھے۔ پہلا خیمہ نوید اور اس کے دو ساتھیوں کا تھا۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ دوسرا خیمہ عثمان صاحب کا تھا۔ تیسرے میں کھدائی سے برآمد ہونے والے نوادرات کا ذخیرہ رکھا گیا تھا۔ اس کے برابر میں عقیل کا خیمہ تھا اور سب سے آخر میں عدیل کا۔ سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ چھوڑ کر ایک بہت بڑے شامیانے میں قناتیں لگا کر مزدوروں کی شب بسری کا انتظام کردیا گیا تھا۔ اس کے برابر ہی دو خیمے اور لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک کھانے اور ناشتے کی تیاری کے کام آتا تھا اور دوسرے میں مزدور کھانا کھاتے تھے۔

☆......☆......☆

عدیل اور نوید...... عقیل کے خیمے میں پہنچے تو وہ اپنے فولڈنگ بستر پر بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ پلنگ کے بائیں جانب خیمے کی دیوار سے ملا ہوا ایک بڑا آہنی صندوق رکھا تھا۔ اسے عقیل اس خیال سے ساتھ لے گیا تھا کہ زیادہ قیمتی قسم کے نوادرات اس میں محفوظ کیے جاسکیں۔

نوید نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب سے ایک ہتھوڑا نکالا اور دو تین ضربوں میں ہی صندوق میں پڑا قفل توڑ کر زمین پر ڈال دیا۔ زیورات اسی رومال میں بندھے ہوئے صندوق کے ایک کونے میں رکھے تھے۔ اس نے رومال اٹھالیا۔ ڈھکنا دوبارہ بند کیا اور ٹوٹا ہوا قفل وہیں چھوڑ کر دونوں چپ چاپ باہر نکل گئے۔

اب اُن کا رُخ پہاڑی کی طرف تھا۔ آسمان پر چاند موجود نہیں تھا۔ مگر کھلے صحرا میں تاروں کی چمک بھی راستہ تلاش کرنے کے لیے کافی تھی۔ مزید آسانی کے لیے نوید نے ٹارچ بھی ساتھ لے لی تھی۔ اچانک عدیل چلتے چلتے رُک گیا اور پیچھے کی جانب گھوم کر دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' نوید نے پوچھا۔

''مجھے کوئی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔'' عدیل آہستہ سے بولا۔

''تمہارا وہم ہے۔'' نوید نے آنکھیں پھاڑ کر خیموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں تو دور دور تک......''

''غور سے سنو۔'' عدیل جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اور اس مرتبہ نوید نے بھی وہ آواز سن لی تھی۔ بڑی عجیب سی آواز جیسے کوئی اپنی انگلیاں چٹخ رہا ہو۔ چٹ چٹ چٹ...... مگر یہ صرف ایک لمحے کے لیے تھا۔

''یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خشک لکڑی توڑ رہا ہو۔'' اس نے کہا۔

''یا پھر جیسے ہڈیاں ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہی ہوں۔'' عدیل نے سرگوشی کی۔ نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اب تم کہو گے کہ وہ ڈھانچہ ہمارا تعاقب کررہا ہے۔'' اس نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی واہمی طبیعت کے مالک ہو۔'' عدیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک اسی طرح کھڑے ہوئے سننے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر پھر کوئی آواز سنائی نہ دی۔

آخر وہ پھر ایک مرتبہ آگے بڑھے، نوید نے جو چٹان تلاش کی تھی اس میں شک نہ تھا کہ وہ قیمتی چیز چھپانے کے لیے بہترین جگہ تھی۔ سرسری نظر سے دیکھنے والے کا تو ذکر ہی کیا کوئی خاص طور سے بھی تلاش کرتا۔ تب بھی مشکل ہی سے نگاہ پڑ سکتی تھی۔ دراڑ اتنی بڑی تھی کہ اس میں زیورات کا رومال آسانی سے آگیا۔ عدیل بار بار پلٹ کر دیکھتا جارہا تھا۔ نوید نے رومال اندر رکھنے کے بعد مزید حفاظت کے خیال سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر دراڑ میں پھنسا دیا۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ انہیں زیورات چھپاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ واپس لوٹے۔ عدیل کا دل اب بھی پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ وہ نوید کو بھی گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ مندر میں لے گیا۔ ڈھانچے کو دیوی کے مجسمے کے پاس سے اٹھا کر کوٹھڑی میں رکھ دیا گیا تھا۔

''آنکھیں کھول کر دیکھ لو۔'' نوید نے ٹارچ کی روشنی کوٹھڑی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ڈھانچہ اپنی جگہ موجود ہے۔'' عدیل نے کہا۔

پنجرہ واقعی کوٹھری میں موجود تھا مگر معلوم نہیں کہ عدیل کا وہم تھا یا حقیقت کہ اسے جہاں ہونا چاہیے تھا وہ وہاں نہیں تھا۔ عدیل کا خیال تھا کہ ڈھانچہ مرتبان کے قریب رکھا گیا تھا۔ جبکہ وہ اس وقت پتھر کی سلوں کے قریب پڑا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ہنگامہ ہونا ناگزیر تھا۔ نوید اور عدیل دونوں اس کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ صبح اٹھتے ہی عقیل کی نگاہ ٹوٹے ہوئے قفل پر پڑی۔ اس نے جلدی سے صندوق کھول کر دیکھا۔ باقی سب چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں مگر زیورات کا رومال غائب تھا۔ وہ اسی وقت عدیل کے خیمے میں پہنچا۔ دونوں کی بحث نے نوید کو بھی متوجہ کیا۔ جیسے کہ طے تھا کہ اس نے عدیل کا ساتھ دیا اور پندرہ منٹ کے اندر اندر وہ سب عثمان صاحب کے خیمے میں تھے۔

''ہم تینوں کے علاوہ کوئی زیورات کی موجودگی سے واقف نہیں تھا۔'' عقیل کہہ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ یہ حرکت میری نہیں ہے اس لیے......''

''یہ تو تم کہہ رہے ہو ناں۔'' نوید نے بات کاٹی۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ خود تمہاری نیت ہی اس قیمتی خزانے کو دیکھ کر خراب نہیں ہوگئی تھی۔''

''زیورات میرے ہی پاس رکھے تھے۔'' عقیل نے جواب دیا۔ ''اگر میں انہیں حاصل کرنا چاہتا تو اس کے ہزار طریقے نکال سکتا تھا۔ چوری کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' عثمان صاحب نے تائید کی۔

''اور اگر انہیں میں چرانے کا ارادہ کر چکا تھا تو یہ تجویز کیوں پیش کرتا کہ انہیں تمہارے پاس رکھوا دیا جائے۔'' نوید تیزی سے بولا۔

''غالباً تم بھولے نہیں ہوگے کہ یہ مشورہ میں نے ہی دیا تھا۔''

''تو پھر عدیل نے چرائے ہوں گے۔'' عقیل نے کہا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں چوری کی دولت پر۔'' عدیل بگڑا۔

''یہ سب کچھ میرے پیسے سے کیا جارہا ہے۔ میں چاہتا تو زیورات اپنی نگرانی میں رکھنے کا مطالبہ کرسکتا تھا۔ مگر میں نے نوید کی تجویز کی تائید کی۔ اب مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ انہیں اپنے پاس رکھتا تو تمہیں اس طرح مجھ پر چوری کا الزام لگانے کا موقع نہ ملتا۔''

''مجھے یہ تم دونوں کی ملی بھگت معلوم ہوتی ہے۔'' عقیل نے غصے سے جواب دیا اور پروفیسر صاحب کی طرف دیکھا۔

''سوچنے کی بات ہے عثمان صاحب کہ میرے پاس قفل کی چابی موجود تھی۔ بڑی آسانی سے تالا کھول کر نکال سکتا تھا۔ تالا وہ شخص ہی توڑے گا جو اسے چابی سے کھولنے پر قادر نہ ہو۔''

''یہ تمہاری ایک چال ہے۔'' نوید نے کہا۔ ''تم اپنی خیانت کو چوری کا روپ دینا چاہتے ہو۔ اگر چابی سے تالا کھول کر زیورات نکالتے تو اپنے دوستوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کا موقع کب ملتا۔''

''تو تم نے زیورات نہیں نکالے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''اور نہ تم نے؟'' عقیل نے عدیل کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔''

''تو کیا تم دونوں اپنی اور اپنے سامان کی تلاشی دینے کے لیے تیار ہو؟''

''بڑی خوشی سے۔'' عدیل نے جواب دیا۔

''لیکن میں کسی چور کو تلاشی لینے کا حق نہیں دے سکتا۔''

''تلاشی عثمان صاحب لیں گے۔'' عقیل نے کہا۔

''اور میں خود اپنی چیزوں کو سب سے پہلے دکھاؤں گا۔''

''وہ تم ہو۔ عثمان صاحب یا کوئی اور میں اس

الزام کو اپنی ذاتی توہین محسوس کرتا ہوں۔'' نوید نے تیزی سے کہا۔

''بغیر کسی قانونی اختیار کے تلاشی تو کیا کوئی میرے اسباب کو یا مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔''

''تم قانونی اختیار کی بات کرتے ہو۔'' عقیل بولا۔ ''اچھی بات ہے میں ابھی قصرِ فرافرا جا کر اس معاملے کی پولیس میں رپورٹ کرتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''عثمان صاحب! میری واپسی تک آپ ان دونوں کو یہاں سے ہلنے نہیں دیں گے۔''

''ذرا ٹھہرو صاحبزادے!'' عثمان صاحب نرمی سے بولے۔

''قانون کسی ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ اور ایمانداری کی بات ہے کہ تم ابھی تک مجھے نہ ان کے جرم کے بارے میں مطمئن کرسکے ہو اور نہ ہی اپنی بے گناہی کے بارے میں۔ تم تینوں کی اب تک کی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شیطان نے تم ہی میں سے کسی ایک کو اس ذلیل حرکت پر آمادہ کیا ہے۔ میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا لیکن جو کوئی بھی ہو۔ میں اسے اتنا ضرور کہوں گا کہ ان زیورات کا تعلق اب ایک تاریخی دور سے ہے اور تاریخ افراد کی نہیں قوم کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تم دیکھ رہے ہو کہ اس دولت نے جو ابھی کسی کی دوست نہیں رہی۔ پل بھر میں تمہاری برسوں کی دوستی کو بھی ختم کردیا ہے۔ ایک ہرجائی شے کے لیے اپنے دلوں کو نفرت کی آماجگاہ نہ بناؤ۔ میرا مشورہ ہے کہ اس وقت آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے کو چور بنانے کی بجائے تم لوگ اپنے اپنے خیموں میں واپس جاؤ۔ وقتی تحریص نے جس کسی کو بھی راہِ راست سے بھٹکا دیا ہے۔ وہ اپنے خیمے کی تنہائی میں ایک بار پوری سنجیدگی سے اپنی حرکت اور اس کے انجام پر غور کرے اور پھر شام ہونے سے قبل خاموشی سے کسی کو کچھ بتائے بغیر زیورات اسی مرتبان میں واپس رکھ دے جہاں وہ پائے گئے تھے۔ ہم اس معاملے کو یہیں ختم کردیں گے۔''

مگر اس ترکیب کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سورج غروب ہونے سے قبل عثمان صاحب نے مندر میں جا کر سب کے سامنے مرتبان دیکھا۔ وہ خالی تھا۔

''میں جانتا تھا کہ چور اتنی آسانی سے اس قیمتی خزانے سے دستبردار نہیں ہوگا۔'' عقیل نے عدیل اور نوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر اس مسئلہ پر دن بھر غور کرنے کے بعد میرے ذہن میں ایک اور حل آیا ہے۔ مجھے پروفیسر صاحب کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اگر یہ معاملہ پولیس کے ہاتھوں تک پہنچ گیا تو پھر ہم سب کو بہت پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے لیے اپنے دلوں میں نفرت کی ایسی دیوار کھڑی کرلیں گے جسے عبور نہیں کیا جاسکے گا۔ ہم اس وقت نوطی دیوی کے مندر میں کھڑے ہیں اور پتھر کی سلوں پر لکھی ہوئی عبارت سے ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ قدیم زمانے میں اس دیوی سے انصاف طلب کیا جاتا رہا ہے۔ اور وہ بھی خاص طور پر چوری کے معاملات میں...... ہمارے سامنے بھی آج ایک ایسا ہی مسئلہ درپیش ہے۔ کیوں نہ ہم نوطی دیوی کو انصاف کرنے کا موقع دیں۔''

''کیا مطلب؟'' عدیل چونکا۔

''آج تو وقت گزر چکا ہے۔ کل غروب آفتاب سے پہلے ہم تینوں نوطی دیوی کے سامنے حاضر ہوں گے اور مقررہ رسومات ادا کرتے ہوئے دیوی سے کہیں گے کہ ہم میں سے جس کسی نے بھی زیورات چرائے ہیں وہ اسے پتھر کا بنا دے۔''

''بکواس۔'' نوید منہ ٹیڑھا کرکے بولا۔

''تمہیں ان خرافات پر یقین ہو تو ہو۔ مگر میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔''

''اور فرض کرو کوئی بھی پتھر کا نہ ہوا تب؟'' عدیل نے پوچھا۔

''تب ہمیں مجبوراً پولیس کو اطلاع دینی پڑے گی۔'' عقیل نے جواب دیا۔

''آپ کیا کہتے ہیں عثمان صاحب؟''

''میں صرف اس خیال سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں کہ اس طرح چور کو سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ

اور وقت ٹل جائے گا۔'' عثمان صاحب افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''شاید خدا اس کے دل میں نیکی ڈال دے۔''

''تب پھر یہ بات طے بھی جائے۔''

''میں اسے بھی تمہاری کوئی چال سمجھتا ہوں۔'' نوید نے کہا۔

''لیکن اس خیال سے کہ کہیں تم یہ نہ کہنا شروع کر دو کہ اگر ہم چور نہیں ہیں تو اس آزمائش سے کیوں ڈرتے ہیں۔ میں تمہاری تجویز منظور کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اگر نوطی دیوی میں کوئی طاقت ہے تو وہ چور کو سچ مچ پتھر کا بنا دے۔'' اس کے بعد سب اپنے خیموں کی طرف واپس لوٹ گئے۔

☆......☆......☆

''میں حیران ہوں کہ کل رات وہ آواز سننے کے بعد تم نے یہ تجویز کیسے مان لی؟'' عدیل نے پریشانی سے کہا۔ یہ گفتگو اس وقت نوید کے خیمے میں ہو رہی تھی۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' نوید نے جھلا کر کہا۔

''ہم نے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں بیکار کر دی ہیں۔ میں نے یہ احمقانہ تجویز مان کر بڑی دور اندیشی سے کام لیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''یہ پتھر کی بے جان مورتی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہم میں سے کوئی پتھر کا نہیں بنے گا۔'' نوید نے جواب دیا۔

''اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کیمپ کے ایک مزدور کو کچھ رقم دے کر واپس جانے پر آمادہ کر لیا ہے۔ وہ آج رات کی تاریکی میں غائب ہو جائے گا۔ کل شام جب نوطی دیوی اپنا انصاف کرنے سے قاصر رہے گی تو ہمیں موقع ہو گا کہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ چونکہ ہم میں سے کوئی پتھر کا نہیں بنا۔ اس لیے چور کوئی اور شخص ہے۔ پھر خود ہی کیمپ کے مزدوروں سے پوچھ گچھ کرنے کی تجویز پیش کریں گے اور معلوم ہو گا کہ ایک مزدور غائب ہے تو قدرتی طور پر یہی سوچا جائے گا کہ یا تو کسی طرح سے اسے زیورات کا علم ہو گیا تھا یا اس نے کوئی اور قیمتی چیز چرانے کے خیال سے صندوق کا قفل توڑا ہو۔ لیکن قدرت نے اس کے سامنے بیش بہا خزانہ رکھ دیا اور وہ زیورات لے کر بھاگ نکلا۔ جب تک پولیس میں رپورٹ درج کرائی جائے گی، مزدور نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہو گا اور کوئی اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو گا۔''

''لیکن اگر ہم سچ مچ پتھر کے بن گئے تب؟''

''کیا بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔''

''تم کچھ بھی کہو میں اس امتحان میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' عدیل بات کاٹ کر بولا۔

''حد کر دی تم نے بزدلی کی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اس کام کو اکیلا ہی کر لیتا۔'' نوید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ویسے اگر تم اس دیوی سے اتنا ہی ڈرتے ہو تو ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں اور تم ابھی مل کر مندر کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔''

''اس سے کیا فائدہ ہو گا؟''

''تمہارے اندر بات کاٹنے کی بری عادت ہے۔ پہلے اچھی طرح سن تو لیا کرو۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہم ابھی اس پتھر کے بت کے ٹکڑے کیے دیتے ہیں اور پھر عثمان صاحب کے خیمے میں جا کر ان سے گپ شپ لگانے لگیں گے۔ گھنٹے بھر بعد وہی مزدور جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ بھاگتا ہوا ہمارے پاس آئے گا کہ اس نے ابھی ایک آدمی کو مندر سے بھاگ کر نکلتے دیکھا اور اندر جھانکا تو دیوی کا مجسمہ ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک گھنٹے سے عثمان صاحب کے پاس موجود ہوں گے۔ تب توڑنے کا شبہ فوراً عقیل کی طرف جائے گا۔ ہم کہیں گے جس طرح اس نے خود اپنے صندوق کا تالا توڑ کر ہمیں چور بنانا چاہا۔ اسی طرح دیوی کا مجسمہ توڑ کر ہمارے خلاف مزید شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں خود اس

نے آزمائش کے خوف سے یہ حرکت کی ہے۔''

''ترکیبیں سوچنے میں تمہارا جواب نہیں۔'' عدیل خوش ہو گیا۔

''مگر کیا اس مزدور پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟''

''وہ میرا اپنا آدمی ہے۔'' نوید نے بتایا۔

''یہ بات نہ ہوتی تو میں اس قدر یقین سے کیسے کہہ دیتا کہ پولیس بھی اس کا پتا نہیں چلا سکے گی؟''

''بس تو پھر یہی ترکیب ٹھیک ہے۔'' عدیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

پھر دونوں مندر پہنچے۔ نوید اپنے ساتھ ضروری اوزار بھی لیتا گیا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی مندر کے آس پاس یا مندر کے اندر موجود نہیں ہے۔ نوید نے اپنا وزنی ہتھوڑا اٹھایا اور پوری قوت سے مجسمے کے سر پر دے مارا۔ مندر کیمپ سے اتنے فاصلے پر واقع تھا کہ دونوں میں سے کسی کو اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ توڑ پھوڑ کی آوازیں وہاں تک پہنچ سکتی ہیں۔ ہتھوڑا پڑتے ہی دیوی کا سر اس طرح نیچے گر گیا جیسے مجسمہ پتھر کا نہیں مٹی کا بنا ہوا ہو۔ دو تین ہاتھوں میں ہی نوید نے مجسمہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور فاتحانہ انداز میں پلٹ کر عدیل کی طرف دیکھا۔

''اب تو یقین ہو گیا تمہیں کہ تمہارا وہم کتنا بے حقیقت ہے۔'' وہ بولا۔ ''اگر نوطی دیوی میں کچھ بھی طاقت ہوتی تو وہ ہمیں اس آسانی سے اپنی بربادی کی اجازت نہ دیتی۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' عدیل نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب تم عثمان صاحب کے پاس چلو۔ میں اس مزدور کو سبق پڑھا کر ابھی آتا ہوں۔'' نوید قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

عدیل مجسمے کے ایک ٹکڑے کو اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ ٹکڑا اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ اسے دوبارہ اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر درپیش تھا۔ مجسمے کے تمام ٹکڑے جیسے کسی اَن دیکھی کشش سے ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹا ہوا پاؤں پنڈلی سے جا کر جڑ گیا اور پنڈلی ران سے جڑ گئی۔

''نوید۔'' اس نے گھبرا کر نوید کا بازو پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے؟'' نوید مشعل اٹھائے ہوئے اس کی طرف گھوما۔

''یہ... یہ... یہ۔'' عدیل کے منہ سے کوئی اور بات نہ نکل سکی۔

نوید نے اس کے اشارے کی سیدھ میں فرش کی طرف دیکھا اور اس کی اپنی سانسیں رُکی رہ گئیں۔ ٹوٹا ہوا مجسمہ نصف سے زیادہ اپنے آپ کو مکمل کر چکا تھا اور پھر ان کی حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی آنکھوں نے یہ ناقابلِ یقین منظر بھی دیکھا کہ چند لمحوں کے اندر ہی ٹوٹے ہوئے تمام چھوٹے بڑے ٹکڑے ایک بار پھر نوطی دیوی کے سالم مجسمے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔

عدیل کی حالت بہت بری تھی۔ وہ سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ نوید نے حیرت کے باوجود ہمت سے کام لیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے مجسمے کے سامنے سے ہٹا کر کوٹھڑی کی طرف لے گیا اور وہاں پڑی ہوئی سلوں پر بٹھا دیا۔ کافی دیر تک دونوں میں سے کسی ایک نے کوئی بات نہ کی۔ عدیل اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ نوید کا چالاک ذہن اس صورتِ حال کے تدارک کے لیے کوئی اور ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' آخر عدیل کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ذرا سوچو اگر ہم کل انجانے میں دیوی کے سامنے اپنے انصاف کے لیے بیٹھتے تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔''

''میں اب بھی اس دیوی کی کوئی کرامت خیال کرنے سے قاصر ہوں۔'' نوید نے جواب دیا۔ ''البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ قدیم زمانے کے کسی پجاری نے اس مجسمے پر کوئی ایسا جادو کر رکھا ہو کہ وہ ٹوٹنے کے بعد خود ہی جڑ جائے یا کسی خاص وقت میں اس کے سامنے بیٹھنے والا فرد پتھر کا بن جائے اور ممکن ہے ہزاروں

سال گزرنے کے بعد بھی اس کے جادو کا اثر کام کر رہا ہو۔"

"پھر اب ہم کیا کریں گے؟" عدیل نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میری بات مانو تو وہ زیورات واپس کر دو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" نوید نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم ذرا خاموش رہو اور مجھے سوچنے دو کہ ہم اپنے آپ کو اس جادو سے کس طرح بچا سکتے ہیں۔"

عدیل چپ ہو گیا۔ نوید سوچتا رہا۔ ایک دم سے اس نے سر اٹھا کر عدیل کی طرف دیکھا۔

"ایک بہترین ترکیب ممکن ہو سکتی تھی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ایسی ترکیب کہ نہ صرف وہ زیورات ہمیشہ کے لیے کسی مزید پریشانی کے بغیر ہمارے قبضے میں رہتے بلکہ عقیل سے بھی پیچھا چھوٹ جاتا مگر افسوس کہ نہ حسن کو اتنی جلدی بلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ اتنی عجلت میں ہمارے کام آ سکتا ہے۔"

"حسن کون؟" عدیل نے پوچھا۔

"میرا ایک دوست ہے۔ بہترین سنگ تراش۔" نوید نے بتایا۔

"جو انسان کو سامنے بٹھا کر ایسا حیرت انگیز مجسمہ بناتا ہے کہ اصل اور نقل میں تمیز ہی نہیں ہو سکتی۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" عدیل اُلجھ کر بولا۔

"وہ اگر مجسمہ بناتا ہے تو ہماری موجودہ پریشانی سے اس بات کا کیا تعلق؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ یہاں ہوتا اور ہمارے پاس چند دن کی مہلت ہوتی تو میں حسن سے ایک مجسمہ تمہاری اس دیوی کا بنواتا اور دوسرا عقیل کا۔"

"پھر کیا ہوتا؟"

"پھر ہم اس دیوی کی جگہ وہ مجسمہ رکھ دیتے۔ آزمائش ہوتی اور ہم تینوں دیوی کے سامنے بیٹھتے۔ مگر بعد میں جب مندر سے باہر نکلتے تو عقیل پتھر کے بت میں تبدیل ہو چکا ہوتا۔"

"مگر کیسے؟ مجسمہ تو نقلی ہوتا۔ اس میں یہ طاقت......؟"

"بالکل بدھو ہو۔" نوید نے بات کاٹی۔

"ہم عقیل کی جگہ اس کا بت رکھ دیتے۔"

"اور عقیل......"

"عقیل......" نوید نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ عقیل مزید ہمارے لیے دردِ سر بننے کی زحمت سے بچ جاتا۔"

"ایسی ناممکن العمل باتیں تم ہی سوچ سکتے ہو۔" عدیل کھڑا ہو گیا۔

"میں اب مزید ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا۔ یہاں میرا دم جیسے گھٹا جا رہا ہے۔"

"تمہاری گھبراہٹ مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ بہرحال تم ٹھہرنا نہیں چاہتے تو مجھے اصرار نہیں ہے۔ آؤ چلیں۔ مگر صبح سے پہلے ہمیں کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کرنا ہے۔" عدیل کوٹھڑی کے سامنے سے گزرا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر اندر کی جانب چلی گئی۔ نوید مشعل لیے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اچانک عدیل کے قدم رُک گئے۔

"اب کیا ہوا؟" نوید نے ناگواری سے پوچھا۔

"کوٹھڑی میں دیکھو۔" عدیل نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ نوید نے مشعل والا ہاتھ کچھ اونچا کرتے ہوئے کوٹھڑی میں جھانکا اور مشعل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ پجاری کا ڈھانچہ جسے کل انہوں نے سلوں کے پاس رکھا تھا اب وہ کوٹھڑی میں موجود نہ تھا۔ چند لمحوں تک دونوں حیران اور سراسیمہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کوٹھڑی میں دیکھتے رہے۔

"خدا کے لیے نوید......!" آخر عدیل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"جلدی سے باہر نکلو ورنہ میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔"

"تم تو ذرا سی بات پر گھبرا جاتے ہو۔" نوید بولا۔

"یہ ذرا سی بات ہے؟ کل رات وہ پُراسرار آوازیں اور آج ڈھانچے کا غائب ہونا......میں تو کہتا ہوں کہ پجاری یا اس کی روح ضرور ہماری چوری سے

واقف ہے اور......"

"میں نہیں مانتا۔" نوید نے ایسے لہجے میں کہا جیسے عدیل سے زیادہ خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہو۔

"وہ ہڈیوں کا پنجر جو ہزاروں سال پہلے کبھی انسان رہا ہوگا۔ اب ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ جہاں تک اس کے غائب ہونے کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ اسے پروفیسر عثمان مزید تحقیق کے لیے اپنے خیمے میں لے گئے ہوں گے۔"

"تم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تو جب تک جی چاہے ٹھہرو۔ میں جا رہا ہوں۔" عدیل نے کہا اور مندر کے دروازے کی طرف چل دیا۔ نوید بھی اس کے پیچھے مندر سے باہر آ گیا۔ راستے بھر دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ نوید کا خیمہ قریب آ گیا۔ لیکن عدیل کا رُخ پروفیسر عثمان کے خیمے کی طرف تھا۔

"وہاں کہاں جا رہے ہو؟" نوید نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈھانچے کے بارے میں تمہارا اندازہ درست ہے یا نہیں؟" عدیل نے جواب دیا۔

"پاگل ہو رہے ہو۔ اگر پروفیسر جاگتا ہوا اور اس نے پوچھ لیا کہ ہمیں مندر سے ڈھانچے کی عدم موجودگی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تو کیا جواب دو گے؟"

"تو پھر زیورات واپس کر دو۔"

"میں اتنی آسانی سے اس خزانے سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا۔" نوید نے کہا۔

"آؤ میرے خیمے میں چلو۔ ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے غور کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی ترکیب سمجھ میں آ جائے گی۔" وہ عدیل کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے خیمے میں داخل ہوا مگر یہاں انہیں ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی شخص نوید کے بستر پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ رُخ کچھ ایسا تھا کہ جلتے ہوئے شمع دان کی روشنی چہرے کے خدوخال اُجاگر کرنے سے قاصر تھی۔

"کون ہے؟" نوید نے دبے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ جواب میں لیٹنے والے نے چونکتے ہوئے سر اٹھا کر نوید کی طرف دیکھا۔

"ارے حسن تم؟" بے اختیار نوید کے منہ سے نکلا۔ حسن مسکراتا ہوا بستر سے اٹھا اور دونوں دوست بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے۔

"مگر یہ اچانک بغیر اطلاع کے؟" نوید نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں......اب تمہارے لیے ریگستانوں میں ڈاک اور تار کے محکمے قائم کیے جائیں گے کیا؟" حسن نے جواب دیا۔

"مگر پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ تم یہاں آثار قدیمہ کی کھدائی کر رہے ہو تو سوچا کہ شاید مجھے بھی اپنے آئندہ مجسموں کے لیے کوئی آئیڈیا یا کوئی ماڈل مل جائے، چنانچہ چلا آیا۔"

"اور بہت مناسب وقت پر آئے۔" نوید نے جوش کے ساتھ کہا۔

"سچ مانو میں کچھ دیر ہی پہلے تمہیں یاد کر رہا تھا۔" وہ عدیل کی طرف گھوما جو ابھی تک حیرت سے حسن کو دیکھ رہا تھا۔

"عدیل! ان سے ملو۔ یہ ہیں موجودہ صدی کے بہترین مجسمہ ساز حسن!" اس نے تعارف کرایا۔

"اور ان کی فنکاری کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ اگر وہ 23 مجسمے کھدائی میں برآمد نہ ہوتے تو میں یہی کہتا کہ انہیں حسن نے تراشا ہے۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" عدیل نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا مگر حسن نوید کی طرف متوجہ تھا۔

"یہاں 23 مجسمے برآمد ہو چکے ہیں۔" وہ بولا۔

"بہت خوب......گویا میری اتنی زحمت اُٹھا کر یہاں آنا بیکار نہیں گیا۔"

"تیئس نہیں چوبیس۔" نوید نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"اور وہ چوبیسواں مجسمہ ایک دیوی کا ہے۔ جس کا جسم کسی بے حد حسین عورت کا اور سر کسی خوفناک بلا کا

معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم ایک مجسمہ کتنی دیر میں بنالیتے ہو؟''

''کتنا بڑا مجسمہ؟'' حسن نے پوچھا۔

''آدمی کے قد کے برابر۔''

''اپنے طور پر بناؤں تو ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے اور خصوصی صلاحیت سے کام لوں تو ایک گھنٹے میں مکمل کرلوں گا۔''

''خصوصی صلاحیت۔'' نوید نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ایک راز کی بات ہے۔'' حسن مسکرایا۔ ''تم میرے بہت عزیز دوست نہ ہوتے تو کبھی نہ بتاتا۔ بہرحال مختصر طور پر یوں سمجھ لو کہ مجھے ایک بزرگ کی دعا حاصل ہے اگر میں چاہوں تو بے ہنگم، بے ڈول پتھر کو ایک گھنٹے کے اندر کسی بھی طرح کے مجسمے میں ڈھال سکتا ہوں۔ میرے مجسموں میں حقیقت کی جھلک ان بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟'' نوید اُچھل پڑا۔

''بالکل...... مگر میں عام طور پر ایسا نہیں کرتا۔''

''یہاں بھی بہت خاص صورتِ حال درپیش ہے۔'' نوید نے کہا۔ ''میں تم سے دو مجسمے بنوانا چاہتا ہوں۔ اور اگر تم انہیں دو گھنٹے میں تیار کردو تو منہ مانگا معاوضہ دے سکتا ہوں۔''

''کس کے مجسمے بنوانا چاہتے ہو؟'' حسن نے پوچھا۔

''اپنے؟ یا ایک اپنا اور ایک اپنے اِن دوست کا۔''

اس نے عدیل کی طرف دیکھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اِن کا؟''

''یہ عدیل ہیں۔'' نوید نے جواب دیا۔ ''مگر ہمیں اپنے مجسمے نہیں بنوانے۔''

''تو پھر؟''

''ایک اس دیوی کا جس کا ابھی ذکر کیا اور دوسرا ایک شخص کا جس کا نام عقیل ہے۔''

''عقیل؟ یہ کون صاحب ہیں؟''

''ہیں ایک حضرت...... تم تو دو گھنٹوں میں اِن کے مجسمے تیار کرلوگے؟''

''بشرطیکہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔''

''دیوی کا مجسمہ تو میں ابھی تمہیں مندر میں لے جاکر دکھائے دیتا ہوں۔'' نوید نے کہا اور پھر عدیل سے مخاطب ہوا۔

''ذرا چپکے سے جاکر دیکھو کہ عقیل کیا کررہا ہے۔'' عدیل نے اثبات میں سرہلایا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔

''چپکے سے جاکر دیکھنے میں کیا مصلحت ہے؟'' حسن نے پوچھا۔

''کیا تم ان کی لاعلمی میں ان کا مجسمہ بنوانا چاہتے ہو؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''مگر کیوں؟''

نوید نے ایک لمحہ غور کیا۔ وہ حسن کو خزانے کے راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا مگر صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ اگر سردست وہ اس کی کوشش بھی کرتا تو آگے چل کر جب عقیل کے پتھر بن جانے کی داستان عام ہوتی تو حسن کا مشکوک ہوجانا یقینی تھا۔ یہ بات بھی طے تھی کہ حسن کو زیورات کے بارے میں بتانے کا مطلب ایک تیسرا حصے دار پیدا کرنا تھا۔ مگر ہر پہلو کا جائزہ لینے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ کچھ نہ ملنے کا خطرہ مول لینے سے تیسرے حصے پر قناعت کرنا زیادہ بہتر ہے اور اس نے مختصر الفاظ میں حسن کو اب تک کے تمام واقعات بتاتے ہوئے اپنی آئندہ تجویز سے بھی آگاہ کردیا۔ اسے اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ حسن نے کسی اعتراض کے بغیر اس کی مکمل تائید کرتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا کیونکہ اس کے خیال میں کوئی عقل مند انسان اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کرہی نہیں سکتا۔

عدیل نے واپس آکر بتایا کہ عقیل اپنے خیمے میں سو رہا ہے۔ نوید نے عدیل کو وہیں چھوڑا اور حسن کو ساتھ لے جاکر پہلے عقیل کی صورت دکھائی اور پھر مندر میں دیوی کے درشن بھی کرادیے۔ مجسموں کے لیے پتھر کی ضرورت کا مسئلہ اس بھاری چٹان نے حل کردیا جو مندر کے دروازے سے ہٹائی گئی تھی۔ حسن کا اندازہ تھا کہ وہ اس چٹان سے دونوں مجسمے بنالے گا۔

''اب تم جاؤ۔'' حسن اپنے اوزاروں کا بیگ کھولتے ہوئے بولا۔

''دو گھنٹے بعد آنا، تمہیں دونوں مجسمے تیار ملیں گے۔''

''مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم دو گھنٹوں میں اس چٹان کو توڑ کر مجسمے اس طرح بنا سکو گے۔'' نوید نے کہا۔

''مگر میرا ذہن کوئی اور حل سوچنے سے قاصر ہے۔ اب تمام دارومدار تمہاری صلاحیت پر ہے۔ اگر تم یہ کام نہ کرسکے تو ہمیں مجبوراً زیورات واپس کرنے پڑیں گے۔''

''پریشان مت ہو۔ ان بزرگ کی دعا سے پتھر میرے ہاتھوں میں آکر موم ہوجاتا ہے۔'' حسن نے کہا۔

''تمہاری تجویز کا انجام کیا ہوگا۔ اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن جہاں تک مجسموں کا تعلق ہے۔ وہ تمہیں مقررہ وقت پر مل جائیں گے۔''

نوید واپس چلا گیا۔ دو گھنٹے کا وقت اس نے اپنے خیمے میں عدیل کے ساتھ کس اضطراب اور بے چینی کے ساتھ گزارا اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے ذہن میں حسن کی کاریگری اور معجزانہ صلاحیت کے بارے میں کوئی شبہ تھا تو وہ دو گھنٹے بعد لوٹنے پر دیوی اور عقیل کے مجسمے دیکھنے کے بعد دُور ہوگیا۔ دونوں مجسمے اتنی فنکاری کے ساتھ بنائے گئے تھے کہ ایک مرتبہ تو اسے یہی خیال ہوا کہ حسن نے مندر سے دیوی کا مجسمہ نکال کر باہر رکھ دیا ہے اسی طرح عقیل کا بُت دیکھ کر یوں جھجک کر پیچھے ہٹا جیسے اس نے سچ مچ عقیل کو سامنے بیٹھا ہوا دیکھ لیا ہو۔

''یار تم نے تو واقعی کمال کردیا۔'' نوید نے حسن کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کسی نے وہ زیورات اسی لیے مندر میں رکھے تھے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں۔'' زیورات کے تذکرے پر عدیل نے چونک کر نوید کی طرف دیکھا۔ اسے ابھی تک نوید نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ حسن کو بھی اس راز میں شریک کرچکا ہے۔

''گھبراؤ نہیں۔'' نوید اس کی پریشانی کو دیکھ کر بولا۔

''حسن میرا انتہائی قابلِ اعتماد دوست ہے اور اُس نے اس وقت جو کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو تیسرے حصے کا حق دار ثابت کرچکا ہے۔''

وہ حسن کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے کسی نے نہیں دیکھا۔''

''بہت خوب۔ پھر تم اسی خاموشی سے چپ چاپ رخصت ہوجاؤ۔'' نوید نے کہا۔ ''تم قاہرہ میں ہمارا انتظار کرنا امید ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنے میں ایک ہفتہ یا ایک عشرے سے زیادہ دن نہیں لگیں گے۔''

عجیب بات تھی کہ حسن نے اس مرتبہ بھی کوئی کلمۂ اعتراض منہ سے نہ نکالا۔ اس نے اثبات میں سرہلایا اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے نوید اور عدیل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی کی چمک تھی۔ کسی ایسے شریر بچے کی طرح جو اپنی شرارت پر دل ہی دل میں ہنس رہا ہو۔ دوسرے لمحے وہ تیزی سے گھوما اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے تاریکی میں غائب ہوگیا۔ لیکن نوید نے اپنی مسرت میں نہ اس کے عجیب سکوت پر غور کیا اور نہ ہی اس کی اِس شوخ چمک پر۔ اسے تو یہ خیال بھی نہ آیا کہ جب حسن کو کسی نے آتے نہیں دیکھا تھا یا وہ کسی سے نہیں ملا تھا تو اسے نوید کے خیمے کا علم کس طرح ہوا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' نوید نے کہا۔

''ذرا سہارا دو، ہمیں ان مجسموں کو اٹھا کر مندر میں لے جانا ہے۔''

''تم نے اس کی آنکھوں پر غور کیا؟'' عدیل نے

پوچھا۔

"کس کی آنکھوں پر دیوی کی یا عقیل کی؟"

"میں حسن کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں اس کی آنکھوں کو کیا ہوا؟"

"مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہماری کسی حماقت پر ہنس رہا ہو یا پھر اس نے ہمارے ساتھ کوئی شرارت کی ہو۔ اور اس کی کامیابی پر اپنی خوشی دبانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔" عقیل نے کہا۔

"تمہارے وہم کا کوئی جواب نہیں۔" نوید ہنسا۔

"وہ لاکھوں پونڈ کے خزانے میں تیسرا حصہ پانے پر خوش ہو رہا ہے اور تم نہ جانے اس سے کیا کیا مطلب نکال رہے ہو۔ بہرحال جلدی کرو۔ دو بج رہے ہیں۔ مجسمے اندر پہنچا کر ہمیں کچھ دیر سونا ہے۔"

"مگر مندر میں مجسمے پہنچانے کی جگہ کہاں ہے؟" عدیل نے پوچھا۔

"دیوی کا مجسمہ تو اصل مجسمہ کی جگہ چبوترے پر رکھ دیں گے اور....."

"اور اصلی مجسمہ کہاں جائے گا؟"

"پہاڑیوں کی دوسری جانب گہرے کھڈ میں۔" نوید نے جواب دیا۔

"رہے ہمارے دوست عقیل..... تو وہ کل شام تک ان 23 مجسموں کے درمیان آرام کریں گے جو مندر کے دالان میں رکھے ہیں۔"

"جگہ تو خوب سوچی ہے۔" عدیل نے تعریف کی۔

"واقعی جہاں پہلے ہی اتنے مجسمے رکھے ہیں۔ وہاں ایک اور کی گنجائش بڑی آسانی سے نکل سکتی ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ مگر دیوی کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ اگر اس کے ٹکڑے جڑ سکتے ہیں تو وہ کھڈ سے دوبارہ واپس بھی آ سکتی ہے۔"

"مجھے اس کی امید نہیں۔" نوید کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"بہرحال دیکھیں گے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو کسی دوسری ترکیب پر غور کروں گا۔"

مجسمے پتھر کے ہونے کے باوجود زیادہ بھاری نہیں تھے۔ وہ پہلے دیوی کا بت اٹھا کر اندر لے گئے۔ اسے چبوترے کے سامنے فرش پر رکھ دیا اور عقیل کا بت لانے کے لیے واپس لوٹے مگر جیسے ہی انہوں نے پیٹھ موڑی ایک اور عجیب بات ہوئی۔ حسن جوان کی آنکھوں کے سامنے صحرا میں غائب ہو چکا تھا۔ دالان کے ایک پلر کی آڑ سے نکلا۔ چبوترے کے قریب آیا۔ مندر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ نوید اور عدیل باہر جا چکے تھے۔ اس نے بڑے اطمینان سے نوطی دیوی کا مجسمہ چبوترے سے اٹھا کر فرش پر رکھ دیا اور اپنا بنایا ہوا نقلی مجسمہ اُٹھا کر دیوی کے بت کی جگہ چبوترے پر ایستادہ کر دیا۔ دوبارہ دروازے پر نظر ڈالی اور سبک قدموں سے کوٹھڑی کی جانب چل دیا۔ جب تک نوید اور عدیل..... عقیل کا بت اُٹھا کر اندر آئے وہ کوٹھڑی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

عقیل کا مجسمہ دالان میں رکھے ہوئے 23 مجسموں میں شامل کر کے انہوں نے چبوترے سے نوطی دیوی کا بت اُٹھا کر اس کی جگہ دوسرا مجسمہ رکھ دیا اور دیوی کا بت مندر سے باہر لے آئے۔ نوید کیمپ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ کھول کر لایا۔ مجسمہ اس پر لادا اور پہاڑی کی طرف لے چلا۔

"میرا ایک مشورہ مانو گے؟" عدیل نے کہا۔

"کیا؟"

"میرا خیال ہے کہ پہاڑی کی دوسری طرف کھڈ اتنا گہرا نہیں کہ اگر دن میں کوئی اُدھر سے گزرے تو اُسے مجسمہ نظر نہ آئے۔" عدیل نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ تم اسے میرا وہم کہہ لو۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے دیوی کو اس طرح کھڈ میں پھینکا تو وہ ضرور واپس آ جائے گی۔ اس لیے اگر کھڈ میں گرانے کے بجائے ہم اسے کسی غار میں رکھ کر پتھروں سے غار کا منہ بند کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"اگرچہ اس مزید محنت سے فائدہ نہیں لیکن تمہارے اطمینان کے لیے ہم یہ بھی کر لیں گے۔" نوید نے کہا اور پھر ایسا ہی کیا گیا۔ پہاڑی کے عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا غار تلاش کر کے دیوی کا مجسمہ اس کے اندر رکھ دیا گیا۔ آس پاس سے بڑے پتھر

چُن کر غار کا منہ بھی بند کر دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دونوں واپس لوٹے۔ اونٹ کو باندھ کر وہ اپنے خیموں کی طرف جا رہے تھے کہ نوید کو اس مشعل کا خیال آیا جو وہ جلتی حالت میں مندر میں چھوڑ آیا تھا۔

"غنیمت ہے کہ تمہیں یاد آ گیا۔" عدیل بولا۔

"ورنہ صبح کو عقیل کی نظر پڑ جاتی تو وہ ضرور چونکنا ہو جاتا۔"

"محض مشعل کی موجودگی سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔" نوید نے جواب دیا۔

"لیکن میں کل شام کو ہونے والے ڈرامے کو ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لیے مشعل لے آنا ہی مناسب ہوگا۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ ہم وہاں اپنی آمد کا کوئی سراغ چھوڑ آئے ہوں۔ چنانچہ دوبارہ جا کر دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

وہ مندر میں داخل ہوئے۔ مشعل اسی پتھر پر بدستور جل رہی تھی۔ جہاں نوید نے اسے رکھا تھا عدیل نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو نوید دیوی کے مجسمے کو پکڑے کھڑا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے جلدی میں مجسمہ غلط رُخ پر رکھ دیا ہے۔" نوید نے جواب دیا۔

"اس کو ٹھیک کر رہا تھا۔"

"غلط رُخ سے کیا مطلب؟"

"بھئی دیوی کا رُخ دروازے کی طرف تھا تا....."

"ہاں۔"

"لیکن ابھی میں نے دیکھا ہے کہ ہم نے اس کا رُخ کوٹھڑی کی طرف کر دیا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" عدیل چونکا۔

"مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے اسے رکھا تھا تو اس کا منہ دروازے کی جانب ہی تھا۔"

"تو کیا مجسمہ خود ہی کوٹھڑی کی سمت گھوم گیا تھا۔" نوید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"خدا بہتر جانتا ہے۔" عدیل نے جواب دیا۔

"مگر ہمیں کوٹھڑی میں بھی دیکھ لینا چاہیے۔" وہ نوید کے جواب کا انتظار کیے بغیر کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ایک دم اسے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے مشعل والا ہاتھ اٹھا کر اس کی تھرتھراتی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ کوٹھڑی دوبارہ پجارن کے ڈھانچے سے آباد ہو چکی تھی۔

عدیل کا دل مطمئن نہیں تھا۔ مگر بظاہر اس نے نوید کی تردید نہیں کی کہ ڈھانچہ شروع سے آخر تک کوٹھڑی میں ہی موجود رہا ہوگا۔ پہلی مرتبہ وہ دونوں نوطی دیوی کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کے دوبارہ درست ہو جانے کے عجیب واقعہ پر ذہنی طور پر اتنے متاثر تھے کہ اسے سامنے ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ جسے دوسرے الفاظ میں نفسیاتی فریب نظر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس مختصر سی گفتگو کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے خیموں میں واپس چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن کام تقریباً بند رہا۔ عقیل، عدیل اور نوید..... تینوں ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ نوید اور عدیل تو اس لیے کہ انہوں نے گزشتہ رات ہی طے کر لیا تھا کہ وہ مصلحتاً ایک دوسرے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور عدیل اس لیے کہ اس کی دانست میں زیورات عدیل نے چرائے تھے اور اسے ایک دوست کی حیثیت سے عدیل کی اس حرکت پر اتنا افسوس تھا کہ وہ آئندہ کے لیے اس سے تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ دیوی کے فیصلے کی داستان سچی ہو نہ ہو، وہ کل صبح ہی کیمپ چھوڑ دے گا اور مصری پولیس اور محکمہ آثار قدیمہ سے اس واقعے کی رپورٹ کرنے کے بعد اپنے وطن واپس چلا جائے گا۔

پروفیسر عثمان البتہ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ پتھر کی ان سلوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو دیوی کے مجسمے کے قریب پائی گئی تھیں اور جن کی تحریر بدخطی کی وجہ سے کہیں کہیں ناقابل فہم ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

نوطی دیوی کے پجاری نے انصاف حاصل کرنے کا جو طریقہ سلوں پر تحریر کیا تھا اس کے مطابق غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے مندر میں پچیس شمعیں روشن کی جاتی تھیں۔ عود، عنبر، لوبان یا جو بھی خوشبو میسر ہو اس سے سلگایا جاتا۔ پھر تمام مشتبہ افراد غسل کر کے کمر سے اوپر تک برہنہ ہو کر ننگے پاؤں مندر میں داخل ہوتے۔ ان میں سے ایک کچھ مخصوص الفاظ ادا کرتا اور پھر وہ سب دوزانو ہو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے دیوی کے سامنے بیٹھ جاتے۔ پجاری کا دعویٰ تھا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص چور ہوگا تو غروب آفتاب سے قبل ہی ضرور بالضرور پتھر کا بن جائے گا اور یہی اس کی سزا ہوگی...... اس کارروائی کے دوران مشتبہ افراد کے سوا کسی کو مندر میں موجود رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ عام لوگ یا مشتبہ افراد کے عزیز و اقارب، دوست، احباب غروب آفتاب کے بعد اندر جا کر دیوی کے فیصلے سے مطلع ہو سکتے تھے۔

☆......☆......☆

پروفیسر عثمان نے رسومات شروع ہونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سب کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے کار...... آخر کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ مندر میں پچیس شمعیں جلائی گئیں۔ لوبان اور اور عطریات سلگائے گئے۔ عقیل، عدیل اور نوید نے غسل کیا اور صرف پتلونیں پہنے ہوئے مندر میں داخل ہوئے۔ اس تقریب کا علم چار افراد کے سوا کسی کو نہ تھا۔ چنانچہ مندر کے دروازے پر پروفیسر عثمان کے سوا کوئی ان کا انتظار کرنے والا نہیں تھا۔ اور وہ بھی یہ سوچ کر کہ غروب آفتاب سے پہلے وہ مندر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اپنے خیمے میں جا کر سلوں کی تحریر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ جواب کافی حد تک ان کی سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

عقیل، عدیل اور نوید ایک دوسرے سے بات کیے بغیر مندر میں داخل ہو کر نوطی دیوی کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ عثمان صاحب نے اس موقع پر کہے جانے والے مخصوص الفاظ کا ترجمہ بھی کر دیا تھا۔ جو ایک کاغذ پر نوٹ کیا ہوا عقیل کے پاس تھا۔ وہ سب سے آگے کھڑا تھا گھوم کر اس نے عدیل اور نوید پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے پتلون کی جیب سے وہ کاغذ نکالا۔ نوید اور عدیل نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''اے نوطی دیوی!'' عقیل نے عبارت پڑھنا شروع کی۔

''ہم تیرے سامنے اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ تو ہمارا......'' ابھی عقیل یہیں تک پہنچا تھا کہ نوید نے پتلون کی جیب میں چھپائی ہوئی لوہے کی سلاخ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے پوری طاقت سے اس کے سر پر دے ماری۔ عقیل کوئی آواز نکالے بغیر ہی فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نوید دوسرا وار کرنا چاہتا تھا مگر عدیل نے روک دیا۔

''کیا کر رہے ہو؟......'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''مندر کے فرش پر اس کے خون کی ایک بوند بھی گری تو ہمیں جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ اس کے پاؤں، منہ ہاتھ باندھ کر کوٹھڑی میں ڈال دو۔ پوری طرح ٹھکانے لگانے کا کام رات میں مناسب رہے گا۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' نوید نے سلاخ جیب میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔

''لا ڈوری نکالو۔''

عدیل نے ریشم کی باریک ڈوری نکال کر نوید کو دی اور نوید نے اپنا رومال عقیل کے منہ میں ٹھونستے ہوئے پوری بے رحمی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور پھر دونوں اسے اٹھا کر کوٹھڑی میں ڈال آئے۔ عدیل نے پجاری کے ڈھانچے کی طرف دیکھا اور نا معلوم کیوں اس کے منہ سے اطمینان کی گہری سانس نکل گئی۔ اس کے بعد انہوں نے 23 مجسموں میں سے عقیل کا بت لا کر دیوی کے سامنے رکھ دیا۔ ٹھیک اس جگہ جہاں عقیل کھڑا تھا۔

''ابھی ہمیں کم از کم چالیس منٹ تک یہاں رہنا پڑے گا۔'' نوید اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بہر حال ہمارے منصوبے کا معمہ کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اب دیکھنا ہے پروفیسر عثمان عقیل کے بت کو دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ جہاں تک یہ اندازہ ہے بیسویں صدی کی دنیا کے لیے ایک انسان کے پتھر بن جانے کی داستان دنوں اور ہفتوں تک اخبارات کا موضوع بنی رہے گی۔ کوئی اس حیرت انگیز کہانی پر یقین کرے نہ کرے مگر یہ طے ہے کہ اس ہنگامے میں کسی کو بھول کر بھی کسی جرم کی بو محسوس نہیں ہوگی۔''

''بشرطیکہ ہم عقیل کی لاش اس طرح ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو جائیں کہ کبھی اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔'' عدیل نے جواب دیا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اس وسیع صحرا میں آبادی سے میلوں دور......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی نظر میں نوطی دیوی کے مجسمے کے قریب چبوترے سے نیچے گرے ہوئے ایک کاغذ پر جمی تھیں۔ اپنا فقرہ نامکمل چھوڑتے ہوئے نوید نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو عقیل کے ہاتھ میں تھا اور جب اس پر وار کیا گیا تو چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا۔ لکھی ہوئی مخصوص عبارت پر ایک نگاہ ڈالتے ہی نوید کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا۔'' وہ مضحکہ اڑانے والے لہجے میں بولا۔

''ابھی ہم نے انصاف کی ساری رسمیں پوری نہیں کیں۔'' اس نے شوخی سے نوطی دیوی کے بت کی طرف دیکھا۔

''اے نئے زمانے میں تراشی ہوئی قدیم دیوی! تیرے احترام کا تقاضا ہے کہ ہم یہ آخری رسم بھی ادا کریں۔'' اور یہ کہتے ہوئے نوید نے کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنی شروع کر دی۔

''اے نوطی دیوی! ہم تیرے سامنے اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ تو ہمارا انصاف کرے۔ ہم میں سے جو چور ہے۔ وہ سزا پائے اور اس طرح تیری یہ قربانیاں دیوی آئی سس کے عذاب کو ٹھنڈا کر دیں۔''

آخری الفاظ ابھی نوید کے منہ سے ادا ہی ہوئے تھے کہ دیوی کا مجسمہ حرکت میں آیا۔ حسین، متناسب جسم پر لگا ہوا خوفناک چہرہ آہستہ آہستہ نوید اور عدیل کی طرف جھک گیا۔ باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں دو قندیلوں کی طرح روشن ہوئیں اور پھر ان میں سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والی شعاعیں بجلی کی طرح کوند کر ان دونوں پر پڑیں۔ نوید پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ عدیل نے گھبرا کر بھاگنے کا ارادہ کیا۔ مگر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ اس کا منہ شاید چیخنے کے لیے کھلا اور پھر کھلا ہی رہ گیا۔

دوسرے ہی لمحے دیوی کے سامنے ایک ہی نہیں تین مجسمے رکھے تھے۔

☆......☆......☆

غروب آفتاب کے بعد پروفیسر عثمان نے مندر میں قدم رکھا تو عقیل عدیل اور نوید کے بجائے پتھر کے تین بت دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک لمحے کے شدید تاثر کے بعد پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا کہ شاید تینوں ہی زیورات کی چوری میں ملوث تھے۔ لیکن فوراً ہی اس کے کانوں میں کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ چونک اٹھا آواز کوٹھڑی کی جانب سے آ رہی تھی۔ وہ اس طرف لپکا۔

بندھے ہوئے عقیل کو دیکھ کر اس کو حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا اور اب آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ عثمان نے جلدی سے اس کے منہ سے رومال نکالا۔ ہاتھ پیر کھولے عجیب بات یہ تھی کہ انہیں کوٹھڑی میں پجاری کا ڈھانچہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے عقیل؟'' انہوں نے پوچھا۔

''تم یہاں پڑے ہو تو وہ پتھر کا بت کس کا ہے؟''

عقیل نے اپنے سر کو ٹٹول کر دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بڑے اور گھنے بالوں نے سر کی ہڈی کو سلاخ کی ضرب سے زیادہ نقصان نہیں پہنچنے دیا تھا۔ پھر بھی سر کے پچھلے حصے میں ایک گومڑ سا ابھر آیا تھا۔ اور درد کی تیز لہریں سے اٹھ کر پورے جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' پروفیسر عثمان نے پوچھا۔

''میں کیا جواب دوں عثمان صاحب!'' عقیل کمزور آواز میں بولا۔

''مجھے خود معلوم نہیں کہ آپ کس بت کی بات کر رہے ہیں میں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں دیوی کے سامنے کھڑا ہوا وہ مخصوص عبارت پڑھ رہا تھا کہ نوید یا عدیل نے کوئی کوئی چیز بڑے زور سے میرے سر پر دے ماری جس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ پھر مجھے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوا۔ ہوش آیا تو میں اس کوٹھڑی میں پڑا تھا۔'' عثمان صاحب نے اسے دیوی کے سامنے رکھے ہوئے مجسموں کے بارے میں بتایا۔ پھر سہارا دیتے ہوئے کوٹھڑی سے باہر لائے۔ ابھی وہ دالان تک ہی پہنچے تھے کہ ایک عجیب منظر نے اُن کے قدم روک دیے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت قوی ہیکل شخص قدیم مصری سرداروں کا لباس پہنے نوطی دیوی کے سامنے آنکھیں بند کیے کھڑا ہے۔ اور اس کے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں پھیلے ہوئے ہیں۔

''خدائے نولہ! تیرے فرمان کے مطابق پچیس چوروں کی قربانی پیش کی جا چکی ہے۔ کیا تو اب بھی نوطی کے گناہ معاف کر کے اس کا حسن و جمال واپس نہیں کرے گا۔'' الفاظ اس کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ عثمان اور عقیل کی حیران نظروں نے دیکھا کہ اب چبوترے پر دیوی کے مجسمہ کی جگہ ایک انتہائی حسین و جمیل دوشیزہ کھڑی مسکرا رہی ہے پھر وہ اپنی مرمریں بانہیں کھولے نیچے اتری۔ اس نوجوان کا ہاتھ پکڑا اور دونوں آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔

عقیل نے چونک کر عثان صاحب کی طرف دیکھا اور پھر اس چبوترے کی جانب جو اب خالی ہو چکا تھا مگر ایک اور بات جو اس نے نہیں عثمان صاحب نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ دیوی کا مجسمہ ہی نہیں بلکہ فرش پر رکھا ہوا عقیل کا بت بھی غائب ہو چکا تھا۔

''یہ کون لوگ تھے عثمان صاحب؟'' آخر عقیل سے نہ رہا گیا۔

''اور وہ دیوی کا مجسمہ کہاں غائب ہو گیا؟''

''میرا خیال ہے کہ میں اب پوری داستان سمجھنے لگا ہوں۔'' عثمان صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آج میں پتھر کی اِن سلوں کو پڑھنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔''

''داستان سے آپ کا کیا مطلب ہے؟'' عقیل نے حیرت سے پوچھا۔

☆......☆......☆

''اب سے ہزاروں سال پہلے جب مصر میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی تو منجملہ اور دوسرے دیوتاؤں کے مصری خدائے نور اور اوسیریز دیوی آئی سس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ آئی سس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اوسیریز کی بیوی بھی تھی۔ اس زمانے میں دیوی آئی سس کے مندر کی ایک پجارن کا نام نوطی تھا۔ نوطی بے حد حسین تھی۔ اتنی حسین کہ اس کی خوبصورتی کا چرچا مندر کی چار دیواری سے نکل کر شہر میں گونجنے لگا۔ ایک مصری سردار کے بیٹے ہرماس نے اس کے حسن کی تعریف سنی تو مندر میں آیا۔ پہلی نظر میں ہی وہ نوطی کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ نوطی بھی اس سے متاثر ہو گئی۔ پھر ایک رات جبکہ ہرماس نے اس سے مندر کے باغ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ نوطی نے اپنے آپ کو محبوب کی نظروں میں اور پسندیدہ بنانے کے لیے ایک ایسی حرکت کی جو اس کے لیے ایک مسلسل عذاب بن گئی۔

☆......☆......☆

دیوی آئی سس کا مجسمہ...... اپنے عبادت گزاروں کے نذر کیے گئے زیورات سے مزین رہتا تھا۔ نوطی نے ہرماس کو لبھانے کے لیے، اس رات وہ زیور خود پہن لیے اور آئی سس کے عذاب میں آ گئی۔ دیوی آئی سس نے اسے پتھر کا بنا دیا اور اس کے حسین خدوخال کو ایک خوفناک بلا کے چہرے میں تبدیل کر دیا۔

آئی سس پہلے ہی نوطی کے حسن سے جلتی تھی اور اس نے اس واقعہ کو بہانہ بناتے ہوئے اپنے دل کا غبار نکالا تھا۔ بہرحال نوطی کے پتھر بن جانے سے ہرماس کی دنیا تاریک ہو گئی۔ اس نے اپنی محبوبہ کا گناہ معاف کرانے کے لیے پہلے آئی سس کی پوجا کی لیکن جب وہ نہ پسیجی تو اوسیریز کے مندر میں دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ اتنی پوجا اور آہ وزاری کی کہ آخر کار اوسیریز کو اس پر رحم آ ہی گیا لیکن معاملہ آئی سس کا تھا۔ اوسیریز اپنی بیوی کی ناراضگی مول لے کر نوطی کو اس کا حسن واپس نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے آئی سس پر زور دیا کہ وہ نوطی کا گناہ معاف کر دے۔ بہت کہنے سننے سے آئی سس اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ اگر نوطی اس کے مندر سے چلی جائے اور اپنی عمر کے ہر سال کے لیے ایک چور کی قربانی پیش کرے تو وہ اصلی حالت میں واپس آ جائے گی۔ ہرماس نے پھر التجا کی کہ نوطی تو پتھر کی بنی ہوئی ہے۔

وہ قربانی کس طرح پیش کر سکتی ہے۔ اس پر آئی سس نے ہرماس کو اس کی جانب سے قربانی دینے کا اختیار دے دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر چور نوطی کے بت کے سامنے لائے جائیں گے تو وہ خود بخود پتھر کے ہو جائیں گے اور اس کو نوطی کی جانب سے قربانی سمجھا جائے گا۔ چوروں کی قربانی غالباً اس لیے رکھی گئی تھی کہ خود نوطی چوری کے جرم میں ہی پتھر بنی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہرماس کے لیے چوروں کو تلاش کرنا اور انہیں نوطی کے مجسمے کے سامنے لانا آسان بات نہیں تھی۔ چنانچہ اس کے لیے اس نے ایک بہترین ترکیب سوچی۔ اس نے یہ مندر تعمیر کیا اور آس پاس کی آبادیوں میں پتھر کی ان سلوں کے ذریعے اعلان کر دیا کہ یہ مندر نوطی دیوی کا ہے جو چوری کے مجرموں کو سزا دیتی ہے۔

اس کی یہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی اور چند برس کے اندر ہی وہ 23 چوروں کی قربانی دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس سے قبل کہ دو مزید چوروں کی قربانی دے کر ہرماس نوطی کو اس کی خوبصورتی واپس دلا سکتا۔ ایک خوفناک زلزلہ آ گیا اور پوری بستی زمین میں دھنستی چلی گئی۔ ہرماس بھی مندر کے اندر قید ہو کر رہ گیا۔ بدقسمتی سے مندر کا دروازہ ایک بھاری چٹان نے بند کر دیا تھا۔ ہرماس کوشش کے باوجود اس چٹان کو نہ ہٹا سکا۔ بھوک پیاس اور دم گھٹنے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ مگر مرنے سے پہلے اس نے یہ تمام واقعہ پتھر کی ان سلوں پر لکھ دیا۔ جو اس کے ڈھانچے کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ میرا خیال ہے مرتبان میں جو زیورات ملے ہیں۔ وہ وہی تھے جنہیں نوطی نے آئی سس کے مندر سے چرایا تھا۔''

عثمان صاحب رُکے اور کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''اور میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نوطی کو بارِ گناہ سے آزاد کرانے کے لیے ہرماس کا عزم اتنا پختہ تھا کہ ہزاروں سال بعد جب قدرت نے دوبارہ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کا موقع دیا تو ہرماس کی روح نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

زیورات یقیناً نوید اور عدیل نے ہی چرائے تھے اور جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں مگر مجھے حیرت ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ تمہارا مجسمہ بھی یہاں رکھے دیکھا تھا اس کا راز کیا تھا اور اب وہ کہاں غائب ہو گیا۔ مزید یہ کہ نوید اور عدیل نے زیورات چرائے تھے تو کہاں رکھے تھے۔ جبکہ میں خفیہ طور پر ان کے سامان کی تلاشی لے چکا ہوں۔ اور وہ مجھے کہیں نہیں ملے۔''

''تو کیا آپ کو پہلے ہی ان پر شبہ تھا؟'' عقیل نے پوچھا۔

''ایمانداری کی بات ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے مجرم سمجھوں اور کسے بے گناہ۔ میں نے ان دونوں کے ساتھ تمہاری چیزوں کی بھی تلاشی لی تھی۔'' عثمان صاحب نے حقیقت بیان کی۔

☆......☆......☆

لیکن اگر عثمان صاحب کو اس پوشیدہ جگہ کا علم ہوتا جہاں نوید نے وہ قیمتی خزانہ چھپایا تھا تب بھی اب وہ انہیں وہاں نہیں پا سکتے تھے۔ نوطی کے مجسمے اور ہرماس کے ڈھانچے کے ساتھ ہی دیوی آئی سس کے زیورات بھی ہمیشہ کے لیے دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

☆☆......☆☆



ناول

کاشی چوہان

زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی چھٹی قسط

سلمان ابراہیم جو اس وقت صنوبر کے جسم میں موجود تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی جن کے کسی انسان کے جسم میں حلول کرنے کے نتیجے میں کیا کیا ہوتا ہے اور جو کچھ صنوبر کر رہی تھی یہ سب تو بہت ہی عجیب تھا۔ شاید صنوبر کا اپنا توازن بریک ہو چکا تھا۔

انسان کے جسم اور روح میں ایک ایسا توازن قدرت نے رکھا ہے جس کے ہونے سے انسان متوازن اور نارمل رہتا ہے اور جب یہ توازن بگڑ جاتا ہے تو انسان مختلف روحانی اور جسمانی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ سلمان کے صنوبر کے جسم میں حلول کرنے سے بھی صنوبر کے جسم اور روح کا توازن بگڑ چکا تھا اور وہ جو حرکتیں کر رہی تھی ان سب کا تعلق اسی عدم توازن سے تھا اسی لیے سلمان خود یہ سوچ رہا تھا کہ اگر صنوبر اسی طرح کی حرکتیں کرتی رہی تو اس کا باپ اسے ضرور ملک سے باہر علاج کے لیے لے جائے گا اور جب تک سلمان اس کے جسم میں موجود ہے اسے کہیں بھی لے جایا جائے، کسی بھی ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے، صنوبر ٹھیک نہیں ہو سکے گی بلکہ مختلف علاج کے تحت ملنے والی ادویات سے اس کے جسم میں کچھ ایسے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو اسے پھر کبھی نارمل نہیں ہونے دیں گے۔ تاہم اگر سلمان وہاں سے نکل جائے تو صنوبر پہلے کی طرح نارمل ہو سکتی ہے شاید فوراً یا کچھ دن میں۔

اب سلمان سوچ رہا تھا کہ اسے چاہے کیسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، اسے صنوبر کے جسم سے باہر آنا ہی ہوگا۔ لیکن باہر آ کر وہ کرے کیا۔ کس طرح صنوبر کے سامنے یا اس کے قریب رہ سکے گا۔ کوئی راستا تھا ہی نہیں۔ بلا بننے میں اسے اب ویسے بھی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ بلا بن کر وہ صنوبر سے زیادہ اس کی ماں کا چہیتا بن جاتا تھا پھر اس واقعے کے بعد تو یہ بالکل بھی ممکن نہیں تھا۔ سلمان کریم اس کی جان کا دشمن بن چکا تھا۔ اس لیے بلا بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تو پھر وہ کیا کرے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

مدرسے میں اس کی جگہ اس کا ہم شکل لے چکا تھا۔ اگر وہ اتنی جلدی جلدی ہم شکل کو وہاں سے نکالے گا اور بلائے گا تو استاد ریحان عظیم کو لازمی شک ہو جائے گا اور وہ اس تشویش اور تفتیش میں لگ جائیں گے کہ سلمان میں یہ تبدیلیاں کیسی اور کیوں ہیں۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ وہ وہاں مستقل یا طویل عرصے کے لیے اپنے ہم شکل کو ہی تعینات کرے اور خود کچھ اور سوچے مگر کیا....؟ یہ تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اسے اپنے گھر گئے ہوئے بھی کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ اگر اس کا باپ ابراہیم اس سے ملنے مدرسے آگیا تو اس کو پھر پتا چل سکتا ہے کہ وہ یہاں انسانوں کی دنیا میں کیا کیا حرکتیں کرتا پھر رہا ہے۔ سب سے زیادہ پکڑ میں آنے والی بات تو یہ تھی کہ اس نے جن جاتی کے اب تک اتنے اصول اور قوانین توڑ ڈالے تھے کہ اس کا باپ اسے کسی بھی صورت میں معاف نہیں کرسکتا تھا اور وہ اسے لازمی گھر لے جائے گا تاکہ جنات کے سردار کو کچھ بھی معلوم نہ ہوسکے۔ یہ سوچ کر سلمان ایک دم سے پریشان ہوگیا۔ اور اسے لگنے لگا کہ اس نے ایک ساتھ بہت سی مصیبتوں کو اپنے گھر کا راستہ دکھا دیا ہے اور یہ سب ہوا اور ہو رہا ہے ایک انسان لڑکی کی محبت، اس کے عشق میں۔ اور ان سے سب بڑی بات یہ تھی کہ اب تک بھی سلمان یہ نہیں جانتا تھا کہ صنوبر کو اس سے کوئی محبت بھی ہو بھی سکے گی یا نہیں....

یا الٰہی میں کس طرح ایک پہ ایک مصیبت میں پھنستا چلا جا رہا ہوں۔ اور اس کے باوجود نہیں جانتا کہ میں جس مہ جبیں کے عشق میں دیوانہ پاگل اور پتا نہیں کیا کیا بنتا جا رہا ہوں، اسے بھی میرے دل کی کچھ پروا ہے بھی یا نہیں.... یہ سب سوچ کر سلمان ایسی مہیب اداسی کا شکار ہوگیا کہ اس کا دل رونے لگا۔

☆......☆......☆

سوتے میں روتی ہوئی اور وہ بھی باقاعدہ آنسوؤں سے۔ صنوبر کو دیکھ کر آصف کی حالت عجیب سی ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کی بیٹی کس وجہ سے رو رہی ہے۔ وہ اگر خواب میں رو رہی ہے تو وہ کون سا خواب ہے جو اس کے دل پر اتنا گہرا اثر کر رہا ہے کہ وہ باقاعدہ رو رہی ہے اور شعوری طور پر اسے خود اپنے رونے کی خبر تک نہیں ہے۔ آصف سوچوں کی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ کمرے میں در شہوار داخل ہوئی اور اس نے بھی جب صنوبر کو سوتے میں اس طرح آنسوؤں سے روتے دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوگئی۔

''میں کہہ رہی تھی نا اس کی بیماری میں مسلسل کوئی نہ کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں کسی نئی بات سے چونکا رہی ہے۔ ایسی صورت میں تو ہم کسی ڈاکٹر کو اس کی بیماری کے پورے سمٹمز (علامات) بھی نہیں بتا سکتے اور جب ڈاکٹر کو پوری بات ہی نہیں پتا ہوگی تو وہ نتیجہ کیسے اخذ کرے گا کہ صنوبر کو کیا بیماری ہے۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس وقت کسی بھی ڈاکٹر سے اس کے بارے میں ڈسکس کیا گیا اور وہ ادھوری تفصیل جان کر کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ ظاہر ہے اسے تو علاج شروع کرنا ہی ہے تو مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ کسی ایسی بیماری کی دوائیں صنوبر کو کھلانا شروع نہ کردے جو اسے ہو ہی نا۔'' در شہوار کی بات میں وزن تو تھا۔

''تو ہمیں کیا کرنا چاہیے... کیا ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیے اور اسے اسی طرح بیماری کی دلدل میں گرتے ہوئے دیکھتے رہنا چاہیے؟'' آصف نے کسی قدر کسیلے لہجے میں کہا۔

''نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے... ہمیں کچھ دن انتظار کرنا چاہیے۔ اس طرح ہمارے پاس اس کی بیماری کی زیادہ تفصیلات اکٹھا ہوسکیں گی اور ڈاکٹر بھی ٹھیک طرح سے ڈائیگنوس کر کے صحیح رائے قائم کر سکے گا۔'' در شہوار کی بات سن کر آصف نے تحمل سے گہرا سانس لیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے ہم ایسا ہی کریں گے'' پھر ان دونوں نے دیکھا کہ صنوبر کے آنسو تھم چکے ہیں لیکن وہ اب بھی گہری نیند میں سو رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے خراٹے بھی ڈرا دینے والے ہو جاتے تھے ورنہ زیادہ تر وہ نارمل ہی تھی۔

سلمان کریم کے ذہن نے اب یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ اس بلے کا ہی کیا دھرا ہے۔ کیونکہ اس بلے کے گھر میں آنے کے بعد ہی یہ سب عجیب عجیب واقعات رونما ہونا شروع ہوئے ہیں۔ وہ کڑی سے کڑی ملاتا رہا اور اس کا ذہن اسی ایک مقام پر آ کے رک گیا کہ ہو نہ ہو یہ سب کچھ کیا دھرا اسی بلے کا ہے۔ وہ بلا نہیں تھا کچھ اور تھا۔ کوئی بھی بلا کسی انسان پر اس طرح کیسے حملہ آور ہو سکتا ہے جیسے اس نے مجھے زخمی کیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس بلے کا زور اور اس کی طاقت کئی انسانوں سے بھی زیادہ تھی۔ یہ سوچنے کے بعد اس کی آنکھوں میں عجیب سا غصہ بھر گیا اور وہ غصے سے انگارہ بنتا چلا گیا۔

اگست 2015ء 15-16

☆......☆......☆

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' آصف نے اس کی بات سننے کے بعد ردعمل ظاہر کیا۔

''ایسا ہوا ہے پاپا! میری کسی دوست سے کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ یہ سب اسی بلے نے کیا تھا جسے ماما نے پالا ہوا تھا۔'' سلمان نے بلے اور اپنی جھڑپ کے بارے میں جب ایک ایک بات تفصیل سے اپنے باپ کو بتائی تو وہ ششدر رہ گیا اور ایک فسوں اثر کے اسیر کے سے انداز میں بولا۔



''کیا تم یہ کہنے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہی بلا اس وقت صنوبر کے اندر.....'' بات آصف کے حلق میں اٹک کے رہ گئی۔ اور خوف سے اس کے چہرے کے عضلات پھیلنے اور سکڑنے لگے اس کی آنکھوں میں... مایوسی اور دکھ کی لہریں اٹھنے لگیں اور وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ سلمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب اور کیا کہے....

''میں بابا کو بلا کے لاتا ہوں۔'' پتا نہیں آصف نے یہ بات سنی کہ نہیں سلمان کمرے سے جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد درشہوار سلمان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ تینوں کچھ دیر تک خاموش رہے جیسے بات کرنے کے لیے کوئی مناسب الفاظ تلاش کر رہے ہوں۔

''کیا تمہیں بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ وہ بلا نہیں کوئی جن تھا اور اس وقت... جن صنوبر کے جسم میں موجود ہے؟'' آصف کا سوال درشہوار کے لیے کسی بڑے لاینحل معمے سے کم نہیں تھا۔ وہ ہاں بولتی تب بھی اور نہ بولتی تب بھی اس کے لیے اس معمے کے دائرے سے نکلنا مشکل تھا۔ وہ دیر تک سوچتی رہی اور اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ یاد کرتی رہی کہ کس طرح بلا صنوبر کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور وہ اس کے مقابلے میں صنوبر سے زیادہ مانوس تھا۔ اس کو لے کر کئی بار صنوبر سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا اور صنوبر نے بلے کی حمایت کرتے ہوئے اسے چپ کر دیا تھا۔

تو کیا واقعی سلمان کا شک ٹھیک ہے۔ یہ سب کیا دھرا اسی بلے کا ہے۔ اسے بلے کا سلمان پر جھپٹنا اور اسے زخمی کرنا بھی یاد آیا۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس وقت جب بلا سلمان پر جھپٹ رہا تھا تو وہ ایک معمولی بلا نہیں بلکہ کوئی شیر یا چیتا معلوم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

''ہاں شاید سلمان ٹھیک کہہ رہا ہے!!!''

آصف کے لیے یہ بات کسی جان لیوا حادثے سے کم نہیں تھی۔

''تو اب ہمیں اس بلے کا علاج کرنا ہوگا۔ دنیا میں ایسا کون سا ڈاکٹر ہے جو صنوبر کے جسم میں موجود بلے کو نکال سکتا ہو۔ اول تو کوئی بھی ڈاکٹر یہ یقین نہیں کرے گا کہ ایسا ممکن ہے اور جب ہم اسے یقین ہی نہیں دلا سکیں گے تو علاج کیسے ممکن ہو سکے گا۔ یہ نہ ہوا تو کیا صنوبر ساری زندگی اسی بلے کی قید میں رہے گی۔'' اوہ میرے خدا یہ کیسا امتحان ہے۔ تینوں کے دماغ شائیں شائیں کرنے لگے اور ان کی عقلیں جواب دے گئیں.....

اگلی صبح ان تینوں کے لیے کسی بھی طرح حیرت کے نئے جھٹکے سے بلکہ دھماکے سے کم نہیں ثابت ہوئی۔ وہ تینوں چپ چاپ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے جب صنوبر وہاں داخل ہوئی۔ وہ اپنے اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی اور اس کی تیاری اس کی چال ڈھال بتا رہی تھی کہ وہ اپنے ہمیشہ کے معمول کے عین مطابق اپنے اسکول جا رہی ہے جیسے ان گزرے دو دنوں میں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ اسی طرح ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھی اور چائے نکالنے لگی۔ جیسے ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ پھر اس نے توس پر مارجرین لگایا۔ اور بولی۔

''تم تو سلمان ایسے بیٹھے ہو جیسے تمہیں یونیورسٹی جانا ہی نہیں ہے۔ کیا آج چھٹی کرو گے؟ اگر ایسا ہے تو پاپا آپ مجھے ڈراپ کر دیجیے گا۔ مجھے تو اسائنمنٹ جمع کرانا ہے میرا جانا ضروری ہے۔'' اور چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے اپنے پاپا کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مصر کے قدیم عہد کی ممیاں ہوں، جن کے جسم بالکل انسانوں جیسے تھے۔ مگر ان کی روحیں پرواز کر چکی تھیں۔ صنوبر کو لگا وہ تین مردوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی ہے!!!

صنوبر کے اس بدلے ہوئے رویے پر تینوں اس کی طرف ایسے دیکھ رہے تھے جیسے یہ کوئی خواب ہو اور اس خواب کے ٹوٹتے ہی انھیں پھر سے اسی عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہوئی صنوبر کو دیکھنا ہوگا۔ اسی لیے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا یہ خواب ٹوٹ کے بکھر جائے خاص طور سے درشہوار اور آصف تو بالکل بھی نہیں... لیکن سلمان جو نئی نسل کا لڑکا تھا وہ اتنی دیر خوابوں کی دنیا میں کیسے رہ سکتا تھا۔ اس نسل کے تو انگ انگ میں بجلی بھری ہوئی ہے۔ ان کے پاس صبر ہے نہ قرار یہ تو کہیں چین سے نہ بیٹھ سکتے ہیں اور نہ چین سے جی سکتے ہیں۔ سلمان نے صنوبر کو دیکھ کر اسے ہاتھ بڑھا کر چھوا اور پھر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ صنوبر کو اس کی یہ حرکت بہت ہی غیر مناسب معلوم ہوئی وہ سمجھ نہیں سکی کہ سلمان کو

کیا ہوا ہے۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' صنوبر نے قدرے تیکھی مگر غصیلی آواز میں کہا۔

''کو.....ئی... م...ط...لب نہیں ہے.... صنوبر میں تو بس.... تمہارا بخار چیک کر رہا تھا۔'' سلمان نے کچھ نہیں جو آیا اس نے کہہ دیا۔

''میرا بخار چیک کر رہے تھے۔ مجھے کب بخار آیا.... میں تو بالکل ٹھیک ہوں.... تمہارا دماغ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کیا تمہاری طبیعت اب تک خراب ہے جو ایسی حرکتیں کر رہے ہو؟''

''لیکن یہ اتنی بڑی بات تو نہیں ہے.... تم اتنا ناراض کیوں ہو رہی ہو صنوبر.... مجھے ماما نے بتایا تھا کہ رات کو تمہیں کچھ ٹمپریچر تھا۔ یہ بھی کہا تھا انھوں نے کہ تم شاید آج اپنے آرٹ اسکول نہیں جا سکو گی۔ بس اسی لیے میں چیک کر رہا تھا کیونکہ مجھے تو تم ایک دم ٹھیک لگ رہی ہو۔''

''اچھا... یہ بات ہے چلو پھر.. کوئی بات نہیں.... میں کچھ اور ہی سمجھ رہی تھی۔ خیر....'' اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماں اور والد کی طرف متوجہ ہوتی وہ دونوں بھی ایک ایک کر کے عین فلموں کے نقلی مجسموں کی طرح لہرا کر ہوش و خرد کی دنیا میں لوٹ آئے انھوں نے صنوبر کو دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی....

''لگتا ہے یہ ٹھیک ہو گئی ہے'' درشہوار نے پاس بیٹھے آصف سے سرگوشی میں کہا۔ آصف نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اس بدلی ہوئی حقیقت کو ابھی اور آزمانا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ کوئی طوفان آنے سے پہلے کا وقفہ نہ ہو۔ صنوبر کا اس طرح ہوش مندوں کی طرح بات کرنا لحاتی ہوا تو ان کے خوش ہونے کا کوئی مطلب نہیں رہ جائے گا، اس لیے وہ پوری طرح یقین کر لینا چاہتا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے وہی حقیقت ہے۔

''پاپا چلیں نا مجھے دیر ہو رہی ہے!'' صنوبر نے پھر کہا تو آصف کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا اس کی بات کا جواب دینا جیسے اب ضروری ہو گیا تھا۔

''بیٹا آج آپ چھٹی کیوں نہیں کر لیتیں... اچھا ہوگا کہ کچھ اور آرام کر لو'' آصف نے کہا تو صنوبر کو یک بارگی جیسے جھٹکا لگا۔

''آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے پاپا۔ یہ سلمان بھی ابھی میری نبض چیک کر رہا تھا کہ مجھے کہیں بخار تو نہیں ہے۔ آپ بھی مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں ایسا کیا ہوا ہے.... جو آپ دونوں ایسی عجیب اور بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں... اور جب میں ٹھیک ہوں تو آرام کیوں کروں... بلا وجہ اسکول کی چھٹی کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟'' درشہوار سمجھ گئی کہ اب اگر صنوبر سے اور اس قسم کی کوئی بات کی گئی تو وہ مزید الجھ سکتی ہے اس لیے اس نے سچویشن کو سنبھالا اور بولی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے صنوبر! سلمان کیوں ستاتے ہو میری بیٹی کو، آصف چلو جلدی سے ناشتا ختم کرو اور صنوبر کو اس کے اسکول چھوڑ کر آؤ''

''کیا مطلب ہے، تو کیا پاپا اور یہ سلمان کا بچہ مجھے الو بنا رہے تھے؟'' صنوبر کے چہرے پر تازگی پھیل گئی۔

''ارے نہیں بیٹا! یہ کوئی الو بنانے والی بات نہیں۔ یہ تو بس موڈ اچھا رکھنے کا ایک بہانا ہے۔'' آصف نے کہا تو سلمان بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا اور پھر چاروں نے اس ہنسی میں اپنی ہنسی ملا دی۔ ماحول میں ایک قابل ذکر شگفتگی دوڑ گئی۔

سلمٰی یہ سب سن کر حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ وہ تو صنوبر کے لیے اپنے پیر بابا سے وقت بھی لے چکی تھی اور اسے پورا یقین تھا کہ صنوبر کو پیر بابا بالکل ٹھیک کر دیں گے۔ اس کے اندر کا جن نکالنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا لیکن یہ کیا!! صنوبر تو بالکل سیانوں کی طرح باتیں کر رہی تھی اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے اپنی اس ناقابل یقین بیماری کے بارے میں کچھ یاد بھی نہیں تھا۔ کوئی مانے چاہے نہ مانے یہ تو کوئی چمتکار ہی تھا جو اس لڑکی کے ساتھ ہوا

سلمیٰ اور کتنی دیر تک اپنے خیالوں سے الجھتی رہی۔ یہ بات اتنی اہم ہے بھی نہیں، اس کی مایوسی کہ وہ اس بڑے گھر پر تھا۔ یہ احسان نہیں کر سکی کہ اس کی کوششوں کے نتیجے میں اس گھر کی جوان لڑکی صحت یاب ہونے والی تھی۔ یہ بھی کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ ضروری بات تو یہ ہے کہ صنوبر ٹھیک ہو چکی تھی اور اسے ٹھیک دیکھ کر سلمان جن کو بہت خوشی مل رہی تھی لیکن ساتھ ہی اس کی رگوں میں یہ مایوسی بھی پھیلی ہوئی تھی کہ اس نے اپنا وجود کھو دیا تھا اور اب وہ ہواؤں میں معلق تھا۔ اس کا جو اس وقت اس کے ہم شکل کے پاس تھا اور وہ نادیدہ ہو چکا تھا۔ وہ صنوبر کو دیکھ سکتا تھا اسے سن سکتا تھا مگر اس سے بات نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اسے حاصل کر سکتا تھا۔ یہ سب اس کے لیے پریشانی اور اضطراب کا باعث تھا لیکن اس وقت وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو صنوبر کا باپ اسے امریکا یا کسی بھی دوسرے ملک علاج کے لیے لے جاتا۔ وہاں پہنچ کر سلمان جن کو اور بھی مشکلات پیش آ سکتی تھیں تب ہی اس کا یہ فیصلہ اس کے اپنے خیال سے اس وقت بالکل درست تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کل رات تک وہ ایسی غشی کی سی حالت میں تھی جیسے برسوں کی بیمار ہے اور اب ایسے پیش آرہی ہے جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں.. آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ میں بار بار خود سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ مجھے صنوبر کے ٹھیک ہو جانے پر خوش ہونا چاہیے یا نہیں.... کہیں یہ محض کوئی وقفہ تو نہیں ہے جو صنوبر خود کو بالکل نارمل سمجھ رہی ہے؟'' آصف نے اپنے کمرے میں پہنچ کر یہ بات درشہوار سے کہی۔

''جو بھی ہو مگر اس وقت ہمیں اسے یہ احساس نہیں دلانا چاہیے کہ وہ بیمار تھی اور بیماری بھی ایسی کہ اس کا نہ کوئی نام ہے اور نہ نشان ہے۔ ہم یہ تک نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا تھا۔ اور جب ہم یہ نہیں جانتے تو اسے کیا بتا سکتے ہیں۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ ٹھیک ہو گئی ہے۔''

درشہوار نے کہا تو آصف کو اس کی بات موقع کی مناسبت سے بالکل ٹھیک لگی وہ یکا یک اس بات پر غور کرنے لگا۔ نہ اس نے پتا نہیں کتنے عرصے بعد اپنے گھر میں خدا کا نام سنا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنا تو انھیں آتا ہی نہیں تھا اور جوان کے گھر میں یا ان کے دلوں میں موجود ہی نہیں تھا اس کا شکریہ وہ کیسے ادا کرتے۔ اگر صنوبر ایسے خود بخود ٹھیک نہ ہوتی اور انھیں اسے بیرونی ملکوں میں کہیں علاج کے لیے لے جانا پڑتا تب بھی وہ خدا کو یاد نہ کر پاتے کیوں کہ یہ سب تو میڈیکل سائنس اور علاج کہلاتا اس میں خدا کہاں سے آتا۔ لیکن یہ جو چمتکار ہوا تھا ایک مہیب بیماری سے صنوبر کا اس طرح باہر آنا کہ اس پر بیماری کے اثرات بھی کوئی نہیں رہے تھے یہ ایسا واقعہ تھا کہ اس پر خدا کا یاد آ جانا لازمی تھا اور اب درشہوار کے منہ سے آصف نے خدا کا نام سنا تو اسے لگا کہ اس کے گھر میں شاید یہی ایک چیز مسنگ ہے تب ہی اس کے بچے عجیب عجیب بیماریوں اور حرکتوں میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ کہیں خدا نے اسے یہ کوئی پیغام تو نہیں دیا۔ آناً فاناً آصف خدا کا بندہ بن گیا اور اس نے دل میں عہد کر لیا کہ آج وہ خدا کا شکریہ ادا کرنے اس کے گھر یعنی مسجد ضرور جائے گا۔

تیار ہونے کے بعد آصف ہی صنوبر کو اپنی گاڑی میں اس کے اسکول چھوڑنے گیا۔ راستے بھر وہ چپ چاپ صنوبر کو محسوس کرتا رہا اور اس کی طرف سے گفتگو کرنے کا منتظر رہا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی کسی بھی بات میں کہیں ایسا کوئی تاثر نہ در آئے جس سے صنوبر کی حالت اور اس پراسرار بیماری کے بارے میں صنوبر کو کوئی شبہ یا شک ہو جائے۔ صنوبر نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اس کا باپ خلاف معمول کچھ زیادہ ہی خاموش ہے حالانکہ آج تو اس کی ماما اور پاپا میں کسی بھی قسم کی کوئی جھڑپ، کوئی لڑائی کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ورنہ آئے دن آصف کریم کا موڈ آف ہوتا اور وہ جھنجلایا ہوا ہوتا۔ اس جھنجلاہٹ میں وہ اس کی ماں کے بارے میں ایسی باتیں کہتا جو صنوبر کو پسند تو نہیں آتی تھیں مگر وہ ان سب باتوں کو سن کر اس لیے چپ رہتی تھی کہ اسے اپنے ماں اور باپ میں سے کسی کی بھی طرف داری نہیں کرنا تھی، کیونکہ وہ دونوں کو ہی ایک جیسا قصوروار سمجھتی تھی۔ ان کے گھر کے ماحول کو ٹینس کرنے میں دونوں برابر کے ذمہ دار تھے۔ لیکن آج تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی تو آصف کیوں اتنا چپ تھا۔

''پاپا آپ کی ماما سے کوئی ناراضگی نہیں ہے پھر بھی آپ اتنے چپ ہیں۔ کیا کوئی اور بات ہے؟'' صنوبر نے بڑے

سلیقے سے اپنی بات کہی تا کہ اس کے باپ کو ناگوار نہ گزرے۔

''اچھا تمھیں لگتا ہے میں چپ ہوں! اصل میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی بیٹی سے کیا بات کروں؟ اچھا یہ بتاؤ تمہارا اسکول کیسا جا رہا ہے؟'' آصف نے بولتے ہوئے سوچنے کی بہت کوشش کی کہ کوئی ایسی بات وہ کر سکے جو قدرے غیر معمولی ہو مگر اسے اس وقت کوئی اور بات نہیں سوجھی۔

صنوبر نے ہلکے سے تبسم سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور بولی۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت عرصے بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ہمارے گھر میں بھی انسان رہتے ہیں۔ آج آپ نے اور سلمان نے مجھ سے مذاق بھی کیا تھا اور آپ نے آج مما سے کوئی جھگڑا بھی نہیں کیا۔ میں سوچ رہی ہوں کیا ہمارا گھر ہمیشہ کے لیے ایسا نہیں ہو سکتا؟'' آصف کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری، والے سوال کا جواب دینے کے بجائے صنوبر نے وہ کہا جو اس کے دل میں تھا جو وہ کہنا چاہتی تھی۔ صنوبر کی بات سن کر آصف کو پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ اس کے اور درشہوار کے جھگڑوں اور ٹینشن سے اس کی بیٹی چپکے چپکے اثر لیتی رہی ہے مگر اس نے پہلے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تو اسے پتا بھی نہیں چلا کہ ان دونوں میاں بیوی کی ناچاقی سے ان کے بچے کس قدر متاثر ہوتے رہے ہیں۔ اس احساس نے جیسے اس کا دل ایک دم ہی نرم بنا دیا اور اس نے صنوبر کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا ہمارا گھر میری بیٹی کو اب اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اب تمہیں کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''سچ پاپا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' صنوبر جیسے کھل ہی تو اٹھی۔

''ایک دم سچ مائی چائلڈ'' آصف کی آواز رندھ سی گئی....

''مائی گریٹ پاپا! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں ہمیشہ آپ کو اچھا ہی دیکھنا چاہتی ہوں'' یوں دونوں خوشگوار باتیں کرتے رہے اور انھیں پتا بھی نہیں چلا کہ کب ان کی منزل آ گئی۔ صنوبر نے پہلی بار اپنے پاپا سے جدا ہوتے ہوئے انھیں اتنے پر جوش اور محبت سے خدا حافظ کہا کہ آصف کو جینے کا مزا آ گیا۔ وہ چلی گئی اور آصف اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک وہیں کھڑا رہا، سوچتا رہا اور مسکراتا رہا۔

گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نادیدہ جن دونوں باپ بیٹی کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ صنوبر کو خوش دیکھ کر اسے جانے کیوں بے پناہ خوشی مل رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ جس اداس اور سوچوں سے لڑتی ہوئی لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ آج کی صنوبر اس سے کس قدر مختلف تھی۔ وہ ہنستی تو اس کی ہنسی میں گھنگرو سے بجنے لگتے تھے۔ کاش وہ ہمیشہ اسی طرح ہنستی مسکراتی رہے۔ سلمان جن نے دل میں سوچا اور جب صنوبر گاڑی سے اتری تو وہ بھی ساتھ ہی اتر گیا۔ لمحے بھر کو آصف کو ایسا لگا تھا جیسے گاڑی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھلا تھا لیکن جیسے ہی اس نے گھبرا کے مڑ کے دیکھا تو دروازہ اسی طرح بند تھا جیسے وہ ہوتا ہے اس لیے اس بات کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆......☆......☆

اسکول میں داخل ہوتے ہی سلمان جن نے صنوبر کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے پھر سے ایک حیرت کا جھٹکا لگا ابھی کچھ دیر پہلے جو لڑکی اپنے باپ سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی یہ وہ صنوبر تو نہیں تھی۔ صنوبر کا چہرہ پوری طرح بجھ چکا تھا اور وہ درد و رنج کی تصویر نظر آنے لگی تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ایسے غائب ہو گئی جیسے اسے مسکرانا آتا ہی نہ ہو۔

''یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟'' سلمان جن نے سوچا۔ اس اسکول میں ایسا کیا ہے جو صنوبر کو اس درجے اداسی اور غم نے جکڑ لیا ہے۔ وہ پہلے بھی ایک بار یہاں صنوبر کے ساتھ بلا بن کے آ چکا تھا اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا صنوبر کو جو بھی روگ لگا ہوا ہے یا جو بھی دکھ ہے اس کا تعلق اسی اسکول سے ہے۔ سلمان جن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پہلے کی

طرح اس بار بھی اس نے یہی سوچا کہیں صنوبر کو کسی لڑکے سے محبت تو نہیں ہے۔ ایسا سوچتے ہوئے اسے ہمیشہ یہ بات بھول جاتی تھی کہ صنوبر ایک انسان تھی اور عمر کے جس حصے سے وہ گزر رہی تھی اس کو محبت کا ہو جانا کوئی اچنبھے والی بات نہیں تھی۔ سب ہی انسانوں کو اس عمر میں محبت ہو جاتی ہے اور جن کو نہیں ہوتی ان میں انسانیت کی کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہوتی ہے جبکہ صنوبر کے خیالات اور اس کی صاف اور نتھری ہوئی سوچیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ وہ اوروں سے زیادہ بہتر انسان ہے۔ تو اسے محبت تو ہونی ہی تھی لیکن چونکہ سلمان جن اس کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا تو وہ یہ بات سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ انسانوں میں رہتے رہتے اسے یہ تک یاد نہیں رہتا تھا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ جن ہے اور جنوں اور انسانوں میں جو فرق ہے وہ بالکل وہی ہے جو حقیقت اور خواب میں ہوتا ہے۔ ایک نظر آنے والی حقیقت ہے اور دوسری نہ نظر آنے والا ایک تصور ہے لیکن اس تصور پر انسانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ یقین کریں بالکل ایسے جیسے وہ خدا کو مانتے ہیں جو نظر نہیں آتا اور موجود ہوتا ہے لیکن جنات میں کچھ باتیں انسانوں جیسی ہوتی ہیں۔ جیسے ان کی آبادی بڑھتی گھٹتی رہتی ہے اور ان کے ہاں شرح پیدائش بھی ہے وہ نیک اور بد بھی ہوتے ہیں بالکل انسانوں کی طرح اور خدا میں بڑھنے اور گھٹنے کا کوئی عمل موجود نہیں ہے اور نہ ہی خدا کے جسم سے کچھ بھی پیدا ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

سلمان جن نے ایک بار پھر افسوس کے ساتھ صنوبر کو دیکھا جو اب اپنی کلاس میں داخل ہو چکی تھی صنوبر کے چہرے پر وہی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آہستگی سے اپنی نشست پر جا کے بیٹھ گئی کلاس میں ہلا گلا قسم کی ہڑ بونگ تو نہیں مچی ہوئی تھی پھر بھی اسٹوڈنٹس کی باتیں چھت اڑائے دے رہی تھیں اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ سلمان جن نے ٹکٹکی باندھ کے صنوبر کو دیکھنا شروع کر دیا کہ اگر اس نے کسی بھی لڑکے کی طرف دیکھا تو وہ اس کے دیکھنے سے یہ اندازہ ضرور لگا لے گا کہ صنوبر کا اس سے کیا اور کیسا تعلق ہے۔ لیکن دیر تک صنوبر کی دیکھنے کے بعد بھی اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ صنوبر بدستور خاموش بیٹھی رہی اور اس نے کسی کی طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون ٹیچر کلاس میں داخل ہوئیں تو صنوبر کے ساتھ ساتھ باقی بھی سب اسٹوڈنٹس خاموش ہو گئے اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ٹیچر نے سب سے ان کے اسائنمنٹ کے بارے میں پوچھا تو پوری کلاس میں سے دو چار اسٹوڈنٹس ہی ایسے تھے جن کے اسائنمنٹ کمپلیٹ تھے باقی سب نے شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر کی روایتی گفتگو کرنے کے بعد ٹیچر انھیں کسی لیب کی طرف لے گئی جہاں کمپیوٹروں پر انھیں گرافک سکھائی جانے لگی۔ کلاس سرگرمی سے اس میں جٹ گئی اور صنوبر تو جیسے پڑھنے کے علاوہ کچھ بھی اور کرنے آتی ہی نہیں تھی۔

سلمان جن مسلسل پریشان ہوتا رہا کہ جب صنوبر کو کسی سے دلچسپی نہیں ہے تو محبت بھی نہیں ہو گی۔ پھر وہ کیوں اتنی اداس اور غمگین رہتی ہے۔ اس نے اپنے ہم شکل کو اس کے باوجود مدرسے میں چھوڑا ہوا تھا کہ اسے ہر وقت اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ استاد ریحان اس کے نقلی ہونے کو کسی بھی وقت پکڑ سکتے ہیں۔ اگر ہم شکل پکڑا گیا تو اس کے لیے اتنی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی کہ اس کا یہاں انسانوں کی دنیا میں رہنا بھی ایک قسم کی جنگ میں تبدیل ہو جائے گا جو اسے اپنے قبیلے اور اپنے باپ کے خلاف لڑنی ہو گی۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ جنگ پوری تاریخ میں آج تک کوئی بھی نہیں جیت سکا تھا اس لیے اسے ڈر تھا کہ وہ بھی نہیں جیت سکے گا پھر بھی وہ اپنے دل، اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور تھا اور اسے ڈرتے رہنے کے باوجود اس سفر کو جاری رکھنا تھا۔ جانے قبیلے والے تو اسے کسی نہ کسی طرح زندہ چھوڑ بھی دیں چاہے۔ وہ ان کی قید ہی میں کیوں نہ ہو لیکن صنوبر کو چھوڑ کے جینا اسے کسی طور گوارہ نہیں تھا۔ سے ایسا لگتا تھا جیسے صنوبر اس کی روح میں اتر چکی ہے اور اس کی روح صنوبر کے بغیر ایسے ہو جائے گی جیسے بنا نفس کے جسم ہوتا ہے۔ مگر اس کی جھنجلاہٹ یہ سوچ سوچ کر بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اب تک صنوبر کو یہ تک نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اس کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی رہی تھی۔ ایک بار اس نے انسانی روپ میں آ کر صنوبر سے بات کرنے کی کوشش کی تو صنوبر نے اسے دیکھتے ہی چیخنا شروع کر دیا تھا اور دوسری بار اس نے صنوبر کے جسم میں حلول کر کے اسے اپنے بس میں کرنا چاہا تو اس کا نتیجہ بھی بہت ہی کربناک نکلا۔ صنوبر شاید اس

کے بس میں ہو گئی تھی مگر وہ اور اپنے بس میں نہیں رہی تھی اور انسان کا اپنے بس سے باہر چلے جانے کا مطلب ہے کہ وہ بیمار ہے یا پاگل ہے۔ ایسا ہو جانے کی صورت میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہونے والا تھا وہ سلمان جن کی استعداد سے زیادہ تھا۔ وہ اتنی بڑی ریس کو جیت نہیں سکتا تھا اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس ملک یا اس شہر سے نکلنے کے بعد اس پر کیا گزرنے والی ہے۔ نادیدہ سرحدوں سے باہر اسے جانے کی اجازت بھی دی جائے گی یا نہیں۔ اجازت لے کر تو وہ عشق بھی نہیں کر رہا تھا پھر بھی نادیدہ سرحدوں کے بھی کچھ نہ کچھ پہریدار تو تھے جو اس طرح کھلے بندوں ہر کسی کو آنے اور جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور یہ اجازت اسے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ اسی لیے وہ جلدی سے صنوبر کے جسم سے باہر نکل آیا تا کہ وہ ٹھیک ہو سکے اور اس کے بارے میں اس کے ماما، پاپا اور بھائی کو جو یہ فکر لاحق ہو چکی تھی کہ صنوبر پر کوئی جن مسلط ہو چکا ہے اس سے انھیں چھٹکارہ مل جائے اور اس کا باپ اسے کہیں بھی لے جانے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے۔ بہت سوچ بچار کے بعد بھی وہ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تلاش کر سکا کہ آخر صنوبر سے وہ اپنے عشق کا اظہار کیسے کرے۔ عشق کی فطرت میں ایسی بے چینی بھری ہوئی ہوتی ہے جیسے جسم میں کسی نے انگارے بھر کے اسے سی دیا ہو۔ انگارے سلگتے ہیں تو دل بے چینی سے کلبلاتا ہے اور تب دل یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کے لیے سر میں خاک ڈال کر دیوانہ ہو کر اس کے حضور میں جائے اور دوزانو ہو کر اسے اپنے دل کا حال سنائے۔ محبوب کے دیدار کی خاطر عشق کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب عاشقوں نے سر سے کفن باندھ کے جان کی بازی تک لگانے سے گریز نہیں کیا۔

یہ تو سلمان جن کی بڑی زبردست خوش قسمتی تھی کہ اسے صنوبر کا دیدار ہو جاتا تھا اور یہ اس کے جن ہونے کی وجہ سے ہی ممکن ہو پایا تھا ورنہ بے چارے انسان کو یہ رعایت کہاں ملتی ہے۔ اسے تو اپنے محبوب کو دیکھنے کے لیے ہی اتنے جتن کرنے پڑتے ہیں جن سے اس کا سارا وجود دکھتا ہوا پھوڑا بن جاتا ہے۔ سلمان جن کی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو اس نے اپنی حالت کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دینے میں ہی عافیت جانی اور اسی طرح سے زندگی اور وقت گزارنے لگا۔

☆......☆......☆

صنوبر اسکول میں دو ایک لڑکیوں سے ملی اور ان سے عام روزمرہ کی باتیں کرنے کے بعد اسکول کی چھٹی کے وقت گھر جانے کے لیے اپنے بھائی سلمان کو فون لگانے لگی۔ اسے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس کا بھائی سلمان تو اس کے بلانے اور فون کرنے سے پہلے گاڑی لے کر اس کے اسکول کے باہر موجود تھا۔ وہ جلدی سے باہر نکلی اور سلمان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جیسے ہی سلمان جن گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اسے ایک سرگوشی سنائی دی۔

''استاد ریحان تو آج مجھے پہچاننے ہی والے تھے۔ بڑی مشکل سے جان بچائی ہے میں نے'' یہ سرگوشی اس کے ہم شکل سلمان کی تھی اس لیے وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رہ گیا اور اس نے صنوبر کو اس کے بھائی کے ساتھ جانے دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا دل اداسی سے بھر گیا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ اسے قلق تھا کہ اس کے راستے کی مشکلات ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا جب وہ صنوبر کے پہلو میں بیٹھ کر اسے محبت کے میٹھے راگ سنائے گا، اس کی خوبصورت آنکھوں میں دیکھ کر شاعری کیا کرے گا، اس کے ہونٹ، اس کے رخسار اور اس کی گھنیرے بادلوں جیسی زلفیں اس کے شانوں پر کب دراز ہوں گی۔ وہ وقت کب آئے گا جب اس کی صنوبر اس کی ہو جائے گی اور دن رات وہ اس کے حسن کے دربار میں حاضر رہا کرے گا۔ اسے کسی سے پوچھنے اور اجازت لینے کی ضرورت نہیں رہے گی وہ صنوبر کا مالک بن چکا ہو گا اور صنوبر اس کے دل کی ملکہ کہلائے گی۔ یہی سب سوچیں اسے ہمہ وقت پریشان رکھا کرتی تھیں۔ اور اس کے پاس اپنے دل میں اٹھنے والی ان تڑپتی مچلتی آرزوؤں اور خواہشوں کو تسلی دینے کا کوئی متعین وقت نہیں رہا تھا۔ وہ کرے تو کیا کرے.... اس وقت اس کا دل اداس تھا وہ صنوبر سے دور جانے کو اپنی سب سے بڑی محرومی سمجھتا تھا۔ لیکن اسے اپنے ہم شکل کی سرگوشی سننے کے بعد مدرسے جانا ہی تھا اور نہ جاتا تو کیا کرتا۔ ویسے بھی پچھلے دو ہفتوں سے وہ اپنے ماں باپ سے ملنے بھی نہیں گیا تھا اس لیے اس کا مدرسے جانا، صنوبر سے دور ہونا از بس لازمی ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

صنوبر اپنے گھر پہنچی تو اسے یہ دیکھ کر جیسے حیرت کا دورہ سا پڑ گیا کہ اس کی ماما درشہوار کچن میں سلمٰی کے ساتھ کچھ پکانے میں مشغول تھی۔ یہ منظر تو اس نے اپنی ساری زندگی میں شاید دو ایک بار سے زیادہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی ماں سے مارے خوشی کے لپٹ گئی اور زور زور سے شور مچاتے ہوئے انھیں پیار کرنے لگی۔ سلمان نے یہ منظر دیکھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ اس نے وہاں سے خاموشی سے کھسک جانے ہی میں عافیت جانی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بیٹی میرے کچن میں کھانا پکانے سے اتنی خوش ہوتی ہے۔ تم کہو تو میں یہیں کچن میں ہی رہنا شروع کر دیتی ہوں۔''

''اوہ ماما آپ بھی نا... میں ایسا تو نہیں چاہتی۔ میں تو اس لیے خوش ہو رہی ہوں کہ میں نے آپ کو بہت عرصے بعد کچن میں کچھ بناتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا بنا رہی ہیں۔ کیا پاپا لنچ کے لیے گھر آ رہے ہیں؟'' اس کے لہجے کی خوشی برقرار تھی۔

''پاپا تو آ رہے ہیں مگر میں ان سے زیادہ اپنی بیٹی کی پسند کی چیزیں بنا رہی ہوں۔'' درشہوار نے کہا تو صنوبر نے ان کے گلے سے بانہیں نکالتے ہوئے ہلکی سی اداسی سے کہا۔

''کتنا اچھا ہوتا کہ آپ یہ سب اہتمام پاپا کے لیے کرتیں۔''

''چلو اب اداس مت ہو میں نے وہ ڈشز تو تمہارے پاپا کی پسند کی بھی بنائی ہیں۔ ویسے تمہیں بتا دوں تمہارے پاپا میرے ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا کھانے نہیں بلکہ اپنی صنوبر بیٹی سے ملنے آ رہے ہیں'' درشہوار کے لہجے میں دور کہیں ڈولتی ہوئی اداسی کو اس وقت صنوبر محسوس نہیں کر سکی۔

''یہ آپ کیوں کہہ رہی ہیں۔ صبح سے پاپا نے کوئی دس بار تو مجھے ضرور فون کیا ہوگا۔ سلمان بھی آج میرے فون کرنے سے پہلے میرے اسکول کے باہر موجود تھا اور آپ بھی میری پسند کے کھانے بنانے کے لیے ایک طویل عرصے کے بعد کچن میں موجود ہیں یہ سب کیا ہے ماما۔ آخر یہ اچانک سے میں اتنی وی آئی پی کیسے ہو گئی۔ آخر بات کیا ہے؟''

''آپ اتنی بڑی مصیبت سے جو نکلی ہیں صنوبر بی بی'' سلمٰی نے یہ بات کہہ کر درشہوار کی طرف دیکھا تو درشہوار کی نظروں سے برستی آگ کو محسوس کر کے اسے اپنی غلطی کا احساس فوراً ہی ہو گیا اور وہ جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر کر کچھ کاٹنے میں محو ہو گئی۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا سلمٰی۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں کچھ سمجھی نہیں'' صنوبر نے سلمٰی کو متوجہ کیا۔

''کچھ نہیں چھوٹی بی بی بس یونہی منہ سے نکل گیا تھا'' سلمٰی نے اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''ایسا کیسے منہ سے نکل گیا۔ تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو۔ ضرور کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ بولو کیا بات ہے۔ کیا ہوا ہے مجھے؟'' صنوبر کو سلمٰی کی اس بات نے اور بھی الجھا دیا تھا اور اب وہ اس کے سر پر جا کے کھڑی ہو چکی تھی۔

''ارے بیٹا تم کہاں اس کے ساتھ اپنا سر پھوڑ رہی ہو۔ اسے تو بے موقع بولنے کی عادت ہے اسی لیے میں کہتی تھی اسے اتنا سر پہ مت چڑھاؤ۔ اب پتا نہیں کیا ہے اس کے دل و دماغ میں، جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے'' درشہوار نے سلمٰی کو سناتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ اپنے کمرے میں فریش ہو جاؤ میں کھانا لگاتی ہوں۔'' اسی وقت آصف کے گھر میں داخل ہونے کی آواز آئی۔

''دیکھو تمہارے پاپا بھی آ گئے ہیں۔ جاؤ ان سے مل آؤ جا کے'' درشہوار کی یہ بات جیسے حکم تھا۔ صنوبر وہاں سے چلی آئی کچن کے باہر اس نے اپنے پاپا کو دیکھا جو اِدھر اُدھر دیکھ کر اوپر جانے کی تیاری کر رہے تھے تاکہ اپنا آفس کا سامان اپنے کمرے میں رکھنے کے بعد فریش ہو کر کھانے کی میز پر آ سکیں۔ انھوں نے صنوبر کو دیکھا تو ایک دم کھل اٹھے اور صنوبر کو گلے سے لگانے کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے۔

''کیسا ہے میرا بیٹا؟''

''میں ٹھیک ہوں پاپا مجھے کیا ہوا ہے۔ مگر آپ نے جس طرح آج سارا دن مجھے اسکول میں فون کیے ہیں، میں خود کو پوری طرح ٹھیک نہیں سمجھ رہی۔ کیا بات ہے پاپا پلیز مجھے بتائیں'' صنوبر نے اپنے باپ کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ یہ بس ایک تبدیلی ہے ہم سب اس گھر کو گھر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور آپس میں پیار و محبت بانٹنے کی ایک ہلکی سی کوشش اور تم جانتی ہو تمہارے پاپا کو تمہارا کتنا خیال ہے اسی لیے تمہیں میں نے کچھ زیادہ فون کر دیے جس سے تم پریشان ہو گئیں۔ چلو آئندہ میں خیال رکھوں گا۔ یاد کرو تم نے ہی تو کہا تھا آج تمہیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ ہمارا گھر بھی انسانوں سے بھر گیا ہے۔ تو پھر شکایت کیسی۔'' آصف کی باتوں کے بعد صنوبر کے دل میں اٹھنے والا وسوسہ کسی قدر دور ہو گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ بلاوجہ اس تبدیلی کو غلط معنی دے رہی تھی۔

ایک اچھے گھر میں رہنے والے سب ہی رشتوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے کی پروا کرتے ہوئے اور پروا میں تو یہ سب ہوتا ہی ہے۔ اس نے اپنے پاپا سے سوری کہا اور فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

کھانے کی میز پر سب نے بہت ہنسی خوشی کھانا کھایا اور آج پہلی بار صنوبر نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ ایک دوسرے سے اجنبی تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کو نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے برعکس وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں بھی کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو کھانا بھی پاس کر رہے تھے۔ سلمان کا موڈ بھی اچھا تھا اور وہ پاپا سے ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ ان کا دوست ہو۔ یہ سب دیکھ کر صنوبر کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی سے ناچنا شروع کر دے۔

''کیا بات ہے صنوبر تم کچھ لے نہیں رہیں۔ کن سوچوں میں گم ہو بیٹا؟'' درشہوار نے اس سے پوچھا۔

''ماما یہ سلمان کا بچہ میری پلیٹ سے اٹھا اٹھا کر کھا رہا ہے۔ تو میں نے سوچا جب اس کا پیٹ بھر جائے گا میں تب ہی لوں گی، اس لیے اس کے پیٹ بھرنے کا انتظار کر رہی ہوں'' صنوبر نے اتنی معصومیت سے یہ بات کہی کہ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''سلمان کیوں بہن کو تنگ کر رہے ہو؟'' آصف نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا۔

''ارے نہیں پاپا اسے ڈانٹیے مت۔ میں نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا۔ مجھے تو یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' صنوبر نے سلمان کی حمایت کی تو وہ اور شیر ہو گیا۔

''دیکھا یہ بڑی ڈرامے باز ہے پاپا۔ آپ کیوں اس کی باتوں میں آتے ہیں۔ یہ خود ایسا چاہتی ہے کہ میں اسے تنگ کروں اور جب تنگ کرتا ہوں تو آپ سے شکایت بھی کرتی ہے'' سلمان نے پھر صنوبر کی پلیٹ سے فش کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ تم دونوں کو جیسے جی چاہتا ہے ویسے کھاؤ ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

☆......☆......☆

کھانا ختم کرنے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور سلمٰی کھانے کے برتن اور کھانا سمیٹنے لگی پھر وہ کچن میں کھانے کے برتن دھونے میں مصروف ہو گئی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن برتن دھو رہی تھی کہ اس وقت ایک دم سے ایسی چونکی جیسے کسی سانپ نے اسے ڈس لیا ہو یا اس نے سانپ دیکھ لیا ہو۔

''سلمٰی کیا کر رہی ہو؟'' اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوا بھی تھا تو سلمٰی کو اس طرح کی عادت نہیں تھی۔ اس گھر کا تو یہی دستور تھا کہ جب سب اپنے کمروں میں چلے جاتے تو اسے یا دوسرے نوکر کو کمرے میں بلا کر ہی کوئی بات کہی جاتی تھی یا پھر انٹرکام پر جو بھی کام ہوتا تھا وہ بتا دیا جاتا۔ یہ صنوبر تھی جو عین اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔

''ڈر گئیں...... ڈرنے کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بتاؤ یہیں بات کریں یا کمرے میں چلیں؟'' صنوبر نے اس کے

خوفزدہ چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کون سی بات صنوبر بی بی؟'' سلمٰی کی آواز میں اب بھی خوف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

''وہ ہی بات تم میرے بارے میں کچھ کہنے والی تھیں۔ کس مشکل کی بات کر رہی تھیں تم۔ وہ مجھے جاننا ہے۔ میں یہ جانتی ہوں کہ اس وقت تم نے ماما کی وجہ سے وہ بات نہیں بتائی تھی۔''

صنوبر کی بات سن کر جیسے سلمٰی نے تھوگ نگلا اور چپ سادھ لی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ صنوبر کی بات کیا جواب دے۔ اسے اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ صنوبر کو وہ بات اگر اس نے بتادی تو بیگم صاحبہ اسے ضرور نوکری سے نکال دیں گی اور صنوبر بی بی کو بھی وہ اچھی طرح جانتی تھی وہ بھی اس سے بات پوچھے بغیر اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ یہی سوچ کر اس کی روح خشک ہو رہی تھی کہ اب کیا کرے۔ آگے کنواں اور پیچھے کھائی تھی۔

''چپ کیوں ہو بولتی کیوں نہیں ہو؟ بتاؤ کیا بات ہے؟'' صنوبر اسے خاموش دیکھ کر بلند ہوتی ہوئی آواز میں بولی....

''آپ ایسا کریں، اپنے کمرے میں جائیں۔ میں یہ برتن دھو کر ابھی آپ کے کمرے میں آتی ہوں'' سلمٰی نے اپنے خوف اور ڈر پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے میں کمرے میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں'' یہ کہہ کر صنوبر چلی گئی اور سلمٰی کا ڈر کے مارے دم حلق میں آگیا کہ اب وہ کیا کرے۔ کس سے مدد لے۔ اس نے بہت سوچا۔ سارے برتن دھل گئے مگر اسے صنوبر بی بی سے بچنے کا کوئی راستا نہیں نظر آیا۔ جب کافی دیر ہوگئی اور سلمٰی صنوبر کے پاس نہیں پہنچی تو وہ اسے دیکھنے کے لیے کچن کی طرف آئی۔ کچن ویران پڑا تھا۔ سلمٰی کا وہاں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ صنوبر نے اسے دوسرے کمروں کی طرف لان اور چھت حتیٰ کہ ہر جگہ دیکھا مگر سلمٰی اسے کہیں بھی نظر نہیں آئی۔

اس کا ذہن الجھ گیا کہ یہ سلمٰی کو کیا ہوا۔ اس وقت وہ کہاں جاسکتی ہے۔ اس وقت تو اسے گھر ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ پہلے صنوبر نے سوچا کہ وہ اپنی ماما سے جاکے پوچھے ہوسکتا ہو انھوں نے اسے کہیں بھیج دیا ہو... لیکن پھر اس نے یہ ارادہ بدل دیا۔ اس طرح اس کی ماں کو شک ہوسکتا ہے کہ وہ سلمٰی سے ضرور کوئی ایسی بات پوچھنا چاہتی ہے، جس کے لیے انھوں نے اس وقت سلمٰی کو روک دیا تھا۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اسے ایک خیال آیا اور وہ بنگلے کے چوکیدار کے پاس گئی۔

جو کچھ اسے بنگلے کے چوکیدار نے بتایا وہ صنوبر کی حیرانی کے لیے بہت کافی تھا۔ چوکیدار نے اس سے کہا کہ وہ اپنے گھر چلی گئی اور بول گئی ہے کہ میں کل بھی نہیں آؤں گی....'' صنوبر کا ذہن بری طرح الجھ گیا کہ ایسی کیا بات ہے جو سلمٰی کو اس طرح جانا پڑا اور اس نے گھر میں کسی کو بتانے کے بجائے چوکیدار کو بتانا ٹھیک سمجھا اور اس کا کل بھی چھٹی کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسی کیا بات ہے جسے بتانے سے زیادہ سلمٰی کو یہاں سے اس طرح بھاگ جانا غنیمت معلوم ہوا۔ ایسا کیا ہوا ہے جو اتنا زیادہ پریشان کن ہے کہ سلمٰی کے حواسوں نے جواب دے دیا اور اس نے اپنی نوکری تک کو خطرے میں ڈال دیا۔

آخر کیا بات ہے.... کیا ہوا ہے؟ صنوبر الجھتی رہی مگر اسے اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملا اس کے سوالوں کے جواب سلمٰی کے پاس تھے اور سلمٰی ایسے غائب ہوگئی جیسے اسے اپنی جان کا خطرہ ہو۔ اگر صنوبر سلمٰی کا گھر جانتی تو ضرور اس وقت اس کی بے چینی کا جو لیول تھا وہ اس کی وجہ سے سلمٰی کے گھر تک جا پہنچتی۔ لیکن صنوبر سلمٰی کا گھر ٹھکانہ نہیں جانتی تھی اس لیے اپنی بے چینی کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا لہٰذا وہ بے چین ہوتی رہی۔ سلمٰی کے اس پراسرار رویے نے اس بات کو پہلے سے بھی زیادہ اہم بنادیا تھا اور اب صنوبر کے لیے اس بات کا جاننا اور بھی ضروری ہوگیا تھا۔ صنوبر کی جگہ کوئی بھی ذی شعور ہوتا تو اس کا بھی پیش آنے والے اس واقعے پر یہی ردعمل ہوتا جو اس صنوبر کا تھا۔ وہ پہلے سلمٰی کی بات کو روز مرہ سے تھوڑی سی بلند کوئی بات سمجھ کر اس میں دلچسپی لے رہی تھی مگر یہ جو سلمٰی پراسرار انداز میں غائب ہوئی تو صنوبر کو

یقین ہوگیا کہ ضرور کوئی بہت اہم بات ہے ورنہ سلمٰی اس طرح غائب کیوں ہوتی۔ لیکن سلمٰی کو اس بات کے طشت از بام ہونے کا اس قدر ڈر یا خوف کس وجہ سے تھا۔ یقیناً اسے کسی نے منع کیا تھا کہ یہ بات صنوبر پر ظاہر نہ ہو اسی لیے وہ صنوبر کو بتانا نہیں چاہتی تھی ورنہ اس گھر میں سلمٰی خود یہ بات جانتی تھی کہ سب سے اچھی انسان صنوبر ہی تھی جو سلمٰی کے ہر دکھ درد میں کام آتی رہی تھی اسی لیے صنوبر کو یقین تھا کہ سلمٰی ماما کے منع کرنے کے باوجود اس سے کوئی بھی بات مخفی نہیں رکھ سکے گی۔ سلمٰی کے اس طرح اچانک گھر سے چلے جانے کا تو صنوبر سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ صنوبر نے کسی خیال کے تحت اپنا موبائل چیک کیا کہ شاید اس میں سلمٰی کا دیا ہوا کوئی موبائل نمبر موجود ہو جو اس نے کبھی محفوظ کرلیا ہو۔ دیر تک وہ مختلف طریقوں سے اپنا موبائل چیک کرتی رہی۔ کبھی سلمٰی کے نام سے، کبھی ملازمہ اور سرونٹ وغیرہ کے نام سے مگر اسے سلمٰی تک پہنچنے اور اس سے رابطہ کرنے کا کوئی ذریعہ معلوم نہیں ہوسکا اور وہ اپنی بے قراری کے ساتھ ہی کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب تو سلمٰی سے کل ہی ملاقات ہوگی۔

یکا یک اس کے ذہن میں ایک بات آئی وہ جلدی سے اٹھی اور اپنی ماں کے کمرے کی طرف چل دی راستے میں اسے سلمان ملا جو گھر سے باہر کہیں جا رہا تھا۔ حسب دستور نہ اس نے بتایا اور نہ صنوبر نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ مدت سے اس گھر کا یہی دستور تھا کہ کوئی کسی کے بارے میں چھان بین کرنے یا کچھ بھی جاننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ سب اپنے اپنے اعمال اور کردار کے خود مالک تھے اور خود ہی اپنے کیے کے ذمہ دار تھے یعنی کوئی کسی کی زندگی میں کسی بھی قسم کی دخل اندازی نہیں کرتا تھا تاوقت کہ کسی نے کسی دوسرے کی مدد چاہی ہو یا کوئی اور ایسی بات ہو جس کی وجہ سے بات کرنا ضروری ہو چکا ہو۔

یہ انسانی سماج کی وہ شکل سمجھی جاتی ہے جس کے لیے صدیوں سے انسان کوشاں ہے اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں یہ طریقہ اب تک پوری طرح لاگو نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن اس گھر میں کسی حد تک ایسا تھا تاہم اس دستور زندگی کا جو سب سے بڑا نقصان ہوا وہ یہ کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے چار لوگ جو آپس میں سگے خونی رشتوں میں بندھے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے چلے گئے اور اجنبیت نے گھر کو ایک ویران دشت میں تبدیل کردیا۔ صنوبر کی بیماری کے بعد سے یہ چاروں نفوس اس طریقہ زندگی کو بدلنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے تھے اس لیے جاتے جاتے سلمان واپس آیا اور بولا۔

''صنوبر میں اپنے دوست مانی کے گھر جا رہا ہوں۔ شاید میری واپسی میں مجھے کوئی چار پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ پلیز تم ماما پاپا کو بتا دینا'' صنوبر کو سلمان کی یہ بات سن کو کچھ حیرانی ہوئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

اسے یاد آگیا کہ اس کے گھر کے لوگ ایک دوسرے کے کا خیال رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اجنبیت کو رخصت کیا جا رہا ہے۔ صنوبر نے سلمان کو یقین دلایا کہ وہ اس کا پیغام ماما پاپا تک پہنچا دے گی۔ ویسے بھی وہ اس وقت ماما کے پاس ہی جا رہی تھی۔ سلمان چلا گیا اور صنوبر یہ سوچتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی کہ اس کے گھر میں یہ تبدیلی کافی خوشگوار ہے لیکن اس تبدیلی کے آنے کی کیا وجوہات ہیں یہ وہ نہیں جانتی تھی کہ اچانک اتنا بڑا انقلاب آخر ایسا کیسے۔

شاید سلمٰی جو بات کہنے والی تھی اس کا اس تبدیلی سے کوئی تعلق ہو.... ایسی ہی باتیں سوچتی ہوئی جب وہ اپنے گھر کی پہلی منزل پر پہنچی تو اسے درشہوار اپنے کمرے کے بجائے ٹیرس پر اکیلی بیٹھی نظر آئی۔ اس کے چہرے پر جنم جنم کی اداسی پھیلی ہوئی تھی اور وہ دور تک جانے کیا دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آیا دیکھ بھی رہی تھی یا اپنے ہی خیالوں میں الجھی ہوئی وہ صرف آنکھیں کھولے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی اور کسی دوسرے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں کچھ دیکھ رہی ہے۔ درشہوار کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اسے صنوبر کے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی اور وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

''ماما......'' صنوبر نے اسے آواز دی... مگر پہلی آواز کا درشہوار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''ماما آپ یہاں بیٹھی ہیں؟'' یہ جملہ صنوبر نے قدرے بلند آواز میں کہا تھا۔ درشہوار ایک دم ہی چونک اٹھی اور اس کی طرف دیکھ کر زبردستی اپنے چہرے

پرمسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔

''ارے تم! میں تو سمجھی تم سو رہی ہو؟''

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، آپ سے کچھ پوچھنا ہے مجھے'' صنوبر نے کہا۔

''اتنی ضروری کیا بات ہے بیٹے جس کے لیے تم نے اپنی نیند بھی خراب کرلی۔'' درشہوار نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چلو پوچھو کیا پوچھنا ہے'' صنوبر نے ماں کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔

''مجھے آپ کو یہ بھی بتانا تھا کہ سلمان اپنے دوست مانی کے گھر گیا ہوا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا چار پانچ گھنٹوں میں لوٹ آئے گا۔ میرا خیال ہے آپ نے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے'' درشہوار مسکرائی۔

''نہیں میں نے اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن میں خوش ہوں کہ اس نے اپنے بارے میں تمہیں بتایا۔ لیکن مجھے اس بات پر اب بھی یقین نہیں ہے کہ اس نے مجھے بتانے کو کہا ہے۔ یہ ضرور تم اپنے پاس سے کہہ رہی ہو!'' درشہوار نے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا۔

''آپ کو یقین نہیں ہے۔ لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں... مجھے بھی اس کی بات سن کر یقین نہیں آیا تھا لیکن یہ سچ ہے ماما'' صنوبر کی بات سن کر درشہوار کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔

''اس کا مطلب ہے اس نے مجھے معاف کردیا ہے'' یہ بات درشہوار نے کسی قدر بے یقینی سے کہی۔

''شاید! مگر میں دیکھ رہی ہوں آپ کو اس بات پر یقین نہیں ہے''

''ٹھیک کہا تم نے میں اپنا یقین کہیں کھو چکی ہوں۔ مجھے اسے واپس لانے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ ویسے بھی اتنا زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ جیسے کئی صدیاں۔ جیسے بہت سے موسم اور مجھے یاد نہیں کہ میری غلطیاں کتنی پرانی ہو چکی ہیں۔ میرے بچے مجھے کیسے معاف کرسکتے ہیں۔ تمہاری بات اور ہے۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے مگر سلمان!!! اسے میں جانتی ہوں۔ وہ اتنی آسانی سے کسی کو معاف نہیں کرسکتا۔'' درشہوار کی باتوں میں ناامیدی کے سائے لہرا رہے تھے۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں رشتوں میں کتنی بھی دراڑیں پڑ جائیں، انہیں محبت سے بھرا جا سکتا ہے۔ بس تھوڑی زیادہ محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' صنوبر کی بات سن کر درشہوار نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''پتا نہیں محبت کا یہ سبق تم نے کہاں سے سیکھا۔ اس گھر میں تو محبت کو کبھی رہنے ہی نہیں دیا گیا۔'' درشہوار نے سوچا کہا نہیں۔

''آپ کیا سوچنے لگیں؟''

''کچھ نہیں، تمہاری بات پر غور کر رہی تھی۔ کبھی کبھی زیادہ محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور جنھیں تھوڑی محبت بھی نہ ملی ہو وہ زیادہ پا کر پریشان ہو سکتے ہیں۔ سب کچھ اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ اسے نئے سرے سے ٹھیک کرنا ہوگا اور میں اکثر وہ سرا ڈھونڈتی رہتی ہوں جہاں سے شروع کرسکوں۔''

صنوبر نے محسوس کیا کہ اس کی ماں کسی قدیمی محرومی کے زیر اثر آ چکی ہے اور اسی لیے اس کے لہجے میں اداسی اور ایک قسم کی ناامیدی ہے۔

''آپ اگر اسی طرح تلاش کرتی رہیں تو سرا کبھی نہیں ملے گا۔ محبت کے لیے کسی نئے سرے کی یا ابتدائی سرے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے جہاں سے بھی شروع کرو وہیں سے اس کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ ماضی تکلیف دیتا ہو تو اسے بار بار یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ویسے بھی ماضی کا ازالہ کوئی کبھی نہیں کرسکتا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی گئے وقت کو واپس نہیں لا سکتا۔ ہمیں اپنے آج کی فکر کرنی چاہیے۔''

صنوبر کی باتیں جیسے درشہوار کے دل میں اتر گئیں۔ اسے ایکا ایکی اسے یاد آیا کہ اس کی بیٹی ایک آرٹ اسکول میں پڑھتی ہے، محبت کو اوروں سے زیادہ جانتی ہے۔

''تم کچھ پوچھنے آئی تھیں؟'' درشہوار نے خاموشی کے وقفے کو طویل ہوتے دیکھ کر کہا۔

''اوہ ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔ یہ سلمٰی آج اتنی جلدی کیوں چلی گئی کیا اس نے جانے سے پہلے آپ کو کچھ بتایا ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟''

درشہوار چونکی... پر کچھ کہتے کہتے جیسے اسے کچھ یاد آ گیا اور اس کا منہ کھلا اور دھیرے دھیرے بند ہو گیا۔ 'سلمٰی چلی گئی اس طرح بنا بتائے۔' وہ خود بھی حیران ہوئی یہ خبر سن کر اور اب وہ صنوبر سے یہ بات چھپانا چاہتی تھی کہ اسے سلمٰی کے اس طرح اچانک چلے جانے کا پتا نہیں ہے۔ جواب دینے سے پہلے وہ سوچوں کی وادیوں میں اتر گئی۔ سلمٰی کیوں چلی گئی۔ اگر وہ صنوبر سے بچنے کے لیے ایسا کر رہی ہے تو آخر وہ کب تک صنوبر سے بچ سکتی ہے۔ کل، پرسوں یا کسی بھی دن اسے صنوبر کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو کیا بات ہے۔ کیا تمہیں اس سے کوئی کام تھا؟'' درشہوار نے صنوبر کی بات کا سیدھا جواب دینے کے بجائے الٹا ہی سے سوال کردیا۔ صنوبر سمجھ گئی کہ اس کی ماں سلمٰی کے اس طرح اچانک چلے جانے سے زیادہ اس بات کو لے کر تشویش میں پڑ گئی ہے کہ وہ سلمٰی سے کیا چاہتی ہے۔

''ہاں میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے کیا چھپا رہی ہے؟'' صنوبر کو یہی ٹھیک لگا کہ وہ اپنی ماں کو اپنی بے چینی کے بارے میں بتا دے۔

''میں نے بتایا تو تھا اس عورت کی تو عادت ہے فضول بولنے کی۔ تم کیوں اتنی چھوٹی سی بات کو لے کر پریشان ہو رہی ہو'' درشہوار پریشانی سے اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

''مجھے لگتا ہے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں اور سلمٰی کو بھی آپ نے بتانے سے منع کردیا ہے اسی لیے وہ اس طرح غائب ہو گئی ہے'' درشہوار کو سچ جاننا تھا اور اب وہ اس بات کو یہیں ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے بیٹے! تم تو خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ جاؤ جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ تم تھک گئی ہو اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی تمہیں ضرورت ہے'' درشہوار نے بات کو ٹالنے کی ایک اور کوشش کی۔

''نہیں، آپ ایسا نہیں کرسکتیں۔ بات چھپانے کی آپ کو ضرورت نہیں ہے مما۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں۔ مجھے اس طرح لاعلم رکھنا اور سلمٰی کو کسی ایسی مشکل میں ڈالنا جس کی وجہ سے وہ یہ جاب ہی چھوڑنے پر مجبور ہو جائے ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہوگا آپ مجھے سچ سچ اور کھل کے پوری بات بتا دیں۔ یہ چھپانے سے زیادہ بہتر ہوگا۔'' صنوبر نے حتمی انداز میں کہا تو درشہوار کو لگا کہ اس کی بیٹی اس کی توقع سے زیادہ ذہین اور حساس ہے۔ اس سے کچھ بھی چھپانا شاید ممکن نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ ٹھیک یہ کہہ رہی ہو کہ چھپانے سے زیادہ اسے بتانا زیادہ بہتر ہوگا۔

''اچھا تو پھر سنو۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیسا وعدہ؟'' صنوبر نے عجلت سے پوچھا۔

''یہی کہ جو میں کہوں گی اسے سننے کے بعد تم میرا یقین کرو گی اور اس بات کو ابھی اور اسی وقت یہیں اسی میز پر چھوڑ کر جاؤ گی۔ اس کے بارے میں مزید کوئی کرید اور تجسس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دو گی'' درشہوار کی بات سن کر صنوبر کو یقین ہو گیا کہ جو بھی بات اس سے چھپائی جا رہی تھی وہ اتنی غیر اہم نہیں ہے بلکہ اس کی ماں کا اس طرح اس سے وعدہ لینا تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کافی اہم بات ہے۔

''ٹھیک ہے میں پوری کوشش کروں گی'' صنوبر نے لمحے بھر سوچنے کے بعد کہا۔

''سلمٰی کا خیال ہے... تم پر کسی جن کا سایا پڑ گیا تھا۔''

''کیا..........!'' صنوبر ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ کس قسم کی بکواس ہے'' صنوبر جیسے چیخ ہی تو پڑی۔

''میں جانتی تھی یہ بات سن کر تم اسی قسم کا ردعمل ظاہر کرو گی۔ اسی لیے میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور میری پوری بات توجہ سے سنو''

''میں حیران ہوں کہ آپ نے اس پاگل عورت سے یہ بات سن کر بھی اسے نوکری پر رکھا ہوا تھا۔ اسے تو اسی وقت نکال باہر کردینا چاہیے تھا۔'' صنوبر غصے سے کھولنے لگی۔

''میں نے کہا نا بیٹے پہلے تم پرسکون ہو جاؤ۔ نہیں تو تم میری بات کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکو گی۔ ایسا کہنے میں سلمیٰ کا کوئی قصور نہیں تھا، جو کچھ تمہیں ہو گیا تھا اور تم جو حرکتیں کرنے لگی تھیں وہ سب دیکھنے کے بعد ہم سب بھی سلمیٰ کی بات کا یقین کرنے لگے تھے۔''

صنوبر کے چہرے پر حیرت اور دکھ کی لہریں ایسے نظر آنے لگیں جیسے کسی نے اس کی روح نچوڑ لی ہو۔ درشہوار جو کہتی رہی، جو کچھ بولتی رہی صنوبر کو ہر لمحے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔!!!

خوف اور ڈر اس کی رگوں میں دوڑتے لہو کو منجمد کرتے چلے گئے اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

☆......☆......☆

سلمان جن جب مدرسے پہنچا تو اس کا ہم شکل بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔ وہ گھاس کے وسیع قطعے پر اس طرح ٹہل رہا تھا جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے اور اسے روکنے کی کوئی تدبیر نہیں بن پا رہی۔ سلمان جن نے اس کے قریب جا کر کہا۔

''اتنی بے قراری بھی اچھی نہیں ہوتی۔ کسی نے دیکھ لیا تو خوامخواہ پھنس جاؤ گے۔ تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا مجھے ضرور مشکل میں ڈال دو گے۔'' ہم شکل نے یہ آواز سنی تو وہ فی الفور پرسکون ہو گیا۔

''اوہ میرے آقا! اچھا ہوا آپ عین وقت پر آ گئے ورنہ میرا تو ڈر کے مارے برا حال ہوتا جا رہا تھا۔ آپ وقت پر نہ آتے تو مجھے یہاں سے فرار ہونے کے علاوہ کوئی اور راستا نظر نہیں آ رہا تھا، اور یہ آپ کے حکم سے سرتابی کہلاتی، جو میں کرنا نہیں چاہتا۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟ کیا ریحان استاد کو تم پر شک ہو چکا ہے کہ تم اصلی سلمان نہیں ہو؟'' سلمان اب تک بھی پوشیدہ تھا کیونکہ اس وقت اسے خود کو پوشیدہ رکھنا ہی تھا۔ ہم شکل جو ظاہر میں تھا اور اس مقام پر ان دونوں میں سے کسی ایک کا ظاہر ہونا ہی ان کے مفاد میں تھا۔

''نہیں آقا وہ تو میں کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی رہا تھا بلکہ میرا خیال ہے اب تک انھیں اس طرح کا کوئی شک نہیں ہوا ہے کہ میں اصلی سلمان نہیں ہوں۔ میری پریشانی کی وجہ تو اس سے بھی زیادہ بڑی ہے۔''

''پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔ جلدی سے کہو کیا معاملہ ہے؟'' سلمان جن کو جیسے غصہ آ گیا۔ ہم شکل نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے والد ماجد جناب ابراہیم اس وقت استاد ریحان اور نگراں کے کمرے میں موجود ہیں اور وہ آپ سے ملنے آئے ہوئے ہیں''

''کیا......؟'' سلمان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''اسی لیے میں یہاں اس طرح سب سے چھپ کے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے بلوایا تھا۔ ایک قاصد مجھے بلانے آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے روانہ کیا اور کہا کہ میں بس پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس منحوس انسان کو میں نے کیسے ٹالا ہے۔ آقا یہ انسانی مخلوق جتنی ذہین ہے اتنی ہی ڈھیٹ بھی ہے۔ اسے دھوکا دینا یا اس سے بچ نکلنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔''

ہم شکل نے جلدی جلدی اپنی پریشانی بیان کی اور سلمان نے اس کی بکواس کو توجہ سے اس لیے نہیں سنا کہ وہ خود بڑی مصیبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کا ذہن مسلسل یہ سوچے جا رہا تھا کہ کیا اس کے باپ کو اس کے ارادوں اور اس کی ان حرکتوں کا پتا چل چکا ہے کہ اس نے نہ صرف ایک انسان لڑکی سے محبت کا جرم کیا ہے اور قوانین کے خلاف اپنا ہم شکل بھی تخلیق کیا ہے۔

وہ سوچوں میں منہمک تھا اور اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اب اسے اپنی اصل شکل میں آ جانا چاہیے اور ہم شکل کو چھٹی دے دینی چاہیے۔ وہ خود کو کسی بڑی ابتلا میں گرفتار ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کیا کرے گا۔ ابھی تو صنوبر سے اس کا تعارف بھی نہیں ہوا۔ اور اس کا بھانڈا پھوٹنے والا ہے۔ یاالٰہی اب کیا کروں۔'' اس نے گمبھیر پریشانی میں کہا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے آقا؟'' ہم شکل نے سلمان کو کسی بھاری الجھن میں مبتلا دیکھ کر ہم شکل اپنے ہونے کا اسے احساس دلایا۔

''تم اب دفع ہو جاؤ، چلو جاؤ اب۔ میں اس وقت تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

ہم شکل کو سلمان کا اس طرح کہنا ذرا بھی پسند نہیں آیا مگر اپنے آقا کو جواب دینا یا اس سے کوئی گستاخی کرنے کا اسے حق تھا نہ اختیار۔ اس لیے بس اتنا بولا۔

''جو آپ کا حکم میرے آقا'' یہ کہہ کر ہم شکل غائب ہو گیا اور سلمان اپنے اصل حلیے میں لوٹ آیا۔ پہلے تو اسے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔ بہت دن بعد وہ اپنی جون میں واپس آیا تھا ورنہ مخفی رہتے رہتے تو اس کی روح میں ایک بوجھل سی تھکن اتر آئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اسے دفتر میں بیٹھے ہوئے اپنے باپ کا خیال آیا اور وہ مرے مرے قدموں سے نگراں کے دفتر کی طرف چلنے لگا۔

راستے میں اسے قاصد لڑکا بھی ملا جو اسے دیکھ کر فوراً ہی اس پر غصہ ہونے لگا۔

''کتنی دیر پہلے میں تمہیں بلانے آیا تھا اور تم اب آ رہے ہو۔ غیر ذمہ داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایسی حرکتیں اس مدرسے میں ناقابل معافی ہوتی ہیں۔ نگراں بہت ناراض ہو رہے ہیں تمہاری وجہ سے مجھے بھی ڈانٹ پڑ گئی کہ میں تمہیں ساتھ کیوں نہیں لایا۔ چلو اب ذرا جلدی جلدی پاؤں اٹھاؤ، نہیں تو وہ خود آ جائیں گے۔ سمجھے میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

سلمان نے قاصد لڑکے کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دینے کے بجائے تیز تیز چلنے کی کوشش کرنے لگا اس کا ذہن پورے راستے اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ اس کے باپ ابراہیم کو اس کے بارے میں کیا اور کتنا معلوم ہو چکا ہے۔ دو ہفتے سے زیادہ اسے اپنے گھر گئے ہوئے ہو چکے تھے۔ اس کی ماں ضرور بہت پریشان ہو گی اور اس کے باپ نے لازماً نگراں اور ریحان استاد کو یہ بتا دیا ہو گا کہ میں دو ہفتے سے گھر ہی نہیں آیا جبکہ یہاں تو سب یہی جانتے تھے کہ میں پابندی سے ہر ہفتے گھر جاتا رہا ہوں۔ اب کیا ہو گا۔ اس کا جھوٹ کھلنے ہی والا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ دفتر جانے اور اپنے باپ، نگراں اور ریحان استاد کا سامنا کرنے اور شرمندہ ہونے کے بجائے یہیں سے کہیں اور بھاگ جائے اور پھر کبھی یہاں لوٹ کر نہ آئے۔ ویسے بھی اس کا پول کھلنے والا تھا۔ جب نگراں اس سے یہ پوچھے گا کہ تم مدرسے میں بھی نہیں تھے تو چھٹیوں میں آخر تم کہاں ہوتے تھے۔ تو وہ کیا جواب دے گا۔ اس سے بھی زیادہ اسے اپنے باپ کی لہو رنگ آنکھوں سے ڈر محسوس ہوا کہ اگر اس کے باپ کو اس کی ان سب حرکتوں کے بارے میں علم ہو چکا ہے کہ وہ یہاں انسانوں کی دنیا میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔ تو کیا ہو گا اس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی جو وہ اپنے باپ کو مطمئن کر سکتا۔

تو کیا اس کا باپ مارے غصے اور طیش کے اسے واپس لے جائے گا اور اسے قبیلے کے سردار کے سامنے ڈال کر کہے گا کہ یہ تمہارا مجرم ہے اب اسے جو قانون کے مطابق اس کی سزا ہے دے دو میں اف بھی نہیں کروں گا۔''

تو کیا وہ صنوبر سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا ہے۔ یہ خیال اس کی رگوں میں خوف اور محرومی کی ایک لہر بن کر سرایت کر گیا کہ اس کے پاؤں جیسے زمین میں دھنس گئے۔ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہ رہی اور اس کے سامنے کی راہداری میں دفتر کا کھلا ہوا دروازہ اسے اپنی طرف بلا رہا تھا جہاں اس کے عشق کی موت کے پروانے پر دستخط ہونے والے تھے......!!!

(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے سطر سطر زہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی، اکتوبر میں پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! "مسئلہ یہ ہے" کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے تجربے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، نتیجۂ صورتِ حال یہ ہوئی کہ اگر ماہنامہ "سچی کہانیاں" میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں پوسٹ کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب، تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سالمیت، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات لوگ منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم ان خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درجِ ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)۔۔۔ مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے بھیجے گئے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)۔۔۔ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے نام ارسال کریں۔

(3)۔۔۔ اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

II 88-C - خیابانِ جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

عزیزو! ماہِ صیام اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ تمام ہوا۔ میری جانب سے تمام پڑھنے والوں کو عید کی پیشگی مبارک باد، اللہ ہم سب کو اپنے وطن کی آزاد فضاؤں میں عید کی خوشیاں منانے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو لوگ اعتکاف میں بیٹھے اللہ ان کی تمام دعائیں قبول فرمائے اور ہم سب کو اس سعادت کی اگلے سال توفیق عطا فرمائے۔ روزے داروں کے لیے عید اللہ کی جانب سے انعام ہے لہٰذا اس پرمسرت موقع پر اپنے دیگر ضرورت مند بہن بھائیوں کو ہرگز فراموش مت کیجیے گا۔ ماہِ شوال ہمارے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ اس ماہ خوب نیکیاں کمائیں سورۃ واقعہ اور سورۃ ملک کا پڑھنا بہت مبارک ہے۔ سورۃ الناس اور سورۃ الفلق کا بکثرت ورد انتہائی لازمی ہے۔ میں دعاگو ہوں کہ اللہ ہم سب کو امن و امان والی زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

☐ مہوش۔ لاہور

○ پیارے بابا جی! اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ اسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے رہیں۔ بابا جی میرا بھی ایک عام سا مسئلہ ہے لیکن میری زندگی کا سوال ہے۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو موت کو گلے لگا لیتی۔ بابا جی ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ تین بہنوں کی شادی کے فرض سے سبکدوشی کے بعد ہماری امی ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سوگئی ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں میری اور مجھ سے بڑی بہن کی شادی ہماری بہن نے کی ہے۔ بابا جی میری شادی کو تین سال ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے دیے ہیں لیکن بابا جی میرا خاوند بہت ظالم انسان ہے۔ کماتا نہیں ہے اور مارتا بہت ہے۔ بابا جی میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ماں کو فوت ہوئے 9 سال ہوگئے ہیں۔ باپ کو فوت ہوئے 6 ماہ ہوئے ہیں۔ بہنیں سب شادی شدہ ہیں۔ بابا جی میں نے بہت امید کے ساتھ آپ کے پاس خط لکھا ہے بے شک آپ کی نظر میں میرا مسئلہ بہت عام ہے۔ لیکن میرے لیے بہت اہم ہے۔ بابا جی میرا خاوند اَن پڑھ ہے اور بے روزگار ہے مہنگائی کے دور میں دو بچوں کا ساتھ ہے۔ لیکن میرا خاوند مجھے مار کر گھر سے نکال دیتا ہے اور مجھ سے دھوکے سے میرے حق مہر کا مکان بھی بیچ دیا ہے۔ بابا جی کئی بار میں روتی ہوئی بڑی بہن کے گھر آئی کہ باجی میرا خاوند مجھے بہت مارتا ہے۔ میرے جسم پر نیل پڑ جاتے ہیں۔ لیکن بابا جی آپ سمجھ دار ہیں۔ میرا خاوند تو یہی چاہتا ہے کہ یہ روٹھ کر بہن کے گھر بیٹھ جائے۔ دونوں بچوں کو بھی لے جائے مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ بابا جی میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ پلیز آپ کوئی جلالی وظیفہ دیں کہ میرا خاوند مجھ پر ہاتھ نہ اٹھائے اور نہیں مستقل روزگار کرکے اپنے بچوں کی ذمہ داری خود اٹھائے۔ اگر ہوسکے تو آپ مجھے تعویذ دیں تاکہ جلد از جلد میرا مسئلہ حل ہوجائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔ بابا جی میری بڑی بہن جس نے میری شادی کی ہے اس کا بیٹا یعنی میرا بھانجا دبئی میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ویزا بھیجتا ہوں اور کہتا ہے کہ آنٹی آپ اپنے خاوند سے کہیں کہ اس کا پاسپورٹ بنواؤ اور اپنی تیاری کرکے میرے پاس

اطلاعِ عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: II 88-C۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

آجائیں شاید یہاں سدھر جائیں لیکن بابا جی میرا خاوند اس معاملے میں بھی سیریس نہیں ہے۔ اس کے پاس تو اچھا موقع ہے۔ اُدھر جا کر نشہ بھی چھوٹ جائے گا اور ذریعۂ معاش بھی بن جائے گا۔ لیکن ابھی تک اس نے پاسپورٹ بھی نہیں بنوایا۔ میں نے پہلے بھی آپ کے پاس خط لکھا لیکن جواب نہیں آیا۔ پلیز جواب ضرور دیں۔

☆ بیٹی مہوش! اللہ تمہارے شوہر کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہارا مسئلہ میرے لیے معمولی ہوگا کوئی والدین بھی ایسے نہیں جو اولاد کی تکلیف کو معمولی سمجھیں۔ بیٹی جو خطوط مجھ تک پہنچتے ہیں میں ان کے جواب ضرور دیتا ہوں۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ نماز مغرب کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

☐ ریشماں۔ نوشہرو فیروز

○ محترم بابا جی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی، میں ایک مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ آپ میرے مسئلے کو حل کر دیں۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرا نام ریشماں ہے۔ میری ماں کا نام زبیدہ ہے۔ میری عمر 35 سال ہوگئی ہے لیکن ابھی تک میرا کہیں سے رشتہ نہیں آیا۔ کافی سال پہلے دو رشتے آئے تھے۔ لیکن وہ غیر معیاری ہونے پر بات نہیں بنی۔ لیکن اس کو بھی کافی سال ہوگئے ہیں۔ اب کوئی رشتہ آتا ہی نہیں۔ میں نے بہت وظیفے پڑھے ہیں لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بہت جگہ سے معلوم کروایا تو وہ بولتے ہیں رشتے میں رکاوٹ ہے۔ بابا جی اللہ کے واسطے مجھے کوئی وظیفہ پڑھنے کے لیے دیں کہ کسی اچھے گھرانے سے میرا رشتہ آجائے اور میرا مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دعائیں دوں گی۔ پلیز بابا جی مجھے جلدی جواب دیجیے گا۔ لوگ عجیب قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اتنی عمر ہوگئی ہے تمہاری شادی ابھی تک کیوں نہیں ہوئی۔

☆ ریشماں بیٹی! اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ لوگوں کی تو پروا کیا ہی مت کرو ان کا کام صرف دکھ دینا ہے مدد کرنے میں سب سے پیچھے رہتے ہیں۔ وہاں سوچ سوچ کر مکمل معلومات کے بعد امداد کرتے ہیں اور کسی کو دکھ دینا ہو، زندگی برباد کرنی ہو تو ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔ زبان اس قدر بے قابو ہے کہ اگر ان پر یہ طنز کے تیر پلٹ کر لگیں۔ تب انہیں درد کا اندازہ ہو۔ بہرحال بیٹی میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد تعویذ منگوالو۔ تفصیل سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو تاکہ مزید وقت کا زیاں نہ ہو۔

☐ کوثر۔ نوشہرو فیروز

○ بابا جی! آپ نے بہت لوگوں کے مسئلے حل کیے ہیں۔ میرا بھی مسئلہ حل کر دیں۔ میرا نام کوثر ہے۔ میری ماں کا نام سکندر ہے۔ شادی کو تین سال ہونے والے ہیں۔ لیکن ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ کافی علاج کروایا۔ لیکن پھر بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ڈاکٹر بولتے ہیں اپنے شوہر کا ٹیسٹ کرواؤ لیکن وہ ٹیسٹ کروانے کے لیے تیار نہیں۔ پلیز بابا جی آپ کوئی وظیفہ یا تعویذ دے دیں کہ میرا بھی مسئلہ حل ہو جائے۔

☆ بیٹی کوثر! پورا ماہ صیام گزر گیا تم مجھ سے تعویذ اگر اس بابرکت ماہ میں لے لیتیں تو جلد کام ہوتا۔ کرم تو انشاء اللہ ویسے بھی ہوگا۔ لیکن ماہِ صیام تو بے حساب برکتوں والا ماہ ہے۔ اس میں کسی کی بھی دعا رد نہیں کی جاتی۔ میں دوران اعتکاف متولی تعویذ تیار کرتا ہوں اور اللہ کا بڑا کرم ہے کہ سائل خالی ہاتھ نہیں رہتا۔ بہرحال تم مجھے براہ راست خط لکھو یعنی جوابی لفافے کے ہمراہ یا سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے تفصیل لے لو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

☐ م۔ کلر سیداں۔

☆ بیٹی! موجودہ صورتحال دیکھ کر میں تمہیں اور تمہاری بہن دونوں کو تعویذ کا ہی مشورہ دوں گا۔ طریقہ کار معلوم کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کرو۔ وہاں سے معلومات لے لو کیونکہ خط مجھ تک پہنچنے میں مزید وقت ضائع ہو جائے گا۔

☐ زیڈ۔ کوئٹہ۔

○ بابا جی! میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ اُسے رسالے میں ضرور شائع کرنا زیڈ کوئٹہ کے نام سے۔ کیونکہ میں بابا جی کافی پریشان ہوتی ہوں کیونکہ وہ نیک بندہ ہمیں تھوڑے کم روپے بھیجتا ہے۔ میں نے اُن سے کرائے کا ایک چھوٹا سا گھر لے لیا ہے۔ انسان گھر کے سوا پردے میں کہاں رہ سکتا ہے۔ بابا جی میں پڑھ سکتی ہوں اور نہ ہی میرا بیٹا۔ نہ میں اپنا علاج کروا سکتی ہوں۔ کھانے پینے کے لیے بھی ہمارے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ کرایہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے 7 ہزار سے 10 ہزار تک جا پہنچا ہے اور بل اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ بابا جی میرا مسئلہ ضرور شائع کر دینا۔ بلکہ میرے لیے اور میرے بیٹے کے لیے کچھ ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے۔ بابا جی سب سے بڑی بات یہ کہ میں ایک پردہ دار عورت ہوں اور اسلامی ماحول تک محدود ہوں۔ گھر سے نہیں نکلتی۔ بابا جی انسان آج کل بہت برے بھی ہو چکے ہیں۔ سچی بات ہے کسی سے مدد مانگنے جاؤ تو بھروسا بھی نہیں آتا۔ اس رمضان میں میں اور میرا بیٹا بہت تکلیف میں ہیں۔ سوکھی روٹی کے سوا کچھ نہیں اور بس پانی ہے۔ جسے پی کر ہم الحمدللہ پڑھ لیتے ہیں۔ اللہ میرے بیٹے کو زندگی دے وہ کچھ پڑھ لکھ لے تو ہمارے حالات بھی انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ٹھیک رکھے۔ اپنی دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیے گا۔ پلیز بابا جی میرا خط ضرور شائع کر دیجیے۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا خط شائع کر رہا ہوں۔ شاید کسی کو رحم آجائے یا اللہ کسی کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ تمہاری مدد کے لیے آگے بڑھے میں تمہیں ایک بار پھر نصیحت کروں گا کہ سورۃ واقعہ بعد نماز عشاء ضرور پڑھا کرو۔ ضرور کرم ہوگا۔

☐ ماریہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی ماریہ! تمہارے اور تمہاری بہن کے لیے میں تعویذ تیار کر دوں گا اس کے لیے کچھ تفصیل درکار ہے۔ تم براہِ راست خط کا جواب چاہتی ہو تو بیٹی بنا پتے کے خط کیسے ارسال کیا جا سکتا ہے۔ تم نے لفافے پر بھی اپنا پتا نہیں لکھا۔ مجھے جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھو تاکہ تمہیں تفصیلی جواب دیا جا سکے۔

☐ فہمیدہ۔ یو کے۔

☆ بیٹی فہمیدہ! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دکھائے۔ تمہاری ارسال کردہ رقم وصول ہوگئی تھی تم نے میری بات کا پاس رکھا۔ اللہ تمہیں ہمیشہ اسی طرح ضرورت مندوں کی مدد کرنے والا بنائے۔ میں نے تمہارے لیے طاق راتوں میں خصوصی دعا کی ہے ہمیشہ خوش رہو۔

☐ زبیدہ۔ شاہ کوٹ

○ بابا صاحب! السلام علیکم! بعد سلام عرض یہ ہے میں نے آپ کے بارے میں بہت سنا ہے۔ اللہ آپ کو اسی طرح خلق خدا کی خدمت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین!) میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو نواں سال ہے اور اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ میں نے اور میرے شوہر نے ٹیسٹ بھی کروائے۔ میرے شوہر کی رپورٹ تو صحیح ہے لیکن میری رپورٹ میں کچھ مسئلہ ہے۔ بہت علاج کروائے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آپ کو بڑی امید سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد کی نعمت سے نواز دے۔ (آمین!) مجھے دُعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیں۔ مہربانی کر کے میرے خط کا جواب جلد از جلد دیجیے شکریہ۔

☆ بیٹی زبیدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو۔ آئندہ خط مجھے جوابی لفافے پر مکمل پتے کے ساتھ لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جا سکے۔

☐ فراز احمد۔ چونیاں ضلع قصور

○ محترم بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ ایک سال سے زائد ہو گیا میں بے روزگار ہوں۔ کرائے کا مکان ہے اور گھر کے سات افراد کا واحد کفیل ہوں۔ اس

وقت صرف چند ٹیوشنز ہیں جن سے تھوڑا بہت سہارا ہے۔ کوئی ماہ ایسا نہیں ہوتا کہ قرض نہ چڑھتا ہو۔ رشتے دار مدد تو کرتے ہیں مگر کافی تذلیل کر کے۔ میں اللہ کے فضل سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہوں' ہر نماز کے بعد مختلف وظائف کی گیارہ بار تسبیح کرتا ہوں۔ اب آپ یہ تجویز کریں کہ آپ کے دیے ہوئے وظیفے کے ساتھ میں وہ تسبیح پڑھوں یا نہیں؟ بے چینی سے آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے فراز! تمہارے حالات جان کر دکھ ہوا مگر ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ وظائف کی کثرت سے بھی بعض اوقات نقصان ہو جاتا ہے پھر تم نے یہ بھی نہیں لکھا کہ کن وظائف کی تسبیح کر رہے ہو؟ ہر قسم کے وظائف ترک کر دو پھر دو رکعت تحیۃ الوضو ادا کرنے کے بعد تین سو دفعہ یَا لطیفُ کا وِرد کرو۔ اس کے بعد ملازمت کے لیے دُعا کرو۔ انشاء اللہ' مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ملازمت ملنے کے بعد حسب حیثیت خیرات ضرور کرنا۔

□ عروشہ۔ چکوال

○ بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کی محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ ضرور جواب سے نوازیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھتی ہوں مگر بے حد محنت کے باوجود ہر دفعہ کم نمبر آتے ہیں جس کی وجہ سے مجھے شرمندگی اور دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں اس دفعہ کے امتحان میں اچھے نمبر لے سکوں اور میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے والدین میری کوئی بات نہیں مانتے اور والد تو وہم کے مریض ہیں۔ ہر بات پر صاف انکار کر دیتے ہیں۔ میں اُن کے لحاظ میں کوئی بات نہیں کرتی۔ میں ہی نہیں' میرے بھائی بھی اس بات سے کافی پریشان ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والد ہر بات سمجھ اور مان جائیں' ان کا وہم ختم ہو جائے۔ آپ کا بہت احسان ہو گا۔

☆ بیٹی عروشہ! اللہ تعالیٰ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین!) روزانہ رات کو 8-7 بادام پانی میں بھگو دو اور نہار منہ اچھی طرح چبا کر کھاؤ اور ایک گلاس گرم دودھ بھی ضرور پیو۔ نمازِ فجر کے بعد 11 بار سورۃ فاتحہ پڑھو۔ اپنے والد کی صحت یابی کے لیے دُعا کرو اور کسی بھی بات پر بحث مت کرو۔ یہی مناسب ہے۔ وظیفہ تم امتحان کے بعد بھی جاری رکھ سکتی ہو۔

□ ماہ نور۔ گجرات

○ محترم بزرگ! میری شادی کو تین سال ہوئے ہیں' ایک بیٹا ہے۔ میں نے والدین کی مرضی کے خلاف ضد کر کے شادی کی تھی۔ لوگوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ محبت کی شادیاں عموماً کامیاب نہیں ہوتیں مگر میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ شوہر مجھے بالکل اہمیت نہیں دیتے۔ میری حیثیت گھر میں ایک ملازمہ کی سی ہے۔ میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ خصوصاً والدین اور بھائیوں سے تو ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی۔ کہوں گی تو بھی تو کس منہ سے؟ وہ لوگ تو فوراً یہ کہیں گے کہ یہ تمہاری ہی پسند ہے' اب تم خود ہی بھگتو۔ محترم! میں اس زندگی سے عاجز آ چکی ہوں' مجھے اپنی بیٹی سمجھ کر کوئی عمل یا وظیفہ ایسا بتا دیں کہ میرے شوہر مجھ سے پھر پہلے کی طرح محبت کرنے لگیں۔ تا زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆ بیٹی ماہ نور! تم تھوڑی سی شیرینی پر ایک ہزار مرتبہ یَا وَدُودُ پڑھ کر دَم کر کے رکھ دو۔ دو رکعت نماز نفل پڑھ کر اپنی کامیابی کے لیے دُعا کرو اور موقع دیکھ کر وہ شیرینی اپنے شوہر کو کھلا دو۔ انشاء اللہ' حالات میں بہتری آئے گی۔

□ راشدہ۔ اٹک

☆ بیٹی! تمہارا خط قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے تو تم مجھ سے رابطہ کر رہی ہو۔ اب بہتر یہی ہے کہ اس بات کو زیادہ نہ اچھالو۔ تمہیں شروع میں ہی اولاد پر روک تھام کرنا چاہیے تھی۔ کچی عمروں کے بچوں کو خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں نماز پڑھنے کی تلقین کرو اور خاص طور پر ان کی دینی تعلیم کا اہتمام کرو ورنہ ابھی تو کم پریشانی ہے' آئندہ بہت پریشان ہو جاؤ گی۔ اپنے گھر میں مخلوط پارٹیوں کا سلسلہ فوراً بند کرو۔ بچوں کو

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

پیار سے سمجھاؤ' سختی کروگی تو مزید بگڑ جائیں گے۔ پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو۔ تمہارے لیے سب سے بڑا وظیفہ یہی ہے۔

□ فائز۔ ایبٹ آباد

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میں ملازمت پیشہ ہوں اور ایک سرکاری محکمے میں بطورِ یوڈی سی ملازم ہوں۔ مجھ پر چار بچوں' بیوی' والدین اور دو بہنوں کی کفالت کی ذمے داری ہے۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ اس مہنگائی کے دور میں یوڈی سی کی برائے نام تنخواہ میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہے۔ کھانیکو ہوتا ہے تو پہننے کو نہیں ہوتا۔ تنخواہ مشکل سے دس دن چلتی ہے پھر وہی قرض ادھار کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔ میں ان حالات سے عاجز آ چکا ہوں۔ اللہ کے واسطے' مجھے اس مشکل کا کوئی حل بتائیں۔ میں اور میرے بیوی بچے ہمیشہ آپ کو دُعائیں دیتے رہیں گے۔

☆ بیٹا فائز! آج کل زمانہ مہنگائی نے اچھے اچھوں کی کمر توڑ رکھی ہے۔ واقعی قلیل تنخواہ میں گزارہ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ تو گویا ایک طرح سے مجاہدہ ہے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے اور تنگ دستی سے نجات دے۔ پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو اور بعد نمازِ عشاء پانچ ہزار مرتبہ یَاشَکُورُ کا وِرد کرو۔ اس کے بعد بہت خضوع و خشوع سے اپنے مقصد کے لیے دُعا کرو۔ عمل کی مدت چالیس روز ہے۔ انشاء اللہ' چالیس روز کے اندر اندر غیب سے حالات میں بہتری آئے گی۔

□ امبرین۔ حیدر آباد

○ محترمی و مکرمی بابا جی! السلام علیکم! میں نے آپ کے بارے میں رسالہ ''سچی کہانیاں'' میں پڑھا اور مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ اس زمانے میں آپ جیسے نیک بزرگ موجود ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ میرے یہ دو مسئلے ضرور حل کریں گے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں مگر میں اولاد جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ میں نے اپنا کافی علاج کروایا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں' آپ ٹھیک ہیں۔ خاوند نے ایک مرتبہ اپنا ٹیسٹ کروایا ہے لیکن بابا جی! 15 دن کی دوائی کھانے کے بعد سب دوائی چھوڑ دی ہے یعنی وہ میری اب کوئی بات نہیں مانتا اس لیے بابا جی! آپ مہربانی کر کے مجھے اولاد کے لیے کوئی وظیفہ بتائیں یا تعویذ دیں اور دوسرا مسئلہ کہ خاوند میری طرف توجہ دے اور میری بات مانے' اس کے لیے بھی کوئی عمل بتائیں۔ میں تاحیات آپ کی شکر گزار ہوں گی۔

☆ بیٹی امبرین! اللہ تعالیٰ تمہیں اولادِ نرینہ عطا فرمائے۔ 7 دن تک نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ نوح آیات 10 تا 12 ایک ایک تسبیح پڑھو اول و آخر 7-7-11 بار سبحان اللہ اور 11-7-7 بار استغفر اللہ۔ 7 دن مکمل ہونے پر کچھ رقم خیرات کر دو۔ انشاء اللہ' کامیابی ہوگی۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے' اس کے لیے یَاصَمَدُ کا کثرت سے وِرد کرو۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔

□ نکہت۔ صادق آباد

○ بابا صاحب! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ ہمیشہ ایسے ہی ہماری راہنمائی کرتے رہیں۔ (آمین!) میں آپ کا کالم بڑے ہی شوق سے پڑھتی ہوں اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو آپ کو لکھ کر راہنمائی حاصل کرتی ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ آج کل کے زمانے میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں جو بغیر مطلب کے دوسروں کے کام آتے ہیں۔ بابا صاحب! میں کسی کو پسند کرتی ہوں اور غلطی سے چند بار ان سے باہر بھی ملی ہوں۔ وہ بہت شریف انسان ہیں مگر بابا صاحب! میں اکثر ان سے باہر نہیں مل سکتی کیونکہ یہ غلط بات ہے مگر مجھے پہلے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں غلط کر رہی ہوں۔ اب بابا صاحب! میں اگر ان سے باہر نہ ملوں تو وہ بہت پریشان کرتے ہیں۔ اگر باہر ملوں تو پریشانی ہوتی ہے کہ یہ غلط بھی ہے اور اگر گھر والوں کو پتا چلتا ہے تو میری کیا عزت رہ جاتی ہے۔ بابا صاحب! اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عزت کی زندگی عطا فرمائے اور مجھے رسوائی سے بچائے۔ (آمین!) بابا صاحب! میرے خط کا جواب ضرور دیں تاکہ میں عزت کی زندگی جی سکوں اور نیکی کے راستے پر چلوں۔ بابا صاحب! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ یا تو مجھے وہ چھوڑ دیں یا عزت کے ساتھ لے کر جائیں اور ہمارے لیے جو بھی بہتر ہو' اللہ تعالیٰ ویسا ہی فیصلہ فرمائے۔ (آمین!) اور میں جلد ہی اس پریشانی سے باہر نکلوں۔ (آمین!)

☆ بیٹی نکہت! تمہارے فرضی نام کے ساتھ مسئلہ اس ماہ شائع کر رہا ہوں تاکہ دوسری بچیوں کو پڑھ کر اندازہ ہو کہ ایسے تمام لوگ ایک سا طریقۂ واردات رکھتے ہیں۔ مخلص شخص اپنی عزت سے زیادہ دوسرے کی عزت کا خیال رکھتا ہے۔ فوراً قطع تعلق کرو کیونکہ تمہاری اور تمہارے والدین کی عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح یَاقَیُّوْمُ کی پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

□ امجد حسین۔ پڈعیدن

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! میرے بہنوئی پر فالج کا اٹیک ہوا ہے اور زیادہ حملہ دماغ پر ہوا۔ اب چھے ماہ سے ان کا علاج ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پہلے سے کافی بہتر ہیں۔ اٹیک ان پر دائیں سائیڈ پر ہوا تھا۔ سہارے کے بغیر چل تو لیتے ہیں لیکن ابھی صحیح طور پر چل نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ بازو بھی فی الحال صحیح طور پر حرکت نہیں کر سکتا۔ باتیں کرتے ہیں تو کبھی کبھی سمجھ میں آ جاتی ہیں لیکن بعض اوقات باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آتیں جس کی وجہ سے میری بہن کافی پریشان ہیں۔ محترم بابا جی! کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے بہنوئی بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ وظیفے کی اجازت ان کی والدہ کو دی جائے۔ بابا جی! اس مسئلے کا حل جنوری میں دے دیا جائے تاکہ میرے بہنوئی جلد از جلد صحت یاب ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام نیکیوں کا اَجر عطا فرمائے۔ (آمین! ثم آمین!)

☆ بیٹے امجد! اللہ تعالیٰ تمہارے بہنوئی کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ ان کی والدہ سے کہو کہ نماز کی پابندی کی کوشش کریں۔ نمازِ عصر اور نمازِ مغرب کے بعد 7-7 بار سورۃ نصر اور سورۃ فلق پڑھیں اور دعا کریں۔ یَامُجِیْبُ کا کثرت سے ورد کریں۔ انشاء اللہ' مکمل شفا ملے گی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ نواز شاہ۔ جہلم

○ بابا جی! السلام علیکم! میں آپ کو بڑی امیدوں سے خط لکھ رہا ہوں۔ آپ ضرور کوئی بہتر حل بتائیں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی کزن سے محبت کرتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے والدین عرصۂ دراز سے فوت ہو چکے ہیں اور اس کے دو بھائی ہیں جو ہمیشہ اس کے متعلق غلط سوچتے ہیں۔ میں نے اسی سال گریجویشن کیا ہے اور میرا تعلق اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے ہے جبکہ اس کے بڑے بھائی نے ایک ماہ قبل اپنی دوسری شادی کرنے کے لیے اس کا رشتہ کسی غیر مناسب جگہ پر کر دینے کی کوشش کی جو نہ بن سکا۔ بابا جی! دراصل حقیقت یہ ہے کہ تقریباً دو سال پہلے میری اسی کزن سے میرا نکاح تھا جو خاندانی چپقلش کی وجہ سے نہ ہو سکا اور انہوں نے نکاح سے ایک دن قبل فون پر منع کر دیا تھا جس کے باعث ان لوگوں سے ہمارا جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارے گھر والوں نے انا کا مسئلہ بنایا ہوا ہے اور ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ ابھی تک بات الجھی ہوئی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ مجھے فکر ہے کہ کہیں اس کا غیروں میں رشتہ نہ ہو جائے۔ بابا جی! آپ جلد مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹے نواز! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری دعا قبول فرمائے۔ نماز میں گڑگڑا کر دعا کیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ الاعراف آیت 26' 99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ وظیفہ نہایت سہل دے رہا ہوں تاکہ اپنے کاموں کے ساتھ بھی وظیفہ جاری رکھ سکو۔ حاجت قبول ہونے تک وظیفہ جاری رکھو۔

□ سہیل۔ راولپنڈی

○ پیارے بابا جی! میں گیارہ سال سعودی عرب میں ملازمت کرنے کے بعد پاکستان آیا تھا۔ میں نے اس دوران میں خاصی معقول رقم پس انداز کر لی تھی اور ارادہ تھا کہ اب پاکستان میں ہی کوئی کاروبار

کروں گا چنانچہ میں نے ایک دوست کے ساتھ مل کر پنکھے بنانے کی چھوٹی سی ایک فیکٹری قائم کرلی۔ مجھے کاروبار میں شروع ہی سے نقصان ہونے لگا۔ پہلے تو کئی لاکھ روپے فیکٹری کی جگہ اور خام مال کی خریداری میں صرف ہوگئی پھر خدا خدا کرکے کام شروع ہوا مگر اس میں مجھے مسلسل خسارہ ہوتا رہا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے پارٹنر نے بزنس ختم کرنے کا مشورہ دیا مگر میں اس وقت پرامید تھا کہ کوئی بھی کاروبار ایک دن میں تو نہیں جمتا' میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ اپنا سرمایہ لے کر علیحدہ ہوگیا۔ اس وقت تک ہمیں تقریباً پندرہ لاکھ کا نقصان ہو چکا تھا جو ہم دونوں نے آدھا آدھا برداشت کیا۔ پارٹنر کی علیحدگی سے مجھے دہرا نقصان ہوا۔ ایک تو اچانک خاصا سرمایہ نکل گیا' دوسرے وہ اس شعبے کا ماہر تھا اور مجھے قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں سنبھل ہی نہ سکا اور مسلسل خسارہ ہوتا رہا۔ میں نے ایک دو جاننے والوں سے قرض لے کر کاروبار سنبھالنے کی کوشش کی مگر قرض لیا ہوا روپیا بھی ڈوب گیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ میرا بال بال قرضے میں جکڑ چکا ہے۔ کاروبار میں نے خود ہی بند کردیا۔ میرا بنگلہ اور گاڑی سب کچھ قرض خواہوں کی نذر ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود اب بھی میں کئی لاکھ کا مقروض ہوں۔ میں نے ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی ناکام رہا۔ میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ ایک دفعہ پھر بیرونِ ملک چلے جائیں۔ میں نے بیرونِ ملک جانے کے لیے ایک ایجنٹ کو ادھار لے کر اچھی خاصی رقم دی مگر وہ رقم بھی ڈوب گئی کیوں کہ وہ شخص بھی فراڈ تھا۔ اب تو گھر میں کئی کئی وقت کے فاقے ہورہے ہیں۔ کبھی کوئی رشتے دار مدد کردیتا ہے یا کہیں سے قرض مل جاتا ہے تو کچھ وقت گزر جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے ایسا کون سا قصور سرزد ہوا تھا جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ نہ جانے میری خوش گوار زندگی کو کس کی نظر لگ گئی؟ اللہ کا واسطہ دے کر آپ سے التجا کرتا ہوں کہ خدارا' میری مدد فرمائیں اور مجھے اس مسئلے کا کوئی روحانی حل بتائیں۔ اب مجھ سے بچوں کی بھوک اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔

☆ بیٹے سہیل! تمہارا خط پڑھ کر دکھ ہوا ہے۔ اس میں غلطی تمہاری بھی ہے۔ تمہارا پارٹنر یقیناً ذہین اور موقع شناس ہے۔ وہ تمہارے ساتھ مخلص بھی تھا اسی لیے تو اس نے بروقت تمہیں کاروبار ختم کرنے کا مشورہ دیا تھا مگر اس وقت تم نے اس کی بات نہ مانی۔ شاید اسی میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت تھی۔ بہرحال زندگی میں اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس سے دل برداشتہ نہ ہو' گو کہ یہ نقصان بہت بڑا ہے مگر اللہ تعالیٰ ہر شخص پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا وہ اٹھا سکے۔ نماز کی پابندی کرو۔ ایک زود اثر وظیفہ بھی بتا رہا ہوں۔ انشاء اللہ' اسے پڑھنے کے بعد غیب سے بہتری کے آثار پیدا ہوں گے۔ نمازِ فجر کے بعد اول و آخر درود شریف کے ساتھ اللھم صل علیٰ سیدنا محمد صاحب الحسن والجمال والبھجت والکمال والبھار ولنور ایک سو گیارہ مرتبہ پڑھو۔ یہ وظیفہ بلاناغہ نوے دن تک پڑھنے کا ہے۔ اس دوران میں اگر تمہارا مسئلہ حل ہو جائے تو بھی نوے دن کی مدت ضرور پوری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں قرض سے نجات دے گا۔

□ شاہ جہاں۔ لاہور

○ محترم باباجی! آداب! میری عمر چوبیس سال ہے۔ میں بی اے کرچکی ہوں اور ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتی ہوں۔ میں جہاں ملازمت کرتی ہوں' وہاں مردوں کی اکثریت ہے' خواتین صرف دو ہیں۔ ایک میں ہوں اور دوسری خاصی عمر کی ایک خاتون ہیں۔ میں خاصی پرکشش ہوں۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ آفس کے ساتھیوں میں سے تین حضرات مجھ سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان میں سے ایک کچھ سلیقے کا ہے۔ میں بھی اس میں انٹرسٹ لے رہی تھی مگر پھر معلوم ہوا کہ اس نے مجھ سے بہت سے جھوٹ بولے تھے کہ اس کے ایک بھائی اسٹیٹس میں ہیں' وہ ڈیفنس میں رہتا ہے اور اس کے بھائی جلد ہی اسے امریکا بلالیں گے۔ حقیقت یہ ہے

کہ وہ [illegible] بی ایریا میں رہتا ہے اور اس کا کوئی بھائی امریکا میں نہیں ہے۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا تو مجھے اس سے چڑ سی ہوگئی۔ باقی دو لڑکے تو یوں بھی میرے معیار کے نہیں ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ لڑکا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں اب اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی بلکہ میں ایک اور جگہ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ان صاحب نے ایک دفعہ مجھے اسٹاپ پر کھڑے دیکھا تو اپنی گاڑی میں مجھے گھر تک لفٹ دی تھی۔ میں ان سے اکثر ملتی رہتی ہوں' خاصے سنجیدہ اور پروقار آدمی ہیں اور مجھے اپنانا چاہتے ہیں۔ وہ انتہائی صاف گو ہیں اور انہوں نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ پہلی بیوی اور بچے گاؤں میں ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے والدین اور بھائی کبھی اس شادی پر راضی نہیں ہوں گے۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والدین راضی ہوجائیں اور میری ان صاحب سے شادی ہوجائے۔

☆ بیٹی شاہ جہاں! تمہارا طویل خط پڑھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ تم ماشاءاللہ' پڑھی لکھی اور سمجھدار خاتون ہو' اپنا اچھا برا خود سمجھتی ہو۔ تمہارے طویل خط کے بہت سے حصے میں نے حذف کردیے ہیں۔ پورے خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تم صرف اور صرف دولت کی خواہش مند ہو۔ تمہارے لیے بہتر یہ ہوگا کہ ان راہوں کو چھوڑ دو۔ اس قسم کے مرد کبھی کسی ایک کے ہوکر نہیں رہتے۔ اس کھیل سے باز آجاؤ کہ اسی میں تمہاری اور تمہارے خاندان کی بہتری ہے۔ میرا کام سمجھانا ہے' ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم فرمائے۔

□ فرح۔ لاہور۔

☆ بیٹی فرح! اپنی توجہ صرف تعلیم پر رکھو۔ جن باتوں کو تم بہت اہم سمجھ رہی ہو' وہ صرف وقت کا زیاں ہے۔ والدین کی خدمت کرو۔ نمازِ ظہر اور نمازِ عصر کے بعد سورۃ بقرۃ آیت 138' 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عقل عطا فرمائے۔ (آمین!)

ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

خوشی اور غم

جس طرح پھول اور کانٹوں، اندھیروں اور اجالوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اسی طرح زندگی بھی غم اور خوشی کے بغیر نامکمل ہے۔ زندگی میں جب تک غم نہ ہوں، اس میں لوچ و لچک پیدا نہیں ہوتی۔

غم، زندگی کا دوسرا نام ہے کیونکہ خوشیاں بے وفا ہوتی ہیں۔ جو چند لمحوں کے لیے اپنی جھلک دکھا کر انسان کو یادوں کی وادی میں دھکیل دیتی ہیں جبکہ غم، انسان کی زندگی کے ساتھی ہوتے ہیں۔ زندگی کے جو قیمتی لمحات بیت گئے وہ اب واپس نہیں آ سکتے لیکن آنے والے لمحات کی قدر جانو اور ہمیشہ یادالٰہی کا چراغ لے کر سیدھا اور سچا راستہ تلاش کرو۔

مرسلہ: اُم حبیبہ۔ اسلام آباد

باتوں سے خوشبو آئے

☆ زندگی ایک سراب ہے۔ جس کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں اور موت حقیقت ہے، جسے ہم فراموش کیے ہوئے ہوتے ہیں۔

☆ علم کی پذیرائی اور سوچ کی گہرائی ہو تو کوئی سچا موتی، ذہن کے دریچوں میں تخلیق ہو جاتا ہے۔

☆ خوشی، ذہنی سکون عطا کرتی ہے اور غم، ایک نئی دنیا سے روشناس کرواتا ہے، جسے ڈوب کر ابھرنا بھی کہا جا سکتا ہے۔

☆ اچھے والدین ہی اپنی اولاد کی بہترین پرورش کر سکتے ہیں اور وہی بچے بڑے ہو کر اچھی قوم بن سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے والدین کی اصلاح ہو۔

☆ یادیں! ہمارے دماغ کی ہارڈ ڈسک پر محفوظ ہوتی ہیں، جو ہمارے کلک کرنے پر ذہن کی اسکرین پر نمودار ہو جاتی ہیں۔

☆ جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو طاقت خود بخود آ جاتی ہے۔

☆ بے انصافی کے آگے سینہ تان کر کھڑے ہو جانا ہی بہادری ہے۔

مرسلہ: راشدہ اعجاز۔ کراچی

طلیطلہ

طلیطلہ ''گاتھ'' قوم کے فرماں رواؤں کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں ان کا خزانۂ دولت اور نوادرات تھے۔ اہلِ طلیطلہ نے جب سنا کہ طارق بن زیاد ان پر چڑھائی کے ارادے سے چلا آ رہا ہے تو انہوں نے اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں کی تمام دولت اور نوادرات دوسرے مقاموں پر منتقل کر دیا اور خود شہر چھوڑ کر جبلِ بشارت کی پشت پر بسے شہر میں پناہ لے لی۔ طارق بن زیاد جب یہاں پہنچے تو انہوں نے شہر کو خالی پایا اور اس طرح بغیر جنگ و جدل کیے طلیطلہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

(مغیث الدین کی تحریر ''فاتح اندلس'' سے اقتباس
حسنِ انتخاب۔ رامس مبین' کراچی۔

راز کی بات

طویل عمر پانے والے ایک بڑے میاں سے انٹرویو کرتے ہوئے اخباری نمائندے نے پوچھا۔

''آپ کے خیال میں آپ کی طویل عمر کا راز کیا ہے؟''

بوڑھے نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ''میرے خیال میں راز صرف یہ ہے کہ میں نت نئی بیماریوں والے جراثیم کی دریافت سے پہلے پیدا ہو گیا تھا اس لیے میں جراثیم کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تھا' یوں میری زندگی زیادہ پریشانی میں نہیں گزری۔''

مرسلہ۔ آصف بیگ' ٹنڈو الہ یار۔

عورت کا حسن

☆ عورت کے ہاتھ: مہندی کے بغیر بھی اچھے لگتے ہیں اگر خانہ داری میں مصروف رہیں۔

☆ عورت کی آنکھیں: کاجل کے بغیر بھی اچھی لگتی ہیں اگر ان میں حیاء ہو۔

☆ عورت کی زبان: سریلی آواز کے بغیر بھی اچھی لگتی ہے اگر وہ ذِکر اللہ سے تر ہوں۔

☆ عورت کے بال: شیمپو کے بغیر بھی اچھے لگ سکتے ہیں اگر ان پر آنچل موجود ہو۔

☆ عورت کا قد: بغیر ہیل کے بھی لمبا ہو سکتا ہے اگر شخصیت میں بلندی ہو۔

حسنِ نظر: مسز نگہت غفار۔ کراچی

چار اشعار

بالآخر یہ راز فاش ہو جانا ہے
تمہیں میری محبت کا احساس ہونا ہے
میں دور بہت دور جا چکا ہوں گا
تمہیں اپنے کیے پر ملال ہونا ہے
جن گلیوں سے جڑی ہیں یادیں تیری
مجھے اُن گلیوں میں گم نام ہونا ہے
کچھ ملا نہیں درد دل کے سوا تابش
مجھے تیری قربتوں سے بے نیاز ہونا ہے

شاعر: علی حسنین تابش۔ چشتیاں

یادداشت

ایک شخص کی یادداشت قابلِ رشک تھی، اسے برسوں پہلے کی بات بھی یاد رہتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اُسے آزمایا لیکن وہ تمام شرائط جیت جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی شہرت شیطان تک جا پہنچی اور ایک دن شیطان اس شخص کے پاس آیا اور اُس سے کہا۔

''انڈا کھاؤ گے۔''

یہ سن کر اُس شخص نے کہا۔ ''ہاں'' مگر شیطان اتنا کہہ کر چلا گیا۔ پھر وقت بدلا اُس شخص کے بچے جوان ہوئے، اُن کی شادیاں ہوئیں اور ان کے بچے بھی بڑے ہو گئے۔ شیطان پھر اُس شخص کے پاس آیا اور بولا۔ ''کیسا......؟''

اس شخص نے شیطان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ابلا ہوا؟'' شیطان نے جو یہ سنا تو کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مرسلہ: مرزا مبشر بیگ۔ کراچی

احتجاج

مخالف پارٹیوں کے دو سیاستدان زور و شور سے بحث میں مصروف تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دلائل سے قائل کرنے کی ناکام کوشش کی، پھر وہ الزامات پر اتر آئے۔ ایک سیاستدان نے کہا۔ ''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کس کے اشارے پر ناچتے ہو۔''

دوسرے سیاستدان نے مشتعل ہو کر کہا۔

''احمق آدمی سیاسی بحث میں میری بیوی کو کیوں گھسیٹتے ہو؟''

مرسلہ: شبانہ زمان۔ سکھر

ایک قطعہ

تیرے ہوتے ہوئے بھی تنہائی ملی ہے
وفا کر کے بھی بے وفائی ملی ہے
جتنی دعا کی تجھے پانے کی
اُس سے زیادہ تیری جدائی ملی ہے

شاعر: ایم وکیل عامر جٹ۔ ساہیوال

شخصیت

سفید رنگ: جو لوگ سفید رنگ پسند کرتے ہیں، وہ پاکیزہ خیال کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے مزاج میں دھیما پن اور مزاج میں بردباری پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ

صلح جو، امن پسند، دوسروں کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوتے ہیں۔

سرخ رنگ: یہ رنگ جدوجہد اور توانائی کی علامت ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے لوگ مستعد اور آزادی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان میں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی خواہش اور جستجو ہوتی ہے۔

سبز رنگ: یہ رنگ اتحاد اور تقدس کی علامت ہے اس رنگ کو پسند کرنے والے لوگ فراخ دل اور وسیع ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مستقل مزاج اور دوسروں کو دلائل سے قائل کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ ایسے افراد انسان دوست اور مذہب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔

نیلا رنگ: یہ رنگ گہرائی اور ہمہ گیری کی علامت ہے۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے لوگ گہرے خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ خوشگوار تعلقات کے حامل، خوش گفتار اور برتری کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ دوسروں پر اعتماد کرتے ہیں اور خود بھی کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتے۔

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی۔ کھاریاں

معجزہ

کراچی کی ایک سڑک پر ایک صاحب بے ہوش پڑے تھے۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل ان کی طرف اشارہ کر کے ایک کار سوار سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے آپ نے اسے اپنی کار سے ٹکر مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔''

''آپ قسم لے لیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ صاحب گھبرا کر بولے۔ ''میں نے ان صاحب کو سڑک پار کرتے ہوئے دیکھ کر احتراماً گاڑی روک لی تھی...... اس پر یہ صاحب حیرت سے بے ہوش ہو گئے۔''

مرسلہ: کاشف مغل۔ ایبٹ آباد

ہیرے کا سیٹ

ایک لڑکی نے اپنے محبوب سے کہا۔ ''کتنا اچھا ہوتا اگر تم سمجھوتے کی دہلیز سے پہلے ہی لوٹ جاتے...... مگر اب جانے سے پہلے میرے آخری سوال کا جواب دیتے جانا۔''

''میں نے تم سے کب کہا تھا میرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لاؤ اور مجھے خوابوں کے دیس میں لے چلو...... پگلے! میں حقیقت کی دنیا میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی ہوں۔ میں نے تم سے کوئی انہونی فرمائش تو نہیں کی تھی۔ صرف ایک عدد ہیرے کا سیٹ ہی تو مانگا تھا۔''

مرسلہ: نسیم سکینہ صدف۔ ڈسکہ

کتنا اچھا وہ زمانہ ہوگا

دیس کو اپنے تباہی سے بچانا ہوگا
جھگڑا مسجد اور مندر کا مٹانا ہوگا
دور جن کو کیا ہے پاس بلانا ہوگا
دل ملیں نہ ملیں، ہاتھ ملانا ہوگا
نہ کیا ایسا تو بہت پچھتانا ہوگا
دیس کی بربادی کا پھر ایک بہانا ہوگا
کتنا اچھا ہو جب سب مل جل کر رہیں
سب کے دل میں خوشی لب پہ ترانہ ہوگا
کتنا اچھا وہ زمانہ ہوگا

شاعرہ: سلطانہ شوکت۔ رانچی جھاڑ کنڈ، ہندوستان

مہکی کلیاں

☆ بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (حدیث نبویؐ)

☆ سخی گناہ گار خدا کے نزدیک بخیل عابد سے اچھا ہے۔ (حدیث نبویؐ)

☆ حاکم کا ایک گھڑی کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔ (شیخ سعدیؒ)

☆ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا ہے اور سب سے آسان کام نکتہ چینی ہے۔ (البیرونی)

☆ جہاد کفار، جہاد اصغر ہے اور جہاد نفس، جہادِ اکبر۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

☆ دنیا میں وہی لوگ سر بلند رہتے ہیں جو تکبر

کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ: ندیم عباس ڈھکو۔ ساہیوال

تقریر کی دھوم

وزیراعظم لیاقت علی خان جب امریکا کے دورے پر گئے تو انہیں یہ شرف بھی بخشا گیا کہ وہ کانگریس اور سینیٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کریں۔ اس تقریر کی وہاں بہت شہرت ہوئی۔ لیاقت علی خان کی تعریف میں اخباروں نے کالم بھر دیے۔ وہ تقریر احمد شاہ پطرس بخاری کی لکھی ہوئی تھی۔ بخاری صاحب لیاقت علی خان کے اسٹاف میں شامل تھے جنہیں وہ خصوصی طور پر گورنمنٹ کالج، لاہور سے لے گئے تھے۔

مرسلہ: احمر عبدالغنی، کراچی

مقدر کی باتیں

زخمی ہیں میرے پاؤں لہولہو ہیں آنکھیں
تمہارے لیے زمانے کی کیا کیا نہ سنیں باتیں
درد ہوتا ہے تو رو لیتے ہیں کسی گوشہ تنہائی میں
چپکے چپکے خود سے ہی کر لیتے ہیں تمہاری باتیں
اتنے انجان نہیں ہم بھی، نہ تھے تم بے خبر
پھر کیوں نہ سمجھ آئیں وقت کی یہ گھاتیں
حرف شکایت نہیں نہ دل کو گلہ ہے
جو کچھ بھی ملا ہم کو یہ ہیں مقدر کی باتیں

شاعرہ: صائمہ بشیر۔ سرگودھا

ملازمت

ایک دولت مند آدمی انگلستان گیا۔ وہاں اس کے میزبانوں نے اسے کرکٹ میچ دکھانے کا اہتمام کیا۔ لنچ کے وقت اسے بہترین کھانا فراہم کیا گیا۔ مشروبات بار بار پیش کیے جاتے رہے لیکن اس کے باوجود دولت مند آدمی کچھ لاتعلق سا نظر آنے لگا۔

کھیل کے اختتام پر میزبان نے پوچھا۔ ''کہیے آپ کو یہ کھیل کیسا لگا؟''

''اچھا تھا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''وہ کیا؟'' میزبان نے اشتیاق سے پوچھا۔

''گیند کو بلے سے مارنے کے بعد کھلاڑی خود ہی کیوں دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کام کسی ملازم سے بھی لیا جا سکتا ہے۔''

مرسلہ: پارس جونیجو۔ بورڑی شریف

تحریر شناس

ایک خاتون تحریر شناس کی حیثیت سے بڑی معروف تھیں اور خواتین کے ایک رسالے میں کالم بھی لکھتی تھیں۔ انہوں نے خواتین کو دعوت عام دے رکھی تھی کہ وہ انہیں اپنی یا کسی بھی شخصیت کی تحریر کا نمونہ ارسال کریں تو وہ اس کی عادات، خصائل اور کردار کے بارے میں بہت سی صحیح اور مفید باتیں بتا سکتی ہیں۔ خواتین انہیں ذوق وشوق سے تحریر کے نمونے ارسال کرتی تھیں جن میں ان کی اپنی تحریروں کے نمونے کم اور دوسروں کے زیادہ ہوتے تھے۔

ایک خاتون نے ایک تحریر کا نمونہ بھیجتے ہوئے انہیں لکھا۔ ''یہ اُن صاحب کی تحریر کا نمونہ ہے، جن سے میں محبت کرتی ہوں۔ برائے مہربانی اس کا بہت توجہ سے تجزیہ کر کے بتائیے کہ یہ اچھے شوہر ثابت ہو سکیں گے یا نہیں؟''

خاتون تحریر شناس نے انہیں کالم میں جواب دینے کی بجائے براہ راست جواب ارسال کرتے ہوئے لکھا۔ ''محترمہ! اس تحریر کا تجزیہ کرنے کے لیے مجھے توجہ یا غور وفکر کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس تحریر کا حامل شخص گزشتہ تین سال سے میرے لیے تو اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکا۔ اچھا ہوا جو آپ نے قسمت آزمائی سے پہلے اس کی تحریر کا نمونہ مجھے ارسال کر دیا۔''

مرسلہ: طاہر بزدار۔ کوئٹہ

رشتے

کچھ رشتے استوار کرنے میں انسان کتنی جدوجہد کرتا ہے۔ کڑی سے کڑی ملا کر مالا تیار کرتا ہے لیکن توڑنے والا ایک پل میں سب کچھ توڑ دیتا ہے۔ چاہے وہ دل ہو یا کوئی موتیوں کی مالا......؟

وہ یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کرتا کہ یہ شخص کتنی مسافتوں کے بعد اس مقام تک پہنچا ہوگا اور اس نے اس عرصے میں کیا کچھ قربان کیا ہوگا؟

مرسلہ: غیاث الدین۔ پشاور

صرف تم ہی تھے

میری زندگی کے محور، میری زندگی تم ہی تھے
آنکھوں میں بسنے والے، سپنے حسیں تم ہی تھے
یادوں میں رہنے والے، یادیں مری تم ہی تھے
مجھے تشنہ کرنے والے، ساگر مرا تم ہی تھے
دھوکے میں رکھنے والے، مرا مان بس تم ہی تھے
مجھے تنہا کرنے والے، میرے ہم سفر تم ہی تھے

شاعرہ: عائشہ شفقت۔ ساہیوال

مختصر مختصر

شکر کرو، نعمت محفوظ ہو جائے گی، دستر خوان کشادہ کر دو، رزق بڑھے گا۔ سجدہ کرو، تقرب ملے گا۔

عزت کرو، عزت ملے گی۔ صدقہ دو، بلا ٹل جائے گی۔ توبہ کرو، گناہ معاف ہو جائیں گے۔

انسان جس کیفیت اور عقیدے میں مرے گا اسی میں دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔ دعا کریں کہ وقتِ رخصت کلمہ نصیب ہو۔

واصف علی واصف کی کتاب سے شمائلہ اختر۔ لاہور، کا انتخاب

ستارے

انگلستان کے مشہورِ زمانہ سراغ رساں شرلاک ہومز اپنے معاون اور دوست ڈاکٹر واٹسن کے ساتھ بستر پر محوِ استراحت تھے کہ اچانک اُٹھے، اور ڈاکٹر واٹسن سے کہا ''ڈاکٹر! تم جانتے ہو کہ آسمان میں کتنے ستارے ہیں؟''

واٹسن نے آسمان کی طرف بہ غور دیکھا، اور کہا کہ آسمان میں کھربوں ستارے ہیں، اور لاتعداد کہکشائیں ہیں......''

ہومز نے بات کاٹی ''بے وقوف......!'' اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، ''کوئی ہمارا خیمہ چوری کر کے لے گیا ہے۔''

مرسلہ: نادیہ طارق۔ کراچی

عورت کب روتی ہے؟

سادہ لوح مرد یہ سمجھتا ہے کہ عورت اُس وقت روتی ہے جب وہ مایوس یا رنجیدہ ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ عورت اُس وقت بھی روتی ہے جب وہ حد سے زیادہ خوش ہوتی ہے۔ اُس وقت بھی روتی ہے جب اسے غصہ آتا ہے۔ بعض اوقات رونے کی وجہ اُسے خود بھی معلوم نہیں ہوتی لیکن وہ یہ توقع رکھتی ہے کہ مرد کو اس کی وجہ ضرور معلوم ہونی چاہیے۔

کرتی ہوں بے دریغ انہیں خرچ ان لیے
لائی تھی اپنے ساتھ یہ آنسو جہیز میں

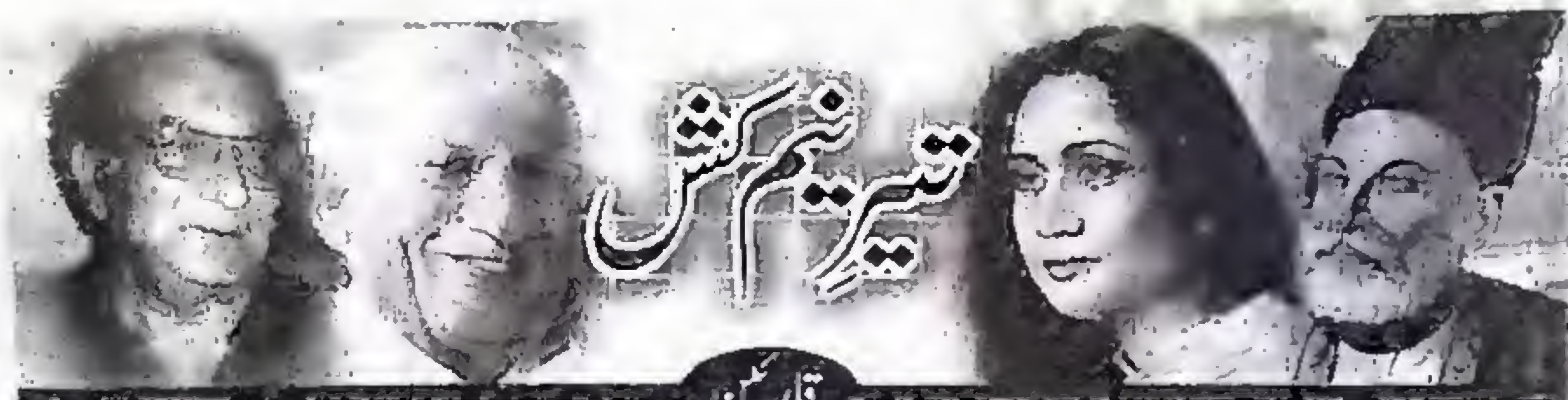
مرسلہ: حنا لطیف۔ کراچی

غزل

تعلق ٹوٹ جائے گا مرا سارے زمانے سے
میرے اپنے خفا ہوں گے تمہیں اپنا بنانے سے
تمہارے ساتھ رہنے سے مجھے تسکین ملتی ہے
بہت تکلیف ہوتی ہے تمہارے دور جانے سے
مرے دل کو جلا دینا مگر یہ ذہن میں رکھنا
اجالا مل نہیں سکتا کسی کا دل جلانے سے
مری جب جان جائے گی تو تم بھی جان جاؤ گے
کہ حاصل کچھ نہیں ہوتا کسی کو آزمانے سے

شاعرہ: ماریہ ناز۔ چیچہ وطنی

☆☆......☆☆



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا

راشد لطیف۔ صبرے والا

اداسیوں کی یہ شام اور یادوں کا یہ سماں
اپنی پلکوں پہ ہرگز ستارے نہ لائیں گے
رکھنا سنبھال کے چند خوشیاں میرے لیے
میں لوٹ کر آؤں گا پھر عید منائیں گے

سنبل ناہید۔ خیبر پختونخوا

میری سوچ پہ ہر پل مسلط تیری سوچ ہے
تیری سوچ سے نکلے تو میری سوچ کچھ اور سوچے

شاہد رفیق سہو۔ کبیر والا

تمہاری سالگرہ پر میری یہ دعا ہے
کہ اپنا روز مبارک، ہزار بار آئے
تمہاری ہنستی ہوئی زندگی کی راہوں میں
ہزاروں پھول لٹاتی ہوئی بہار آئے

مسز نکہت غفار۔ کراچی

دیکھتے کیوں ہو شکیب اتنی بلندی کی طرف
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے
ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کر اندھیرے کی چٹان
ہم سنبھل کر بہت چلتے تھے کہ ناچار گرے

نزاہت اِفشاں۔ مہورہ، فتح جنگ

چھپ چھپ کے رؤوں، سرِ انجمن ہنسوں
مجھے یہ مشورہ میرے دردِ آشنا کا تھا

چوہدری فہد سہو۔ جسو کانوین

مناؤ عید بہار چمن کو یاد کرو
پیام شوق کے اک اک سخن کو یاد کرو
ہجومِ شوق سے فرصت ملے تو اہل چمن
وطن سے دور کسی بے وطن کو یاد کرو

ثمینہ ناز۔ اورنگی، کراچی

اس طرح سبھی ہم سے ملے پیار کے ساتھ
ہم کسی سے نہ ملے تم سے ملاقات کے بعد
اتنی مضبوطی سے ویرانے کے در بند ہوئے
دل میں اتری نہ کوئی ذات تیری ذات کے بعد

ارم خان۔ ڈی جی خان

بے وفا پوچھ رہا ہے راتوں کو جاگتے کیوں ہو
اے رات! اسے بتا ہمیں نیند نہیں اُس کی یاد آتی ہے

فریدہ جاوید فری۔ لاہور

زندگی تیرا احسان بھی کیوں رہ جائے
تُو بھی لے جا اِس خاک سے حصہ اپنا

سلیمان شبیر۔ اکوال، تلہ گنگ

جب تمہاری آنکھ ہو گہرے سمندر کی طرح
کیوں نہ لگتا ہو سمندر دیدۂ تر کی طرح
اس لیے روشن کیا ہے تیرے چہرے کا چراغ
دوپہر تاریک ہے میرے مقدر کی طرح

سدرہ انور علی۔ جھنگ، صدر

زندگی تُو ہی مختصر ہو جا
غم کی شب مختصر نہیں ہوتی

عمر العطاس۔ کراچی

تمہارے پاس جوں جوں آ رہا ہوں
بس سب سے دور ہوتا جا رہا ہوں





تیری آنکھ میں سب سے بچا ہوں
میں کچھ مغرور ہوتا جا رہا ہوں
واصف نبی خان۔کراچی

دوست جب دشمنوں کو دیکھتے ہیں
رُک رُک کے ہم دوستوں کو دیکھتے ہیں
چلو تجھے آزماتے ہیں ماجد
چلو ترے حوصلوں کو دیکھتے ہیں
نصرت زمان۔سکھر

یہ جانتے تھے کہ ملنا اُداس کر دے گا
کسے خبر تھی کہ اتنا اُداس کر دے گا
وہ میرے گرد لگائے گا ڈھیر خوشیوں کا
اور اس طرح مجھے دگنا اُداس کر دے گا
یاسمین عمران۔کوپرا،سیالکوٹ

ہمیں خبر تھی کہ اک روز یہ بھی ہونا ہے
کہ ہم کلام کریں گے، کوئی سنے گا نہیں
ہمیں خبر تھی کوئی آنکھ نم نہیں ہوگی
ہمارے غم میں کہیں کوئی دل دُکھے گا نہیں
نبیل جاوید۔لک موڑ،سرگودھا

جسے بھی چاہا ،اُسے بے حساب چاہا
سو کیا بتائیں ہمیں کس سے پیار کتنا تھا
میری غزل کی چھما چھم میں جھگتے لمحے
تو دیکھتی ترے رُخ پہ نکھار کتنا تھا
شعبان کھوسہ۔کوئٹہ

ہر طرف پھیلی تھی اُس کی یاد جنگل کی طرح
میں گزر کر آ گیا ہوں اڑتے بادل کی طرح
چھوٹی چھوٹی باتوں پہ رونے کی عادت ہے اُسے
اور آنکھوں میں مجھے رکھتی ہے کاجل کی طرح
شہروز شریف۔کراچی

کن آندھیوں کے ستائے ہوئے چراغ ہیں ہم
ہوا کہ رُخ پہ جلائے ہوئے چراغ ہیں ہم
عجب نہیں کہ انہیں بھی تراش دیں آتش
وہ ہاتھ جن میں اٹھائے چراغ ہیں ہم
شربت خان۔ڈیرہ الہ یار

تُو مجھ سے ملنے کی خاطر قدم بڑھا تو سہی
پھر اس کے بعد، مری جاں مری رہی قسمت
کسی معاملے میں خود کو آزما تو سہی
ہر ایک شخص کی ہوتی نہیں بری قسمت
امجد حسین۔لیاری ایکسپریس،کراچی

جس کی آمد سے مہک جاتا ہے سارا آنگن
اچھا لگتا ہے اُسے رات کی رانی کہنا
ارسلان افسر۔کراچی

لکھی جاتی ہے خونِ دل سے صفحاتِ دو عالم پر
محبت کی حکایت اس لیے رنگین ہوتی ہے
زید علی۔دبئی

آنکھوں میں اُس کے تیر رہے تھے حیا کے رنگ
پلکیں اٹھا کے میری طرف دیکھا نہ تھا
سانسوں میں تھے گلاب تو ہونٹوں پہ چاندنی
ان منظروں سے میں تو کبھی آشنا نہ تھا
محب علی۔کراچی

پاتے ہیں کچھ گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو کبھی کبھی

کوپن برائے
تیر نیم کش
اگست 2015ء

میرا پسندیدہ شعر ''سچی کہانیاں'' کی نذر ہے
نام:
پتا: